U ATE

No. ______

Late Fine Ordinary books 25 ... Over Night b... Re. 1/- per day. ... day. Text Boo... per day.

گندھارا

جولائی سنہ ۱۹۶۳ء

گندھارا

۱۹۶۳ء

سرپرست

پروفیسر محمد اسماعیل سیٹھی. پرنسپل

نگران

پروفیسر شرر نعمانی

مدیر

محمد اقبال بی۔ اے (سال دوم

گورنمنٹ کالج پشاور

اشاریہ

افسانہ

نظم۔ ثقافتی ورثہ

تاریخ۔ جغرافیہ۔ سائنس

غزل

مذہب اور اخلاق

رپورٹ



(Chairs) L to R — Messrs Obaidur Rahman Afghani, Abdul Majid, Dr. Shafaqat Siddiqui, M. A. Sethi (Principal), Ch. Mohammad Ali (Vice-Chancellor), Dr. Mrs. K. Siddiqui (Principal, College of Home Economics), Inayatullah Khan (Controller of Examinations), Khwaja G. M. Din (Vice-Principal), Habibur Rahman.

Standing first Row — Messrs S. Shamim Haider Zaidi, Agha Syed Jafar Hayat, Ihsanud-Din, Qaiser Aminud-Din, Ch. Irshadullah, Abdul Haye, Syed M. Salim, M. Aslam Qazi, Niaz Ahmad Fakir, Abdur Rauf Popalzai, Ahsan Randhawa, Sharar Nomani.

Second Row — Messrs H.R. Karim, S.B. Awan, M.A. Kazmi, Mohammad Nazar, Ataullah, Abdul Hamid (President Students' Union), G.H. Baloch, Mohd. Humayun, Nasrullah Khan, Rashid Ahmad, Nisar Ahmad Sethi.

مایہ

محمد اقبال - مدیر حصہ اردو
بی اے، سال دوم

گذارشِ احوال

گورنمنٹ کالج پشاور نے ستمبر ۱۹۵۷ء میں سابق اسمبلی ہاؤس کی پرشکوہ عمارت میں جنم لیا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں کالج کی
مارت شاہی باغ میں تعمیر ہوگئی اور جنوری ۱۹۶۲ء میں کالج اس عمارت میں منتقل ہوگیا۔ ساڑھے پانچ سال کی مختصر
میں ہمارے کالج نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اس وقت نان میڈیکل، میڈیکل اور آرٹس کے مضامین میں بی۔ اے
۔ ایس۔ سی تک تقریباً ساڑھے پانچ سو طلباء کو بتیس "۳۲" پروفیسر صاحبان نہایت جانفشانی سے تعلیم دے رہے ہیں۔ انٹرمیڈیٹ
۔ ایس۔ سی کی تجربہ گاہیں تمام ضروری سامان سے لیس ہیں۔ لائبریری میں تقریباً پانچ ہزار کتابیں ہیں۔ آٹھ روزانہ
ہفتہ وار اور گیارہ ماہانہ اخبارات و رسائل آتے ہیں۔ نیز کوآپریٹو سٹور بھی نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔
اس عرصہ میں سات پرنسپل صاحبان اس کالج میں تعینات ہوکر تشریف لائے۔ ہمارے موجودہ پرنسپل جناب
ماعیل سیٹھی صاحب ہیں۔ آپ نے چارج لیتے ہی کالج کی کایا پلٹ دی ہے۔
آپ کی سرپرستی میں کالج یونین اور تمام سوسائٹیاں نہایت باقاعدگی سے اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ جس کی
ے طلباء صرف تعلیمی لحاظ سے ہی نہیں بلکہ مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی لحاظ سے بھی خاطر خواہ ترقی کر رہے ہیں۔
کالج میگزین کا یہ پہلا شمارہ بھی آپ ہی کے عہد میں شائع ہو رہا ہے جو اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ آپ
کے مسائل میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس کے لئے میں جناب پرنسپل صاحب کا تمام طلباء کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں
یں نے انتہائی کوشش کی ہے، کہ زیادہ سے زیادہ مضامین کو میگزین میں جگہ دوں۔ اس سلسلے میں مجھے بڑی
ک کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے اور میرے دوستوں نے بھی مضامین کی فراہمی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ پھر
چند مضامین اس مجموعہ میں جگہ نہ پاسکے۔ کیونکہ وہ معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ مجھے امید ہے کہ میرے
ست جن کے مضامین شائع نہیں ہوسکے ہیں۔ اس بات کو محسوس نہیں فرمائیں گے اور آئندہ میگزین کے لئے کوئی
ں اور معیاری چیز پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔
میں ان تمام پروفیسر صاحبان کا تہِ دل سے مشکور ہوں۔ جنہوں نے مجھے میگزین کے لئے اپنے گراں قدر مضامین
و نثر عنایت فرمائے۔ نیز میں اپنے طالب علم مضمون نگار دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کے تعاون سے میں اس
زین کو کامیابی سے شائع کرنے کے قابل ہوا ہوں
جناب محمد اسمٰعیل سیٹھی صاحب پرنسپل کالج ہذا کا میں خاص طور پر مشکور ہوں کہ انہوں نے بھی حصہ اردو کی محفل کو
قلم سے رونق بخشنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے۔ شعبۂ اردو کے پروفیسر محمد اسلم کاظمی صاحب اور پروفیسر شرر نعمانی کا کس زبان
ے شکریہ ادا کروں انہوں نے تو قدم قدم پر اپنی زرین ہدایات سے میری رہنمائی فرمائی ہے۔

بیادِ رومیؒ

۲۴ جنوری ۱۹۶۳ء کو گورنمنٹ کالج پشاور کے خوبصورت ہال میں حضرت رومیؒ کی یاد میں ایک پُرشکوہ ادبی محفل منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں اراکین بزمِ اُردو نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ صدارت کے فرائض قاضی احمد سعید صاحب ریجنل ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان پشاور نے انجام دیئے اور سٹیج سیکرٹری شرر نعمانی صاحب تھے۔ اِس ادبی محفل میں معززین شہر نے بڑی تعداد میں شرکت فرمائی اور کالج کے اساتذہ کرام اور طلباء نے بھی بڑی گرم جوشی سے حصّہ لیا۔ کالج کی تاریخ میں یہ تقریب ایک "یادگار تقریب" کی حیثیت رکھتی ہے۔

یومِ رومیؒ کی کامیابی کا سہرا پرنسپل محمد اسماعیل سیٹھی صاحب کے سر ہے۔ انہوں نے تمام انتظامات میں ذاتی طور پر دلچسپی کا اظہار فرمایا اور ایک مضمون ("رومی۔ بحیثیت ایک سیاسی مفکر") بھی خاص اسی تقریب کے لئے لکھ کر پڑھا، جو موضوع کے اچھوتے پن کی وجہ سے کافی پسند کیا گیا۔

پشاور یونیورسٹی کے ڈاکٹر مظہر علی خان صاحب (چیئرمین انگلش ڈیپارٹمنٹ) نے اپنی تقریر میں حضرت رومیؒ کے گراں قدر پیام کا خلاصہ پیش فرمایا۔ انجینئرنگ کالج پشاور یونیورسٹی کے پرنسپل پروفیسر عبید اللہ خان درّانی نے اپنے مخصوص انداز میں حضرت رومیؒ کے کلام بلاغت نظام میں کئی سائنسی نظریات کی طرف نشاندہی فرمائی۔ پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر پروفیسر طاہر فاروقی صاحب نے حضرت رومیؒ کی تلمیحات پر اپنا بصیرت افروز مضمون پیش فرمایا اور پروفیسر محمد حبیب مفتی صاحب صدر شعبۂ فارسی پشاور یونیورسٹی نے ایک مختصر تقریر میں حضرت رومیؒ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔

تقاریر کے بعد چائے کا وقفہ تھا اور بعد ازاں کالج ہال میں محفلِ سماع منعقد ہوئی جس میں پشاور کے چند مشہور گلوکاروں نے حضرت رومیؒ کا کلام ساز و آہنگ کے ساتھ پیش کر کے سامعین سے داد حاصل کی۔

اِس یادگار ادبی تقریب کی عظمت کا اندازہ آپ کو ان چند شہ پاروں کے مطالعہ سے ہو جائے گا جو اگلے صفحات پر پیش کئے جا رہے ہیں۔

پرنسپل محمد اسمٰعیل سیٹھی

حضرت رومی بحیثیت سیاسی مفکر

حضرت رومی NARROW NATIONALISM کے خلاف ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے حدیث حب الوطن من الایمان کا مطلب غلط سمجھا ہے ؎ گر وطن خواہی گزر آں سوئے شط

ایں حدیث است راکم خواں غلط

وطن سے مراد کوئی مخصوص جغرافیائی علاقہ نہیں بلکہ دارِ آخرت ہے، وہ وطنیت کے محدود تصور کو نہیں مانتے اور مختلف قوموں کو ایک مقام پر لانے اور متحد کرنیکے خواہاں ہیں اور اس مقصد کیلئے وحدتِ خیال کو ضروری سمجھتے ہیں جو صرف توحید سے حاصل ہوسکتی ہے۔ ؎ اتحادِ خالی از شرک ددوئی ٭ باشد از توحید نے ماد توئی

دراصل ان کا اشارہ اس حدیث کی طرف ہے جس میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ
"اے قوم قریش اب جاہلیت کا غرور اور نسب پر فخر کرنا خدا نے مٹا دیا، تمام لوگ آدمؑ کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔"
یا معشر قریش ان اللہ قد اذہب عنکم نخوۃ الجاہلیۃ وتعظمہا بالآباء الناس من آدم وآدم من تراب۔

دو قبیلہ کاوس خزرج نام داشت
یک ز دیگر جان خوں آشام داشت
کینہائے کہنہ شاں از مصطفےٰ
محو شد در نور اسلام و صفا

دو قبیلے اوس و خزرج ایک دوسرے کے سخت دشمن تھے لیکن اسلام کی تعلیم سے وہ دشمنی ختم ہوگئی۔

اولاً اخواں شدند آں دشمناں ٭ ہم چو اعدادِ عنب در بوستاں

وہ لوگ جو اب تک ایک دوسرے کے دشمن تھے، بھائی بھائی ہوگئے جس طرح باغ میں انگوروں کے دانے یہ قرآنِ کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔ وذکروا نعمت علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم

وزدم المومنون اخوہ بہ بند ٭ درشکستند و تن واحد شدند
صورت انگور ہا اخواں بدند! ٭ چوں فشردی شیرۂ واحد شدند

اور وہ انگوروں کے دانوں کی طرح جدا جدا بھائی تھے۔ لیکن جب تم نے دانوں کو نچوڑا تو شیرہ کی طرح متحد ہوگئے۔
حضرت رومی اسلامی اخوت اور Commonwealth of Muslims کا تصور پیش کر رہے ہیں اور اس کے حصول کیلئے وہ تدریجی ترقی کے قائل ہیں کیونکہ فرماتے ہیں ؎

غورہ انگور ضد اند لیک ٭ چوں کہ غورہ پختہ شد شد یار نیک

کچا انگور اور پکا انگور باہم ضد ہیں۔ لیکن کچا انگور جب پک گیا تو اچھا رفیق بن گیا۔ کچے انگور سے مراد وہ لوگ ہیں جو پسماندہ علاقوں میں رہتے ہیں۔ پسماندہ اور ترقی یافتہ لوگوں میں یکجہتی اور اتحاد اس وقت تک مشکل ہے جب تک پسماندہ لوگ ترقی حاصل نہ کر لیں۔ حضرت رومیؔ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ پسماندہ لوگوں کو ترقی دے کر ان کا پورا تعاون حاصل کیا جائے اور اس تفاوت کو دُور کرنے کے لئے کسی اہلِ دل کی ضرورت ہے۔ اس شخص کو آپ ایک قابل اور نیک بادشاہ یا صدر یا کسی اور نام سے پکار سکتے ہیں۔ ؎

غورہائے نیک کایشان قابلند ٭ از دمِ اہلِ دل آخر یک دلند
پس درانگوری ہمے درند پوست ٭ تا یکے گردند وحدت وصف اوست
آفریں بر عشقِ کلّ اوستاد ٭ صد ہزاراں ذرہ را داد اتحاد
عشق پر آفریں جو اُستادِ کامل ہے ٭ اس نے لاکھوں فردوں کو اکٹھا کر دیا

وہ ملک میں انتشار و نفاق پیدا کرنے والوں کے سخت مخالف ہیں اور فرماتے ہیں کہ سوچ لو کہیں تم بھی مسجد ضرار تو نہیں بنا رہے ہو ؎

بر محک زن کارِ خود اے مرد کار ٭ تا نسازی مسجدِ اہلِ ضرار

حضرت رومیؔ جمہوری طرزِ حکومت کے حامی معلوم ہوتے اور وشاورہم فی الامر کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ ؎

عقل با عقل دگر دوتا شود ٭ نور افزوں گشت رہ پیدا شود
مشورت ادراک و ہشیاری دہد ٭ عقلہا مر عقل را یاری دہد

مشورہ دینے کے لئے چند شرائط بھی بتاتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جس سے مشورہ لیا جائے وہ بیدار مغز اور نیک ہو ؎

مشورت را زندۂ باید نکو ٭ کہ ترا زندہ کند آں زندہ کو

دوسری بات یہ ہے کہ وہ ہر بری بات سے بچنے والا ہو ؎

اختیار آں را نکو باشد کہ او ٭ مالکِ خود باشد اندر اتقوا

اور جس میں یہ صلاحیت نہ ہو تو وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہو جائے ؎

چوں نباشد حفظ و تقوی زینہار ٭ دور کن آلت رہا کن اختیار

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ جاہل بھی نہ ہو۔ اس ضمن میں وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد بیان کرتے ہیں کہ جاہلوں کی باتیں اس سبزے کی طرح ہوتی ہیں جو کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر ہو اور ایسی جگہ سے بچنا چاہیئے ؎

زاں علی فرمود نقلِ جاہلاں ٭ بر مزابل ہمچو سبزہ ست اے فلاں

اس کے بعد حضرت رومیؔ وفاداری پر زور دیتے ہیں کہ وہ ممبر وفادار بھی ہو۔

حق تعالیٰ فخر آورد از وفا ٭ گفت من اوفیٰ بعہدٍ غیرنا!

لیکن یہ حلفِ وفاداری Qualification ہوگا اور تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان کے تحت ہوگا۔ ؎

بیوفائی داں وفا باردِ حق! ٭ بر حقوقِ حق ندارد کس سبق

خدا کے حقوق پر کسی کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ ابن خلدون بھی اسی پر زور دیتے ہیں۔ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ پیغمبر

نے جو قانون پیش کئے ہیں وہ عام انسانوں کے وضع کئے ہوئے قوانین سے بدرجہا بہتر ہیں۔ اس طرح شوریٰ نظام تو ہوگا مگر اس کے اختیارات محدود ہوں گے۔ اسی خیال کو Jean Bodin نے بیان کیا تھا۔

Sovereignty cannot and should not infringe Divine Laws.

حضرت رومی نے یہ شرائط اس غرض سے پیش کی ہیں تاکہ ملک میں خوش حالی کا دور دورہ ہو اور کسی پر ظلم نہ ہو۔ وہ ظالم بادشاہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ظالم بادشاہ تمام دوسرے مدعیان سلطنت کو مٹا دیتا ہے لیکن آخر میں وہ خود بھی مٹ جاتا ہے۔ عربی کا ایک محاورہ ہے کہ سلطنت لاولد ہوتی ہے ؎

آں شنیدستی کہ الملک عقیم ؛ قطع خویشی کرد ملکت جو، زبیم

ہرچہ بایداو بسوزد بر درد!! ؛ چوں نیابد ہیچ خود راے خورد

وہ ظالم حکمرانوں کے قصے نہایت دلچسپ الفاظ میں پیش کرتے ہوئے ان پر شدید طنز کرتے ہیں۔ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بادشاہ جامع مسجد جارہا تھا اور اس کے آگے چوبدار جارہے تھے اور انہوں نے ایک بیگناہ کو مارا۔ اس غریب نے بادشاہ سے یوں کہا ؎

سوئے جامع مے شدے یک شہریار ؛ خلق راے زد نقیب و چوبدار

آں یکے را سر شکستے چوب زن ؛ واں دگر را بر یدے پیرہن

درمیانہ بے دلے، دہ چوب خورد ؛ بے گناہے کہ بر دلے راہ گرد

خوں چکاں رو کرد بادشاہ وگفت ؛ ظلم ظاہر بین چہ پرسی از نہفت

خیر تو ایں ست جامع مے روی

تا چہ باشد شرِ دخرت اے غوی

رومی ملک گیری کے خلاف ہیں، فرماتے ہیں ؎

آخر دم زادہ اے نا خلف

چند پنداری تو پستی را شرف

چند گوئی من بگیرم عالمے! ؛ ایں جہاں را پر کنم از خود ہمے

وہ متکبر بادشاہوں سے کہتے ہیں ؎

تختہ بندست آنکہ تختش خواندۂ! ؛ صدر پنداری و بر در ماندۂ!

جس کو تخت کہتے ہو وہ ایک قید ہے۔ جس کو تم خاص نشست کی جگہ سمجھتے ہو وہ دروازے پر پڑا رہنا ہے ؎

شاہ آں باشد کہ از خود شہ بود ؛ نے بمخزنہا دگوہر شہ بود

بادشاہ وہ ہوتا ہے جو اپنی ذات سے بادشاہ ہو نہ کہ سونے اور چاندی کے خزانوں سے یعنی اس میں حقیقی صلاحیت ہو۔ حکومت کا دوسرا فرض یہ بتاتے ہیں کہ وہاں عدل وانصاف ہو ؎

در زمان عدلش کہ آہو با پلنگ ؛ اُنس بگرفت و بروں آمد زجنگ

وہاں کبوتر کو عقاب کا ڈر نہیں ہوتا ؎

شد کبوتر ایمن از چنگال باز ؛ گوسفند از گرگ ناورد احتراز

اور ملک میں محکمۂ عدلیہ کا بھی اعلیٰ انتظام ہو ؎

او میانجی شد میان دشمنان ؛ اتحادی شد میان پر زنان

ملک زان دادست مارا کن فکان ؛ تا تنالد خلق سوئے آسمان

ان فرائض کے بعد وہ سوشلسٹ مفکرین کی طرح فرماتے ہیں کہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ Social Security انتظام کرے ؎

ما عیال حضرتیم و شیرہ خواہ

گفت الخلق عیال للّٰہ

یہ اس حدیث کا ذکر ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو اس کے عیال کے ساتھ نیک سلوک کرے۔ اور تخلقو باخلاق اللہ کے وسیع نظریے کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

شاہ را باید کہ باشد خوئے رب

خوئے رب کا لفظ ملاحظہ ہو۔ کارل مارکس کی پوری کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں انسان کے علاوہ حیوانات کی خوراک کا خیال بھی لازمی ہوگا۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ اگر فرات کے کنارے کتا بھی بھوک سے مر جائے تو عمرؓ کو قیامت کے دن جواب دینا ہوگا۔

حضرت رومیؒ تمام لوگوں سے مساویانہ سلوک کے حامی ہیں۔ حکومت کا مسلم و غیر مسلم نیک و بد سب کے ساتھ سورج اور بارش کی طرح سلوک ہو ؎

بہر گبر و مومن و زیبا و زشت

ہم چو خورشید و مطر بل چوں بہشت

اور اس طرح ملک کو جنت بنا دیا جائے اور معاشی لحاظ سے ایسی ترقی یافتہ ریاست ہو جہاں سے یہ صدا بلند ہو ؎

جود محتاج گدایاں چوں گدا

بانگ مے آید کہ اے طالب بیا

یہی Welfare State ہے جس کا ذکر صدیوں پہلے حضرت رومیؒ کر گئے ہیں۔ وہ حکومت اور لوگوں کو اپنے ملازمین کے ساتھ عمدہ برتاؤ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کارل مارکس سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اپنے غلاموں کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو ؎

شرم دارم از نبی ذو فنون ؛ البسوہم گفت مما تلبسون

زاں خورانم من غلاماں را کہ من ؛ مے خورم بر خوان خاص خویشتن

حکمران طبقے کو مخاطب کرنے کے بعد رومیؒ عوام کے متعلق یوں فرماتے ہیں ؎

ہست آں خوار زم شہ شاہ جلیل ؛ دل ہے خواہد از یں قوم رذیل

ان کا اشارہ قرآن کریم کی اس آیت کی طرف ہے۔ ان اللّٰہ لا ینظر الی صورکم و اموالکم بل ینظر الی قلوبکم و اعمالکم۔

حضرت رومیؒ قوم سے قلب سلیم کا مطالبہ کرتے ہیں۔ قلب سلیم کا نظریہ [illegible] پیش کیا ہے مگر الفاظ ذرا مختلف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان میں Lower Self اور Higher Self ہیں۔ Lower Self سب کا یکساں ہے اور اسکی بناء سے حقیقی مفاد بھی ایک جیسے ہیں۔ جب انسان کا Higher Self ...

(باقی بر صفحہ)

پروفیسر محمد حبیب مفتی
صدر شعبۂ فارسی۔ پشاور یونیورسٹی

رومی

(چند باتیں)

حضرات!
میں تقریر کے لیے تیار ہوں یا نہ ہوں لیکن عزیز محترم جناب پرنسپل اسمٰعیل سیٹھی صاحب کی محبت و خلوص کے آگے بقول
غالب ...... جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا۔ سب عزائم ایک طرف اور ان کا اشارہ ایک طرف!
حضرت مولینائے روم کے متعلق آپ نے اب تک جو تقاریر سنیں ان میں سے ہر ایک میں مولینا کی زندگی، تصوف یا شاعری کا کوئی نہ کوئی پہلو سامنے آتا تھا۔ تقریریں بھی اتنی خردمندانہ کہ میرے لئے مشکل سے ہی کوئی بات رہ گئی ہو جو پیش کروں اور ویسے بھی مولینا رومی کی اس محفل میں عقل و خرد کو کچھ بہت زیادہ ساتھ نہیں لایا تھا وہ تو بہ حیثیت پروفیسر اور معلم کے ہمیشہ ساتھ رکھنی ہی پڑتی ہے۔ میں تو اس بزم میں اس حکم کے تحت آیا تھا کہ ؎

یا تو حواس و ہوش کو مستی و بیخودی سکھا
یا نہ کسی کو ساتھ لے اسکی حریم ناز میں

ہمارے ایم اے فارسی کے کورس میں حافظ، خیام اور رومی ہیں۔ پڑھاتے وقت خصوصًا رومی اور حافظ میں مجھے وہ نکتہ آیا جس کی طرف میرے محترم جناب ڈاکٹر مظہر علی خان صاحب نے اپنے دولت کدے پر بزم رومی کے سلسلے میں اشارہ کیا تھا:
بقولِ جگر:- ؎

اے متاعِ سخن کے متوالے
ماورائے سخن بھی ہے اک بات

اس "ماورائے سخن" پر مجھے اپنے زمانۂ طالب علمی کا ایک لطیفہ یاد آیا۔ میرے والد مرحوم مفتی سعادت اللہ صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک شاگرد تھے جو علمِ طب اور موسیقی کے بھی ماہر تھے اور ہارمونیم بجانے میں ہندوستان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے جس میوزک کانفرنس میں حصہ لیتے طلائی تمغہ اور پہلا انعام حاصل کرتے۔ بڑے بڑے ماہرین موسیقی ان کے ہاتھ پاؤں چومتے اور ان کا لوہا مانتے تھے۔ میں کالج میں پڑھتا تب مجھے سننے کا اشتیاق ہوا۔ ان کے پاس پہنچا۔ اور ہارمونیم کی فرمائش کی۔ وہ حیران کہ اس نوخیز، موسیقی سے ناآشنا لڑکے کو کیا سناؤں اور ہے استادزادہ، انکار بھی نہیں کرسکتا۔ غرض کچھ معذرت کرتے ہوئے انہوں نے میری خاطر سے ہلکے پھلکے گانے، کچھ غزلیں سنائیں۔ میں بہت لطف اندوز ہوا۔ مگر اس سے کہ ان کی انگلیاں ہارمونیم کے پردوں پر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ چل رہی ہیں اور کوئی فنی بات سمجھ میں نہ آئی۔ ان کے احباب میں سے ایک صاحب مجھے ایک طرف لے گئے اور کہا صاحبزادے آؤ میں تمہیں ان کی مہارت کا راز سمجھاؤں۔
"تم جانتے ہو کہ آل انڈیا ریڈیو نے حال ہی میں ہارمونیم کو اپنے باجوں کی فہرست سے ناقص سمجھ کر نکال دیا ہے۔ وہ کہتے

کہ یہ ایک محدود اور ناقص باجہ ہے۔ نہ بلندی میں آواز کا ساتھ دے۔ نہ پستی میں۔ پنچم میں ناقص۔ مدہم میں ادھورا۔ آواز کے اتار چڑھاؤ کا ساتھ نہیں دیتا۔ برخلاف اس کے سارنگی وغیرہ گانے والے کا ساتھ عالم بالا اور تحت الثریٰ تک دیتے ہیں۔ جہاں تک لیجاؤ ساتھ ساتھ ہیں۔ لہذا ان حکیم صاحب کا کمال یہ ہے کہ یہ اس ناقص باجے سے بھی کامل کا کام لے لیتے ہیں اور اس سے وہ وہ سُر نکالتے ہیں جو اسکی بساط سے باہر ہیں۔ اسی کمال کا انعام ہے۔
ان کی اس تشریح سے ایک نکتہ آج میری سمجھ میں آیا اور وہ یہ کہ بہ شعرا مثلاً رومی۔ عطار۔ حافظ۔ نظیری۔ عرفی اور اس پائے کے اور لوگ اشعار میں وہ "سہل ممتنع" ادا کر دیتے ہیں جو الفاظ کی دنیا سے باہر کی باتیں اور ان کی بساط سے بہت اونچی ہیں۔

یہ ہی نہیں بلکہ اس عالم کی اور اس مقام کی باتیں کرتے ہیں جہاں جاکر رومی کہتا ہے۔

گفت آنچہ یافت می نہ شود آنم آرزوست

اور جس کے متعلق فیضی کہتا ہے:۔

من براہی می روم کانجا قدم نامحرم است

وز مقامی حرف می گویم کہ دم نامحرم است

اس کے ساتھ ساتھ اگر چشم حق بین ہو اور جہالت کا پردہ ہٹا دیا جائے تو انسان دیکھ سکتا ہے کہ شاعر بلند پروازی کر رہا ہے اور اونچا جاتا ہے۔ اور اس عالم سے دور ایک عالم میں پہنچتا ہے۔ وہاں پہنچ کر کتنے لمحے ٹھہرتا ہے۔ وہاں کی باتیں کہتا ہے اور پھر واپس آپ کی دنیا میں آجاتا ہے۔ یہ سب کچھ آپ اس کے کلام میں دیکھ رہے ہیں۔ حافظ کی ایک غزل سامنے ہے۔ ملاحظہ کیجئے:۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
واندران ظلمتِ شب آب حیاتم دادند
بی خود از شعشعۂ پرتو ذاتم کردند
بادہ از جام تجلی بصفاتم دادند
چہ مبارک سحری بود و چہ فرخندہ شبی
آن شب قدر کہ این تازہ براتم دادند
چون من از عشق رخش بیخود و حیران گشتم
خبر از واقعۂ لات و مناتم دادند

دیکھا آپ نے کہاں پہنچا ہے۔
اور پھر ذرا ہوش آتا ہے تو کہتا ہے:۔

کہ ز بندِ غم ایام نجاتم دادند

رومی فرماتے ہیں:۔

پر و بال ما کمند عشق او ست
موکشانش می کشد تا کوی دوست

من چه گویم ہوش دارم پیش و پس
چون نباشد نور یارم پیش و پس
نور او در یمن و یسر و تحت و فوق
بر سر و بر گردنم چوں تاج و طوق
عشق خواہد کایں سخن بیروں رود
آئینہ ات غماز نبود چوں بود

ایک بات مجھے مولینا کے متعلق اور بھی کہنی ہے وہ یہ کہ جن مسائل میں اور شعراز مین آسمان کی باتیں کرتے ہیں۔ مولینا رومی قرآن کے قدم بہ قدم چلتے ہیں۔ اور ان کا نظریہ بعینہٖ وہی ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ مثلاً حافظ وخیام کہتے ہیں کہ انسا مجبور ہے نہ دنیا کے عقدے کھول سکتا ہے نہ کھول سکے گا آوٗ مست رہیں۔ اس نظریے میں اصولی غلطی یہ ہے کہ

جبر کی دو قسمیں ہیں ایک یہ خیال کہ بندہ کو کسی قسم کا کم و بیش اختیار دیا ہی نہیں گیا۔ یہ فرقہ جبریہ کا اعتقاد فاسد ہے یہ کتاب وسنت کے بالکل خلاف ہے اور اس کی نتائج یہ ہیں، نقص اعمال، ترک فرائض، فاحشات اور گناہوں پر بے باکی اور اپنی بے گناہی اور عدم مواخذہ کا اعتقاد۔ یہ جبر مذموم اور ناقابلِ تحسین ہے۔

دوسرا جبر وہ ہے جو اللہ کے اختیار کے مشاہدے میں مغلوب اور محو ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالی کی قدرت اور طاقت کے مقابلہ میں انسان اپنے آپ کو بے بس پائے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کو اپنے اختیارات کا بھی علم ہو جو اللہ نے اس کو دیئے ہیں۔ مگر اس مختار اور قادر مطلق کے سامنے اپنے آپ کو عاجز سمجھے۔ یہ جبر قابلِ تحسین ہے۔ پہلے جبر کا قائل اللہ سے واصل نہیں مگر دوسرے جبر والا اللہ والا ہے۔

مولینا فرماتے ہیں :-

پای داری - چوں کنی خود را تو لنگ
دست داری - چوں کنی پنہاں تو چنگ
خواجہ چوں بیلی بدست بندہ داد
بی گماں معلوم شد اورا مراد
دست ہمچو بیل اشارتہای اوست
آخر اندیشی - عبارتہای اوست

اسی سلسلے میں سورۃ دہر کی شرع کی چند آیات کا ترجمہ پیش کئے دیتا ہوں۔ ان آیات کی تدریج اور ترتیب غور طلب ہے۔

(۱) هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ○
انسان پر ایک وقت ضرور آچکا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھا۔

(۲) إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ ○
ہم نے انسان کو ایک مرکب نطفے سے پیدا کیا۔

بِتَبْتَلِیْہِ۔
تاکہ ہم اس کو آزمائیں (یہ لفظ ترجمہ چاہتا ہے اس لئے کہ انسان کہتا کہ آزمائش بغیر اسباب، ہتھیار، آلات اور ٹریننگ کے کیسے ہو سکتی ہے، نہ قلم نہ دوات نہ تحریر سکھائی نہ سبق پڑھایا۔ پھر ازمائش کیسی؟ لہٰذا اس کا جواب آگے کی آیت میں ہے)

۳) فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا۔
تو ہم نے اس کو کان اور آنکھیں دیں یعنی سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔
(اب ایک قدم اور بھی ساتھ دیتے ہیں)

۴۔ اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ۔
ہم نے اس کو راستہ بھی دکھا دیا۔

۵) اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا۔
یا تو شکر گزار بنے یا ناشکر۔ (یہ اب اسے اختیار ہے)

بقیہ

(حضرت رومی بحیثیت سیاسی مفکر)

کسی بُری چیز سے روکتا ہے اور وہ قانون کی پابندی کرتا ہے تو یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق عمل کر رہا ہے۔ ایسے قوانین اور ایسی حکومت کو HEGEL بلند مقام دیتے ہیں اور MARCH OF GOD UPON EARTH سے تعبیر کرتے ہیں۔ HIGHER SELF اور LOWER SELF کو رومی یوں پیش کرتے ہیں:۔

در حدیث آمد کہ یزدان مجید ٭ خلق عالم را سہ گونہ آفرید
زاں سوم ہست آدمی زاد و بشر ٭ از فرشتہ نیمے و نیمش ز خر

حضرت رومی نے LOWER SELF کو کنٹرول کرنے پر بار بار زور دیا ہے۔ صرف اس نکتہ پر عمل کیا جائے تو اس دنیا کا نقشہ ہی بدل جائے۔

رُومیؒ

"رومیؒ آں عشق و محبت را دلیل
تشنہ کاماں را کلامش سلسبیل" (اقبالؔ)

عشق نزد اوست تعمیر تمام ٭ در فلاطون راست تخییر تمام
در حریم عشق جان او تپید ٭ نور حق از جنبشِ شوقش پدید
عشق در فکرش بنائے کائنات ٭ در نگاہش سوختن اصل حیات
گفتہ اش حسن و جلال کبریاست ٭ از نگاہ او خدائی با خداست
زندگی از نطق او محکم تراست ٭ بندگی از گفتہ اش بالا سراست

آنکہ در میخانۂ رومی نرفت
از مئے روحانیت محروم گشت
کور چشمانش کہ رومیؒ را ندید
تا ابد مست ست کو جامش چشید
در حریمش شوق و مستی زندگیست
در طریقش بے خودی شرمندگیست

فاش گشت از سوزِ او سرِ خودی ✻ از خودی بیگانگی، مرگِ خفی

مثنوی مولوی معنوی" ✻ رقص و مستی نغمہ و سوزِ جلی

روح کی در نوائے اعجمی! ✻ "ہست قرآں در زبانِ پہلوی"

حکمت رومیؒ بنائے جوہر ست

حکمت حاضر برائے جوہر ست

گفت " دنیا از خدا غافل بدن

نے قماش و نقرہ و فرزند و زن'

آسماں درگیر و معراجے بگیر

دل بہ یزداں آرد دنیا راپذیر

دین از دنیا بریدن کافریست

دنیا را از دیں ربودن ساحریست

از قماش و نقرہ ہم غافل مشو

و نہ برائے این ز کوئے حق مرو

(یوم رومی" کیلئے لکھی گئی)

پروفیسر شرر نعمانی

رومیؒ

دیارِ عشق میں ایسی صدا بلند ہوئی
کہ جس نے دَرد کے ماروں کو لوٹ لوٹ لیا
تعینات کے پردے اٹھا دئے سارے
دلوں کو نور دیا ذہن کو سرور دیا

دیارِ عشق میں ایسی صدا بلند ہوئی
کہ جھُوم جھُوم اٹھے معرفت کے میخانے
عجم کے بادہ گساروں کے فیضِ عرفاں سے
زمیں پہ آج تلک رقص میں ہیں پیمانے

کسی نے دشتِ وفا میں قدم قدم چل کر
ہمیں سکھایا ہے اندازِ دشت پیمائی
کسی نے جام اٹھایا تو آج بھی ہم ہیں
جہاں میں واقفِ آئینِ جام صہبائی
کسی نے عشق کی عظمت کا راز سمجھا کر
وہ اک حجابِ من و تو اٹھا دیا یکسر

پھر آج عقل کے اندھوں کی شہریاری ہے
نئے جہانِ تصوّر کی ہو گئی تشکیل!
کسے خبر ہے کہ اِس رنگ و بو کے عالم میں
فنائے عشق بقائے دوام کی ہے دلیل

پھر اس صدا کی ضرورت ہے جس سے گونج اٹھیں
یہ بر و بحر یہ دشت و جبل یہ کوہ و کمر
پھر ایک بار تسلط ہو نورِ ایماں کا
جمالِ مہر کی مانند ابرِ ظلمت پر

پھر آج بزمِ جہاں کی عجیب حالت ہے
کہاں ہے مردِ قلندر بڑی ضرورت ہے

(دیوم تعلیٰ کیلئے لکھی گئی)

محمد اقبال مدیر حصہ اردو

آقائی ناظرزادہ کرمانی کے ساتھ ایک شام

۱۶ رمارچ کی حسین شام کو ہمارے کالج میں ایران کے سابق وزیر تعلیم و معارف اور تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ناظرزادہ کرمانی کے اعزاز میں ایک پُروقار علمی او ادبی محفل منعقد ہوئی جس میں ہمارے کالج کے علاوہ محکمۂ تعلیم پشاور، پشاور یونیورسٹی، اسلامیہ کالج پشاور اور شہر کے بہت سے ایسے افسروں، پروفیسروں اور معززین نے خصوصی طور پر شرکت فرمائی جو فارسی زبان و ادب کے شیدائی ہیں اس محفل میں آقائی کرمانی نے فارسی ادب پر ایک گراں قدر تقریر فرمائی۔ گورنمنٹ کالج پشاور کے شعبۂ فارسی کے پروفیسر افغانی اور پروفیسر جعفر حیات جعفری نے سپاس نامے پیش کئے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر کرمانی نے ایک نظم بھی پیش فرمائی جو انہوں نے اپنے قیام پاکستان کے دوران میں لکھی۔ پشاور کے چند مشہور فارسی شعرا نے بھی سامعین کو اپنے کلام سے نوازا۔ غرض یہ شام کالج کی ادبی زندگی کے راستے میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس محفل کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے سپاس نامے، آقائے کرمانی کی نظم اور شعرا حضرات کے کلام کا انتخاب ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

پروفیسر عبیدالرحمان افغانی۔

خانمہا و آقایان! خیلی افتخار دارم کہ امروز جناب آقای ناظرزادہ کرمانی درمیان ما تشریف آوردہ موجب فرحت و انبساط این محفل فرخندہ شدہ اند۔ جناب آقای دکتر کرمانی نہ تنہا از کشور ایران ہستند کہ خیلی محبوب و عزیز ماست۔ بلکہ ایشان درجہان ادب نیز یک مقام شامخ دارند، و در دانشکدہ ای نقول و معقول تہران کہ درسگاہ بس عظیمی و مہمی است دارای کرسی ادبیات میباشند جناب دکتر کرمانی از بدو زندگانی خود با دبیات فارسی نہ از حیث ایرانی بلکہ از نظر یک فاضل دانشمند علاقہ مفرطی دارند۔ و مولف چند تا کتاب ہستند کہ مورد تقدیر دانشجویان و علاقمندان زبان فارسی گردیدہ است۔ ایشان در شعر فارسی ہم ذوق طبیعی دارند۔ و منظومہ ہای شان خیلی پرشور و نغز میباشد۔ ذات گرامی ایشان برای اینکہ جناب آقای دکتر باکشور ہای پاکستان صمیمیت و دوستی از بن عمیق قائل ہستند۔ و در سراسر محافل علم و ادب پاکستان معروف و محبوب است۔ بیجا نیست اگر درین محل بندہ امتنان و تشکر ادلیای امور این دانشکدہ و دانشجویان عزیز را ابراز کنم۔ زیرا کہ وجود فاضلان مایہ ای تسکین و الہام میباشد اہل پاکستان از روز تاسیس و بوجود آمدن این کشور اسلامی با ایران و ہرچہ با ایران مربوط است پیوند محبت و دوستی دارند۔

در جہان امروز دو کشور وجود ندارد کہ مانند ایران و پاکستان دوستی کہ بر اساس مہر و محبت قائم است داشتہ باشد ہرکسی کہ در پاکستان زندگی می کند با ایران و ایرانیان اینگونہ علاقمند است کہ گوی ایران خانہ دوم ماست۔ و ہمچنین برای ایرانیان پاکستان خانہ ای خود شان میباشد۔

جناب آقای دکتر کرمانی از حیث نمایندہ ای کشور ایران در کنگرۂ اسلامی کہ اخیر در کراچی تشکیل شدہ بود شرکت داشتند

داز سخنرانیهای فاضلانهٔ خود اہلِ پاکستان را تحت تاثیر زیادی قرار دادند. و اینک برای یک مسافرت کوتاہی به این قسمت پاکستان تشریف آوردند. از لطف و محبت ایشان خیلی ممنون ہستیم۔

از جناب آقای دکتر استدعا میکنم خاطرات با ارزش خود را به حضار محفل ابراز نموده یک نقش فراموش ناکردنی بگذارند۔

پروفیسر سید جعفر حیات جعفری۔

" اے آمدنت باعثِ خوشنودیٔ ما " مہمانِ گرامی ما امروز خیلے خوشنود گشتیم که یکے از دانشمندان مملکت پہلوی آقائے پرفیسور کرمانی با وجود مصروفیاتِ گوناگوں خود در این دانشکدهٔ ملی ما قدم رنجه فرمودند. این اول مرتبه نیست که اہل فضل و دانشمندان ایران در این خطهٔ سرزمین ما تشریف آورده اند. ازین پیشتر ہم اعلیٰ حضرت شہنشاه ہمایونی، و دیگر دانشمندانِ ایران آقائے فروز نفر. آقائے منوچہر. آقائے نفیسی و آقائے علی کافی از قوم خود این خاکِ پاک ما را سرفراز کرده اند۔

و لے دانشجویانِ این دانشکده اول بار افتخار استقبالِ یک دانشمند سرزمین ایران را حاصل کردند گرامی منزلت. چطور که شما خود تان می دانید مملکت ایران با پاکستان یک رشته دوستی و یگانگت از قرنہا قرن دارد. زیرا که ایران قریب ترین ہمسایه اہل سرزمین ماست، ہمیشه دانشمندان و دانشجویان ایران درین سرزمین ما تشریف آوردند. و چوں بامند و بین ما ہم به خاک پاک ایران رفته اند. و این آمد و رفت ہر دو اسلامی مملکت را با ہمدیگر نزدیکتر کرد و تہذیب و ثقافتِ پاکستان عموماً و از پشاور خصوصاً از ایران خیلے متاثر میباشد۔

اہلیان پاکستان امروز ہم فردوسی، سعدی، خیام و حافظ را از غالب و اقبال کمتر نمی دانند. و زبانِ فارسی را مثلِ زبانِ ملی خود عزیز دارند۔

مہمان عزیز. این خوش بختیٔ ما است که شما در موسم بہار در وطن ما ورود فرمودید و بہار ما را خوشتر ساختید. من توقع دارم که شما برای سرزمین ما اجنبیت و غیریت محسوس نه کرده باشید. و امید داریم که شما بارے دیگر ہم بر سرزمین ما تشریف خواہید آورد۔

وداع و وصل جداگانه لذتے دارد ؛ ہزار بار برو صد ہزار بار بیا!

دکتر احمد ناظر زاده کرمانی
استاد ادبیات فارسی در دانشکدهٔ منقول و معقول ایران

مرغِ آتش دم

مرغِ آتش دم مرا چون بامدادان برگرفت　　سوی راولپنڈی از شهر کراچی پر گرفت
همسفر با ابرها غرّش کنان در طی راه　　هر زمان با باد و باران کشمکش‌ها در گرفت
سرعت او حیرت آور قدرت او سهمگین!　　در جدال خصم رسم مرد جنگ آور گرفت
تل و کوه و دشت و هامون و بیابان هرچه بود　　با دو بال آهنین زیر قدم یکسر گرفت
بارها گفتم که طوفانش فرود آرد ز اوج!　　لیک هنگام خطر نیروی افزون‌تر گرفت
بود از آنجا ز پرواز آرزوی آدمی!!　　شاهد مقصود را امروز خوشش در بر گرفت
آتشین دم مرغ آهن پیکر گسترده بال　　چون براول هندی آمد راه پیشاور گرفت
در درونش شاعر ایرانی آشفته حال!　　شکوه‌ها را با دل اندوهگین از سر گرفت
از درونم نالهٔ برخاست کای عهد توست　　چون توانستی دل از یاران ایران گرفت
فصل نوروز است و هر کس در دیار خویشتن　　از درخت فرح آسا آتش آکنون برگرفت
جز تو کافتان بغربت آواره دور از دوستان　　هر که کاری نار وا کرد از جهان کیفر گرفت
گرم این اندیشه‌ها بودم که تا که شد پدید　　شهر پیشاور که پیشی در شکوه و فر گرفت
مرغ آتش دم فرود آمد بجای کو نشاط　　باد نوروزش بروی آب آتش اندر گرفت
بر زمین تنها دو پا پیدا شدند از هر طرف　　استادانی کز آنان فارسی زیور گرفت
پیش آوردند در پیشاورم مهری کز آن　　جان نشاط دانشین دل شوق جان‌پرور گرفت
دل بحد و تنگ سرایی جاکه از روز نخست　　پردهٔ از پیش چشم تنگهٔ خیبر گرفت
در حقیقت عشق آمد رهنمای عارفان　　از طبیعت علم بهر آدمی یاور گرفت
پاکبازی کار عشق و چاره سازی کار علم　　زین دو بال اقبال پاکستانیان شهپر گرفت

چون زبان پارسی روشنگر شوق است و حال
شعله‌ها زین شعر خوشش در جهان خشک و تر گرفت

انتخابِ کلامِ شعراء

پروفیسر امداد حسین بیگ

مهمانِ ماز جانب کرمان خوش آمدی — از ملتِ نجیبۂ ایران خوش آمدی
ما ایم هر دو ملت هم زاده هم زبان — ما نیز هر دو ایم مسلمان خوش آمدی
پیش آمد زمانه به پشاور است کشاں — ز ملکِ خود ز جانب تہران خوش آمدی
ایں جاست خانۂ تو، توئی میزبان لیک — ظاهر شدی به صورت مهمان خوش آمدی

حضرتِ جگر کاظمی

می خواستم که سر بسوئے صحرا دہم مگر — بختم نگر که خار به پائے جنوں شکست
فرہاد را نبود چنیں پایۂ بزرگ — نازم به عشق کز دوش بے ستوں شکست
در حسن و عشق گشت تصادم جگر دوے — دانم که دل شکست ندانم که چوں شکست

حضرت برق کوہاٹی

خرد زا نجاز تمکین مژه دیوانه میخیزد — ز بزمش هر که از خویشتن بیگانه میخیزد
بنازم آتش برق تجلائے جمالش را — که از هر ذرۂ خاکسترم پروانه میخیزد
بتعلیمِ محبت ما و مجنوں هم سبق بودیم — کسے دیوانه میخیزد کسے فرزانه میخیزد
پئے تعظیم من در مجلس پیرمغاں اے برق — صراحی سر بسجده میشود پیمانه میخیزد

حضرت کوکب سرحدی

وفائے وعدہ آنت معلوم اے پیماں شکن اما — بسرت گردم اگر با وعده نمی کردم چه می کردم
به ایں محشر خرامیها که آں ساقی به بزم آمد — دل و دیں نذر یک ساغر نمی کردم چه می کردم

پروفیسر ایم۔ اے کاظمی

ساقی نامہ

اقبال کے مجموعۂ کلام میں دو نظمیں ایسی ہیں جنہیں ان کے افکار و خیالات کا مکمل خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔ بانگِ درا میں خضرِ راہ اور بالِ جبریل
ساقی نامہ۔ ان دو نظموں کے علاوہ اور بھی اہم نظمیں ہیں مثلاً بانگ درا میں طلوعِ اسلام اور شمع و شاعر اور بالِ جبریل میں مسجدِ قرطبہ، ذوق و
اور مکالمۂ جبریل و ابلیس۔ لیکن ہر نظم ان کی حکمت اور ان کے فلسفے کے کسی ایک پہلو یا چند پہلوؤں کی ترجمانی کرتی ہے۔ پیرِ رومی
مریدِ ہندی، البتہ ایک ایسی نظم ہے جس میں بہت سے مختلف مسائل آ گئے ہیں اور مکالمے کی شکل اور ایمائی انداز میں تقریباً ہر مسئلے کا
ب بھی مل جاتا ہے مگر یہ نظم اقبال سے زیادہ پیرِ رومی کے فلسفہ کا خلاصہ ہے۔ اس کے علاوہ بعض چیزیں جنہیں اقبال کے نظریات
بنیادی حیثیت حاصل ہے، کچھ زیادہ نمایاں بھی نہیں ہوتیں۔

ساقی نامہ کا رواج فارسی اور اردو شاعری میں قدیم سے پایا جاتا ہے۔ بالعموم ساقی نامہ میں آمدِ بہار کا مژدہ اور ساقی سے مے کی
ب کی جاتی ہے۔ مسلسل اظہارِ خیال کے بعد شاعر ایک ذہنی تکان محسوس کرتا ہے جس کے ازالہ کے لئے وہ ساقی سے ایسی شراب کا طالب
ہے جو مزید نشے اور سرشاری کا موجب بن کر اس کی ذہنی کسلمندی کو دور کر دے۔ تصوف میں ساقی کا لفظ ایک ابدی سرشاری کا سرچشمہ
۔ جس سے شاعر زندگی کے اہم سے اہم مسائل کا حل تلاش کرتا ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے ساقی نامہ مثنوی کے طرز میں لکھا جاتا ہے
چہ بعض شاعروں نے مسدس اور غزل کو بھی ساقی نامہ کا رنگ دیا ہے۔ اقبال کی شاعری میں ہیئت کے نئے تجربے کم ہیں۔ ان کا زورِ بیان
نے سانچوں میں نئے خیالات کے اظہار سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس ساقی نامہ میں بھی مثنوی کے قدیم انداز میں جن خیالات کو بیان کیا
ہے وہ نئے ہیں اور اندازِ بیان بھی اس طرح نیا معلوم ہوتا ہے۔

پہلا بند آمدِ بہار کی منظر کشی پر صرف ہوا ہے۔ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ آمدِ بہار جیسے زندگی کا مژدہ لے کر آئی ہے۔ اس
سب سے نمایاں حرکت اور پرواز ہے یا ذوقِ نمو کی خواہش۔ گل و نرگس، سوسن و نسترن اور اقبال کا مرغوب شہیدِ ازل لالۂ صحرا ان سب
نمو سے دامنِ کہسار باغِ ارم بن گیا۔ پتھر بظاہر جامد و ساکت چیز ہے لیکن یہ محسوس ہوتا ہے کہ رگِ سنگ میں بھی لہو گردش کرنے لگا ہے
ئر جو نغمہ سنجی کر رہے ہیں اپنے آشیانوں سے باہر نکل آئے ہیں۔ آشیاں بندی یوں بھی اقبال پسند نہیں کرتے چنانچہ طائروں کی اقلیم
شہنشاہ شاہین آشیانہ بناتا ہی نہیں جو طائر آشیاں پسند ہیں وہ بھی آمدِ بہار پر آشیاں کی قید سے آزاد ہو کر نیلی نیلی فضاؤں اور کھلی ہواؤں
پرواز کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد اقبال چوٹے کہستاں کا تذکرہ کرتے ہیں جو اٹکتی، لچکتی، سرکتی، [illegible]، پھسلتی، سنبھلتی اور پیچ کھا کر
تی، بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ان چار مصرعوں میں اقبال نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں، ان کا صوتی تاثر بڑا محرک ہے اور پڑھنے والوں کو
رے کی نظم رود اتی ڈیا کا وہ ترجمہ یاد آ جاتا ہے جو اکبر نے کیا تھا۔ لیکن اگلا شعر اقبال کے اپنے نظریات کا ترجمان ہے ؎

رُکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ ۔۔۔ پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

اس ایک شعر سے یہ ندی صرف سبک تیز اور نرم رو ہی نہیں رہتی بلکہ اس میں طوفانوں کی شوکت پیدا ہو جاتی ہے۔ پہاڑوں کی

چنانچہ اس کی راہ میں مزاحمت نہیں کر سکتیں بلکہ اس سے اُس قوتِ مقابلہ میں اضافہ ہوتا ہے جس پر زندگی کی ترقی کا دارو مدار ہے
کے نزدیک یہ جوئے کہستاں زندگی کا پیام سناتی ہے۔ اس کے بعد اقبال ساقی سے شراب طلب کرتے ہیں لیکن وہ شراب نہیں جو ہوش
پر پردہ ڈال دے اور غفلت یا بے ہوشی طاری کرے بلکہ وہ شے جسے اقبال "مئے پردہ سوز" کہتے ہیں۔ یہ ترکیب اقبال کی اپنی ہے۔ شر
تندی و تیزی اور آبگینے کا "تندیٔ صہبا" سے پگھل جانے کا مضمون پہلے بھی شاعروں نے نظم کیا لیکن احساسِ کمتری کو چاک کرنے کے لئے
کی تلاش اقبال کے یہاں ہی ملتی ہے۔ یہ شراب دراصل صوفی کی شرابِ معرفت ہے۔ جس سے ہستیٔ کائنات قائم اور ضمیرِ حیات روشن ہے
صوفی اس شراب کو پی کر اپنی ذات کو نفی میں بھلا کر اصل حقیقت یعنی توحید کا اثبات کرتا ہے۔ اقبال کے یہاں زندگی کا یہ رجحان نہیں
لہٰذا وہ ساقی سے جس شراب کی طلب کرتے ہیں اسی سے معرفت حاصل کرنے کے بعد ممولہ شہباز سے نبرد آزما ہوتا ہے، اقبال
قوموں اور ملتوں میں یہی کشمکش ان کی ترقی کی ذمہ دار ہے۔

جس طرح آمدِ بہار گلستاں کا نقشہ بدل دیتی ہے اسی طرح ایک عالمگیر انقلاب نے قوموں اور ملتوں کی سیاست، حکومت
اقتدار کا نقشہ بدل دیا ہے۔ پرانا زمانہ جسے اقبال پرانی سیاست گری کہتے ہیں جس میں میر و سلطان کا دور دورہ تھا ختم ہو چکا اور نئے
نے اہلِ دنیا کو ان سے بیزار کر دیا۔ فرنگیوں کی سیاست جسے اقبال ایک طرح کی نظر بندی یا دھوکا بتاتے ہیں، اب اس پر سے پرد
چکا ہے۔ ؎

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ ٭ کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ

اس شعر میں ان سیاسی حالات و واقعات کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے مشرقِ بعید اور مشرقِ وسطیٰ میں انگریزوں کے سیاسی
کو کم کر دیا اور جن کی بدولت ان کے زیرِ حکومت نوآبادیوں یا زیرِ اثر علاقوں میں آزادی اور حریت کی تحریکات شروع ہوتی ہیں یہ تح
مصر، ایران، افغانستان اور ملکِ ہند میں بیک وقت ظاہر ہوئیں۔ اقبال کا یہ شعر ؎

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے ٭ ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے!

آج ایک تاریخی پیشنگوئی معلوم ہوتا ہے۔ ایک طویل عرصے کی جدوجہد کے بعد چین نے آزادی حاصل کر لی ہے۔ اقبال
زمانے تک ان میں صرف سنبھلنے کے آثار پیدا ہونے تھے "ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے"۔ شاید اقبال نے محض شاعرانہ طور پر کہا ہو گ
ایک نئے نظام کے آغاز سے اس پیشگوئی کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے ؎

دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم ٭ تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم

دراصل ان انقلابات کی طرف اشارہ ہے جو عربوں میں آہستہ آہستہ رونما ہو رہے تھے اور جن کا مقصد سرمایہ داری کی
سے یہودیوں کی قائم ہونے والی سیاست اسرائیل کا مقابلہ کرنا تھا۔ یہ تحریک اس وقت کامیاب نہیں ہوئی اور جدوجہد کا وہ سلسلہ
تک جاری ہے اسی لئے اقبال کلیم کو تجلی کا منتظر دکھاتے ہیں۔

اگلے اشعار میں مسلمانوں کی تاریخ میں عجمی اثرات کے تباہ کن نفوذ کا ذکر کیا گیا ہے ؎

تمدن تصوف شریعت کلام ٭ بتانِ عجم کے پجاری تمام!
حقیقت خرافات میں کھو گئی ٭ یہ امت روایات میں کھو گئی!

آغازِ اسلام میں مسلمانوں کا تمدن بدوی تھا، تسخیرِ عجم کے بعد عجمی مدنیت انہوں نے اختیار کر لی جس کے نتیجے کے طور پر
پر تکلف، پرشکوہ اور عیش و عشرت کی اس زندگی کے عادی ہو گئے جو داستانِ الف لیلہ اور بغداد کی روایتی راتوں کی رنگینیوں میں
ہے۔ اس مدنی تمدن نے مسلمانوں کے قویٰ مضمحل کر دیئے اور اسی لئے ہندوستان سے آگے مسلمانوں کے قدم نہ بڑھ سکے۔ ہندوستان

رن لے کر آئے وہ اسلامی نہ تھا بلکہ عجمی تھا۔ اس میں چند ہندی عناصر کی آمیزش سے اس کا رشتہ اسلام سے اور بھی کمزور ہو گیا۔
سوف کا ہوا۔ صوفی کا لقب رسول اللہ کے زمانے میں نہیں تھا کیونکہ اس وقت صحابی سے زیادہ کوئی اور معزز لقب نہ تھا صحابہ
بعین اور تبع تابعین کے دور تک بھی یہ لقب نہیں ملتا۔ سب سے پہلے اس لقب کا رواج کوفہ اور بغداد میں ہوتا ہے جو تصوف
سے پہلے دو مرکز ہیں اور دونوں پر عجمی اثرات بہت نمایاں ہیں۔ صوفیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلامی تصوف کی بنیاد قرآن، حدیث
ن کی پابندی پر استوار ہے چنانچہ صوفیا نے قرآن کی آیات، احادیث اور بزرگانِ دین کے اقوال سے تصوف کے بعض
قربتِ الٰہی، توکل یا زہد کی خوبی، ذکر اور فکر کی اہمیت، عشق کا مرتبہ، صدق کی حقیقت وغیرہ موضوعات میں ایسی بعض ظاہری
۔ مگر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا۔ ان سادہ تعلیمات کی بنیاد پر عجمی تصوف کی عمارت کھڑی ہوتی گئی جس کا بنیادی پہلو یہ تھا کہ اس
کی تعلیم دی گئی تھی۔ (اس کی ایک بہت واضح مثال قدیم صوفیا میں ابراہیم بن ادھم کی زندگی سے ملتی ہے۔ صوفیوں کے
ابق ابراہیم بن ادھم بلخ کے شہزادے تھے اور جب انہوں نے دنیا میں اپنے گردو پیش بیماری، موت اور افلاس کو دیکھا
تاج چھوڑ کر فقیر ہو گئے۔ ان کا ایک قول ہے کہ "جس نے شادی کی اس کی مثال ایسی ہے جیسے کشتی پر سوار ہو گیا اور اس
ل اولاد ہوئی تو گویا کشتی ڈوب گئی"۔ ظاہر ہے یہ رہبانیت اسلام کی بنیادی تعلیمات کے منافی ہے اور کسی مسلمان کا عقیدہ نہیں
بعد میں جس قدر صوفیا کے سلسلے ملتے ہیں اور ان کے یہاں ترکِ دنیا، ترکِ دین اور خود ترکِ حیات کا جو رجحان ملتا ہے اس
صوف ہے۔

رن اور تصوف کے بعد اقبال نے شریعت اور کلام کو بھی بتانِ عجم کا پجاری بتایا ہے۔ شریعت دراصل قرآن اور حدیث
ہیں متعین کئے ہوئے راستے کا نام ہے لیکن مختلف فقہا نے قرآن اور حدیث کی تاویل میں اختلاف کیا ہے۔ اختلافات کا
ز چہ عجم کے اثر سے بھی پہلے شروع ہو گیا تھا لیکن عجمی تخیلات اور تصورات نے ان اختلافات کو اور بھی ہوا دی عجمی افتادِ طبع
مانہ اور منکرانہ انداز پسند کرتے تھے اور ہر چیز کی فلسفیانہ توجیہہ چاہتے تھے۔ ان پر یونان کے فلسفے کا بھی اثر زیادہ تھا۔
کے الہیاتی نظریے نے عربوں کی آزادی کی روح سے متصادم ہو کر اس اختلاف کو اور بھی بڑھا دیا اور اس پر شیعہ سنی اختلاف
زار ہوئی۔ سب سے بڑی دقت یہ ہوئی کہ تصوف اور شریعت کا تصادم ہوا۔ ایک کو راہِ شریعت اور دوسری کو راہِ طریقت
ور یہ سمجھ لیا گیا کہ اہلِ طریقت پر شریعت کی پابندی لازم نہیں۔ اس طرح بعض صوفی ارکانِ شریعت کا مذاق اڑانے لگے اور ان
یں ایسے رجحانات کو تقویت دی جس سے شریعت کی تضحیک ہوتی تھی۔ اس کی انتہائی شکل فرقۂ ملامتیہ میں نظر آتی ہے جو اپنے
یں انتہے مکروہ بننے کی کوشش کرتے تھے کہ لوگ ان سے متنفر ہوں اور اس طرح انہیں ترکِ دنیا میں آسانی ہو۔ یہ سلسلہ
روع ہو کر ہندوستان تک پہنچا۔ اہلِ طریقت نے جو استعارے اختیار کئے ان سے خود شریعت کی تضحیک ہوتی ہے شراب
رام ہے مگر شاعر کہتا ہے ؂

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید

ل سے بڑی مشکل یہ ہوئی کہ ہر شخص پیرِ مغاں بن بیٹھا اور خود اہلِ طریقت کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کون رہبر اور کون
۔ شریعت کی جگہ کشف و کرامات سے کام لیا گیا اور قرآن کی بجائے ملفوظات سے جس نے آگے چل کر پیری مریدی اور قبر پرستی
ت اختیار کیا اس لئے شریعت کو بھی جس طرح آج ہم سمجھتے ہیں اس کے اصلی روپ میں دیکھنا مشکل ہے اقبال نے اپنی تقریروں کے
اسلامی افکار کی تشکیلِ نو کی جو ضرورت محسوس کی ہے وہ اسی لئے ہے۔

علم کلام مسلمانوں میں ضرورتاً پیدا ہوا۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے اسلامی عقاید اور افکار پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اعتراضات وہ معتزلہ تھے۔ خلفائے عباسیہ کے دور میں جب دارالحکومت بغداد منتقل ہوا تو یونانی فلسفے کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا اور یو منکرین کے خیالات اور ان کے نظریات مسلمانوں میں پھیل گئے ان سے خود مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جو اسلام کے ہر اصول او کو منطق اور فلسفے کی میزان میں تولتا تھا۔ جبر و قدر کے مسئلے پر بحث شروع ہوئی۔ انسان اور کائنات کی حقیقت، خالق اور مخلوق کے عذاب اور ثواب کی نوعیت سب پر عقلی دلائل لائے جانے لگے۔ ان اعتراضات کا جواب دینے کے لئے صرف ایمان بالغیب کا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں میں منکرین کا ایک گروہ پیدا ہوا جس نے فلسفے سے فلسفہ کا رد کیا۔ یہی جماعت متکلمین کی ہے جس کے ممتاز علمبر حجتہ الاسلام امام غزالی ہیں لیکن امام غزالی بھی آخری عمر میں اپنی اس کوشش میں ناکامی کا اعتراف کر کے صوفی ہو جاتے ہیں۔ غر کہ تمدن، تصوف، شریعت اور کلام سب کے سب بتانِ عجم کے پجاری بن جاتے ہیں۔ اسی لئے اقبال کے نزدیک اسلام کی حقیقۃ فروعی بحثوں میں گم ہو چکی ہے اور امتِ اسلامیہ قرآن اور حدیث کو چھوڑ کر محض روایات میں کھو گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ خطیب کے وعظ سے دل گرما جایا کرتے تھے۔ اپنے بیان کو دیبوں، منطق اور لغت کے بکھیڑوں میں الجھا دیتا ہے۔ وہ خود کسی کیفیت کا نہیں اسی لئے اس کا کلام دلآویز ہونے کے بجائے بے اثر ہے۔

اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کا اصلی سبب لذتِ شوق سے بے نصیبی ہے اسی لذتِ شوق کا نام عشق ہے جس سے ہونے کے بعد مسلمان راکھ کا ڈھیر رہ گیا ہے۔

تیسرے بند میں اقبال ساقی سے پھر خطاب کرتے ہیں اور یہاں بھی ذوقِ پرواز اور سوز و ساز مانگتے ہیں ؎

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا ٭ مری خاک جگنو بنا کر اڑا

یہاں جگنو کی علامت خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ سوز پروانے میں بھی ہوتا ہے لیکن وہ شمع کی روشنی پر نثار ہوتا رہتا ہے ا چمک دمک کا احساس نہیں رکھتا جو اس کی فطرت میں ہے۔ جگنو کرمکِ شب تاب ہے، اس میں چمک دمک ہے۔ لیکن مستعار نہیں، ہر کے ساتھ اس چمک دمک میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جگنو کو ایک جگہ قرار نہیں وہ چنگاریوں کی طرح اڑتا رہتا ہے۔ یہ پرواز ذوق ا کی بدولت ہے۔ اس بند میں ایک اور شعر عقل و خرد سے متعلق ہے ؎

خرد کو غلامی سے آزاد کر ٭ جوانوں کو پیروں کا استاد کر

عشق و عقل کی بحث اقبال کے افکار اور نظریات میں نہایت اہم موضوع ہے۔ عقل کی بنیاد علم پر ہے، جو ہمیشہ ناقص ہو اس لئے کہ اس میں روایت اور غلامی کی بو پائی جاتی ہے۔ حریتِ فکر اس سے زائل ہو جاتی ہے، اس سے نجات پانے کیلئے سہارا لینا پڑتا ہے۔ عشق سے جو عقل بیدار ہوتی ہے وہ غلامی سے آزاد ہوتی ہے، اقبال کے نزدیک آنے والا زمانہ شاید لا رہا ہے۔

اس بند میں زورِ بیان اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور اقبال کے دل کا سوز و ساز ان کی امنگیں اور آرزوئیں، بے خوابیاں او زبان پر آجاتی ہیں اور وہ اپنی قوم کو زندگی کا سبق دیتے ہیں اس کے بعد کا بند بھی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ زندگی ایک طوفا طرح آگے بڑھ رہی ہے اور ہر شئے میں جلوہ گر ہے۔ زندگی ترکیبِ آب و گل نہیں محنتِ آب و گل ہے۔ یہ ایک وحدت ہے کے مختلف مناظر و مظاہر اسی وحدت کی کثرت ہیں۔ یہ دنیا اسی زندگی نے تخلیق کی ہے۔ اقبال کے نزدیک زندگی کے اس تسلسل کے مسئلہ تناسخ سے نہیں سمجھا جا سکتا۔

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں ٭ کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

مطلب اس کا یہ ہے کہ انفرادی زندگی کا ارتقا انفرادی زندگی ہی کا ارتقار ہے اور بحیثیت مجموعی انفرادی زندگی کا ارتقا اجتماعی اور بالآخر کائناتی زندگی کا ارتقا ہے۔ یہ زندگی طاقت سے ظاہر ہوتی ہے، وہ طاقت جسے شاعرانہ انداز میں اقبال یوں پیش کرتے ہیں ؎

کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور ٭ کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور

پانچویں بند میں زندگی کو فقط ذوقِ پرواز قرار دیا ہے۔ سفر، زندگی کے لئے برگ و ساز اور حقیقت ہے۔ حضر یعنی قیام محض مجا اور دھوکا ہے۔ زندگی کا سلسلہ لامتناہی ہے ؎

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے ٭ اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات ٭ ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

زندگی کی اصل کیا ہے؟ یہی اہم ترین مسئلہ ہے۔ اقبال کے نزدیک زندگی کی اس اصل کا نام خودی ہے۔ خودی ایک نور اور قوت ہے۔ اس نور اور قوت کا ظاہر ہونا زندگی کا دوسرا نام ہے، اسی لئے خودی قید زماں اور قید مکاں سے آزاد اور متحرک ہے سفر اس کا آغاز اور انجام ہے۔ کائنات اسی کی بیداری کا نام ہے اور اسی نے ارتقائی منزلیں طے کرکے بالآخر آدم کے پیکر خاکی میں ظہور کیا ہے۔ اسی لئے انسان خودی کا مظہر ہے اور انسان کامل وہ ہے جس کی خودی کامل ہو یعنی جس میں نور اور طاقت ترقی کی انتہائی منزل تک پہنچ جائیں۔ یہ انتہائی منزل کیا ہے؟ اس کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ محض یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ زندگی اور یہ عالم خودی کی منزلِ اولیں ہے ؎

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں! ٭ مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود ٭ کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا ٭ تری شوخیِ فکر و کردار کا!

اس طویل نظم میں جتنے مختلف مسائل بیان ہوتے ہیں ان سب پر الگ الگ نظمیں بھی لکھی جا سکتی تھیں۔ اس لئے اس نظم کے پڑھنے والے کو اختصار کا احساس ہوتا ہے، لیکن روانی نے اختصار کی شدت کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ اقبال کی فلسفیانہ نظموں میں بالعموم جوش و خروش کم اور حکیمانہ سنجیدگی زیادہ ہوتی ہے۔ جہاں اقبال شاعر، اقبال فلسفی بن جاتا ہے، لیکن اس نظم میں اقبال شاعر ہی فلسفہ پر غالب رہتا ہے شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ نظم کا بڑا حصہ زندگی کی ترجمانی پر صرف ہوا ہے اور اقبال کے نزدیک زندگی دریا کی روانی اور طوفان کا نام ہے ؎

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود ٭ کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
بڑی تیز جولاں بڑی زود رس ٭ ازل سے ابد تک رمِ یک نفس

پروفیسر شور نعمانی

سرسیّد — اُردو نثر کے مُربّی

سرسید برصغیر کی عظیم شخصیت تھے ۔ ان کے عمل کا میدان بہت وسیع تھا ۔ چنانچہ ان کی زندگی بہت سے شعبوں میں تقسیم ہے ۔ میں اس مختصر سے مضمون میں ان کی ادبی کاوشوں کا مختصر سا جائزہ پیش کر رہا ہوں ۔

ایک اعلیٰ اور مخلص ادیب وہی ہے جو اپنے عہد کا سچا ترجمان ہو اور زندگی کے نشیب و فراز میں اس کی تخلیقی قوتوں کو دخل حاصل ہو ۔ سرسید میں یہ خصوصیت موجود تھی ۔ وہ ٹھیک اسی وقت پیدا ہوئے جب ہندوستانی معاشرہ کو انہی جیسے انسان کی سخت ضرورت تھی ان کا عہد ہندوستان کی سیاسی اور مجلسی زندگی کا بدترین عہد تھا ۔ جبکہ ایک غیر قوم اس ملک پر پوری طرح مسلط ہو چکی تھی ۔ ایک نئی تہذیب کا آفتاب رفتہ رفتہ طلوع ہو رہا تھا اور برصغیر کے تمدن کا چراغ بھڑک بھڑک کر خاموش ہو جانے والا تھا ۔

غدر کے بعد اصلاحات کا دور شروع ہوا تو جدید مغربی علوم کی تعلیم کی سہولتیں بھی مہیا کی جانے لگیں اور ہندوؤں نے ان سہولتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا شروع کر دیا لیکن مسلمان ہر مغربی چیز کو تعصب کی عینک سے دیکھ رہے تھے اور تعلیم و ترقی کی دوڑ میں ہندوؤں سے بہت پیچھے رہے جا رہے تھے ۔ سرسید نے اس صورت حال کو بھانپ لیا اور انہیں صاف طور پر نظر آنے لگا کہ کچھ عرصہ بعد متحدہ ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کے علاوہ ہندوؤں کے بھی غلام ہو جائیں گے چنانچہ وہ مجاہدانہ اٹھے اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر کے ہی دم لیا ۔

ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے معاشرہ میں جن خرابیوں نے جڑ پکڑ لی ہے ان کا سدباب کیا جا سکے ۔ جدید مغربی علوم کے حصول کی طرف مسلمانوں کی توجہ عام کر دی جائے اور سوسائٹی میں اچھی عادات اور میل محبت کو فروغ دیا جا سکے ۔ ان تمام مقاصد کا ان کی تحریروں پر گہرا اثر ہے ۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام نگارشات اصلاحی موضوعات کا احاطہ کئے ہوتے ہیں ۔ مثال کے طور پر "مضامین سرسید" ہی کی فہرست کو دیکھ لیجئے ۔ کہیں رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات بتا رہے ہیں کہیں ریا، خوشامد، تعصب کا پردہ فاش کر رہے ہیں اور کہیں تجارت، علم، اخلاق اور عورتوں کے حقوق کی طرف توجہ دلا رہے ہیں ۔ پھر اس کتاب کے زیادہ تر مضامین کے آخری پیراگراف اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ وہ پہلے کسی مقصد کا تعین کرتے اور بعد میں قلم اٹھاتے ۔

اردو نثر نگاروں میں سرسید کا مقام بہت بلند ہے ۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ نثر نگاری کے اس سکول کے بانی ہیں ۔ جس نے موجودہ تہذیب یافتہ زمانے کی سب سے زیادہ پسندیدہ اور مفید طرز یعنی سادہ نگاری کو فروغ دیا ۔ آج سادہ اور سلیس عبارت ہر ملک میں مقبول ہے اور اس میں بہترین ادب تخلیق کیا جا رہا ہے ۔ سرسید سے پہلے سادہ اور سلیس عبارت میں یا تو میر امن کی کتاب باغ و بہار ملتی ہے یا مرزا غالب کے خطوط ۔ باقی سب پر ظہوری کی سہ نثر کا رنگ غالب ہے ۔ سرسید نے اس قدیم انداز کو کاری ضرب لگائی اور یہ ثابت کر دیا کہ سادگی میں رنگینی سے زیادہ خوبی ہوتی ہے اور مشکل سے مشکل اور پیچیدہ مسائل کو نہایت آسان اور بے تکلف زبان میں ادا کیا جا سکتا ہے ۔ انہوں نے بتا دیا کہ خیالات کو قلم کا تابع کس طرح بنایا جا سکتا ہے اور تحریر سے ملک و ملت کی اصلاح کا کام کیونکر لیا

سکتا ہے ۔ ان کی زندگی ہی میں ان کی طرز کو اپنانے والے پیدا ہو گئے تھے ۔ محسن الملک ، وقار الملک ، مولوی چراغ علی اور مولانا حالی کی عبارت پر تو ان کا رنگ عبارت بہت زیادہ اثر انداز ہے ۔ محمد حسین آزاد ، ڈپٹی نذیر احمد اور شبلی نعمانی کا اگرچہ اپنا اپنا خاص انداز ہے ۔ لیکن ان سب کے یہاں سرسید کی سادگی اور بے تکلفی مشترک ہے ۔ یہ تمام ادیب سرسید اور ان کے مشن دونوں سے متاثر تھے ۔ چنانچہ ادیبوں کے اس گروہ کو "سرسید سکول" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ عہد حاضر کے ادیب بھی اس سکول کے راستہ پر چل رہے ہیں ۔ شیخ اکرام نے لکھا تھا "نئی نسل سرسید سے زیادہ شبلی سے متاثر ہے ۔" شاید فاضل نقاد اس حقیقت کو بھول رہے تھے کہ شبلی خود بڑی حد تک سرسید سے متاثر ہیں ۔

سرسید پر عمومی طور پر یہ اعتراضات کئے جاتے ہیں کہ ان کا انداز تحریر روکھا ، پھیکا اور بے مزہ ہے ۔ ان کے جملے طولانی ہوتے ہیں ان کے یہاں کسی مضمون بیان کا بار بار اعادہ ملتا ہے اور ان کی عبارت میں ادبی شان نہیں ہے ۔ یہ اعتراضات اپنی جگہ وزنی ہیں لیکن ان سے سرسید کی ادبی ساکھ کو نقصان نہیں پہنچتا ۔ معترضین کو اس بات کا علم ہونا چاہئیے کہ سرسید ادیب سے زیادہ لیڈر تھے ۔ ان کا پہلا مقصد قوم کی خدمت تھا اور اس خدمت کو انہوں نے قلم سے انجام دیا ۔ چنانچہ اردو کی خدمت کو ان کے یہاں ثانوی درجہ حاصل ہے یا یوں کہئے کہ قومی خدمت کے ذیل میں ضمنی طور پر اردو کی خدمت بھی ہو گئی ۔ شاید سرسید کو اپنی ان خامیوں کا خود بھی احساس ہوگا ۔ لیکن جب وہ ان خامیوں ہی کی مدد سے اپنے مقصد کی باری دیکھتے ہوں گے تو ان خامیوں کی پرواہ نہیں کرتے ہونگے ۔ دراصل وہ ایک مصلح قوم تھے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب لانا چاہتے تھے ۔ ان کا کام بہت مشکل تھا ۔ معاشرہ کی کتنی ہی خرابیوں کی اصلاح کرنا آسان نہیں کیونکہ معاشرہ کی اصلاح عوام ہی کی اصلاح سے ہو سکتی ہے اور یہ کام ان کے لئے یقینی طور پر یوں مشکل تھا کہ ان کے عہد کے عوام کے ذہنوں پر جہالت کی تاریکیاں مسلط تھیں ۔ سرسید اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ وہ جن سے مخاطب ہیں وہ ان پڑھ یا معمولی تعلیم یافتہ افراد ہیں چنانچہ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار نہایت آسان صاف اور سادہ عبارت میں کیا اسی طرح وہ چاہتے تھے کہ وہ اپنے مخاطب عوام کو اپنے دل کی بات اچھی طرح سمجھا دیں ۔ چنانچہ کسی مسئلہ کو مختلف پیرایوں سے حل کرنا اور کسی نکتے کی وضاحت کے لئے اس پر ہر ہر پہلو سے روشنی ڈالنا ان کی عادت میں داخل ہو گیا تھا ۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ جاہل سے جاہل آدمی بھی ان کی بات کو اچھی طرح سمجھ جائے ۔ اگر ایسے نہیں تو شاید ویسے سمجھ جاتے ۔ اگر ابھی تک نہیں سمجھا تو شاید اب سمجھ جائے اور اسی طرح کسی بات کی الٹ پھیر جاری رہتی ۔ پس ظاہر ہے کہ اس فنی خامی پہ ان کی "مقصدیت حاوی رہی اسی مقصدیت نے ان کے جملوں میں غیر معمولی طوالت پیدا کر دی ہے ۔ وہ اپنے قارئین کو طرح طرح کی دلیلوں سے جلد از جلد قائل کرکے اپنا ہم خیال بنا لینا چاہتے ہیں ۔ چنانچہ یہ جلد بازی ان کی تحریر کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوتی اور ان کے جملے بے جا طول پکڑ جاتے ہیں ۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایک مکمل پیراگراف دو ایک جملوں پر مشتمل ہوتا ہے اور اصل مطلب بھی خبط ہو کر رہ جاتا ہے غرض ان کے اصلاحی جذبہ نے ان کی تحریر میں ادبی شان کو ابھرنے نہ دیا ۔ ویسے ان میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ اپنی عبارت کو ادب کے بہترین زیورات سے آراستہ کر سکیں ۔ مثال کے طور پر میں ان کے دو مضامین "امید کی خوشی" اور "گزرا ہوا زمانہ" کا حوالہ دیتا ہوں ۔ دونوں مضامین میں دلکش تشبیہات ۔ فارسی کی خوبصورت تراکیب ، خوش آہنگ الفاظ کا حسین امتزاج اور نہایت خوبصورت خیالات ملتے ہیں ۔ مختصر یہ کہ دونوں مضامین فن انشائیہ نگاری کا بہترین نمونہ ہیں ۔

"امید کی خوشی" کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے ۔

"اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک ، اے آسمان کے تارو ، تمہاری خوش نما چمک ، اے بلند

پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی چوٹیو، اے پہاڑ کے عالی شان درختو، اے اونچے اونچے ٹیلوں کے دلکش بیل بوٹو، تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے کیوں زیادہ خوش نما معلوم ہوتے ہو؟ اس لئے کہ ہم سے بہت دور ہو۔ اس دوری ہی نے تم کو یہ خوبصورتی بخشی ہے۔ اس دوری ہی سے تمہارا نیلا رنگ ہماری آنکھوں کو بھایا ہے۔ تو ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دور ہے وہی ہم کو زیادہ خوش کرنے والی ہے"۔

ایک اور پیراگراف ملاحظہ ہو۔

"اے، نورانی چہرے والی یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی امید۔ یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے۔ تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تیری ہی بدولت نہایت دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے زندگی کی مشکل مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے توشی، خوشی کے لئے نام آوری، نام آوری کے لئے بہادری، بہادری کے لئے فیاضی، فیاضی کے لئے محبت، محبت کے لئے نیکی، نیکی کے لئے۔ انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیرے ہی تابع اور تیری ہی فرمانبردار ہیں"۔

"گذرا ہوا زمانہ" کا ایک پیراگراف ملاحظہ ہو۔

"اتنے میں اس کو بھائی بہن دوست آشنا یاد آئے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو گئی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگاتے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت گزر گیا۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا ہم تمہارے ہی بھلے کے لئے نہ کہتے تھے۔ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے خاموش ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست آشنا سب غمگین ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں"۔

کیا عبارت کے یہ ٹکڑے اُردو کے بہترین شہ پاروں کے مقابلے میں رکھنے کے قابل نہیں ہیں؟ کیا ان کو پڑھ کر ہم سرسید کے زورِ قلم اور خوبصورت اندازِ تحریر کے قائل نہیں ہو جاتے؟

سرسیّد نے اردو میں خود بھی بہت کچھ لکھا اور دوسروں سے بھی بہت کچھ لکھوایا۔ ان کے مذہبی، تاریخی سیاسی، معاشرتی اور اخباری مضامین کا شمار مشکل ہے۔ ان کی سب سے مشہور کتاب "آثار الصنادید" ہے جس میں دھلی کے کامین اور مشہور مقامات وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی اور فرانسیسی میں بھی ہو چکا ہے۔

۱۸۵۸ء میں انہوں نے اپنی دوسری مشہور کتاب "اسباب بغاوت ہند" لکھی۔ اس زمانہ میں انگریز اور انگریزی حکومت کے خلاف بے جا ایک کلمہ بھی منہ سے نکالنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا تھا لیکن سرسید بھی بڑے دل گردے والے تھے۔ بغاوت ہند کے صحیح اسباب صاف صاف لکھے۔ حاکم و محکوم دونوں میں سے کسی کی بھی رو رعایت نہیں کی۔ سچ سچ لکھا اور کتاب شائع کر دی۔ اس کتاب کو سیاسی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ غدر کے بعد جو اصلاحی دور شروع ہوا، اس میں اس کتاب کا بڑا حصّہ ہے۔ "وفادار مسلمانانِ ہند" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

سرسید نے ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کے ممبروں نے اردو میں بے شمار مضامین سائنسی موضوعات پر لکھے۔

۱۸۶۶ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نکالا جس میں انگریزی اخباروں کے مفید مضامین کے تراجم بھی شائع کرتے تھے۔
۱۸۷۰ء میں انہوں نے اپنا مشہور عالم اخبار "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ جس نے اسلامی معاشرے کی کایا پلٹ دی۔
یدکو تاریخ سے بھی اچھا خاصہ لگاؤ تھا۔ تاریخ بجنور لکھنے کے علاوہ انہوں نے آئین اکبری اور برنی کی تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح
ا ہے۔ ان کی مذہبی تصانیف میں قرآن شریف اور بائیبل کی تفسیر کو اہمیت حاصل ہے۔ قرآن پاک کی تفسیر نصف قرآن تک
کی۔ بائیبل کی تفسیر انگریزوں میں بہت مقبول ہوئی، لیکن پرانے خیال کے مسلمانوں نے اس کام کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ
مقلوب، ترجمہ معیار العقول، فوائد الافکار احکام طعام یا اہل کتاب بھی ان کی مذہبی تصانیف ہیں۔ غرض ان کے موضوعات میں
ع اور ان کے قلم میں جان تھی۔ انہوں نے اردو نثر کو آب حیات دیا۔ ہم اور ہماری قومی زبان ان کے احسان سے کبھی سبکدوش
ا ہو سکتے۔

پروانہ اور جگنو!

اقبالؒ

پروانہ

پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو
کیوں آتش بے سوز پہ مغرور ہے جگنو

جگنو

اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں
دریوزہ گر آتشِ بیگانہ نہیں میں

پروفیسر شمیم حیدر لیدتی

حسرت موہانی ۔ ایک تعارف

"مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی !!"

مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں ۔ ہماری داستان حریت کے ہر عنوان میں ان کا نام اور کے ہر باب میں ان کے کارنامے سنہری حروفوں سے لکھے ہوتے ہیں ۔ ان کی نگاہ دور رس تھی ۔ انہوں نے آج سے پچاس سال پہلے آزا کامل کا نعرہ لگایا۔

لیکن افسوس مولانا حسرت موہانی ان چند مایۂ ناز ہستیوں میں سے ایک ہیں جنہیں تقسیم ہند کے بعد بالکل بھلا دیا گیا ہے ۔ حسر صحیح معنوں میں اقبال کے 'مرد مومن' تھے ۔ ان کی ہمہ گیر شخصیت کا تصور کرتے ہی ان کی درویشانہ طرز زندگی ، سادگی ، بہادری ا حق گوئی کے اوصاف ذہن میں آجاتے ہیں ۔ وہ سچے محب الوطن تھے ۔ وہ ایک مرد مجاہد ، ایک دیانتدار لیڈر ، ایک بلند پ شاعر اور ایک اچھے مدبر تھے ۔

مولانا حسرت موہانی ۱۸۷۵ء میں قصبہ موہان ضلع اُناؤ (اودھ) میں پیدا ہوئے اور وہیں مڈل اسکول کا امتحان بڑے اع کے ساتھ پاس کیا ۔ اس کے بعد انٹرنس بھی طرہ امتیاز کے ساتھ پاس کیا ۔ بعد ازاں وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے گئے ۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی ۔ اس کے بعد آپ وہیں پر مستقل رہنے لگے ۔ ۱۹۰۴ء میں علی گڑھ سے ہی انہوں نے اپنا مشہور ادبی ، سیاسی جریدہ "اردوئے معلیٰ" جاری کیا ۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ملک کی آزادی م حصہ لینا شروع کیا ۔ پہلے آپ نے کانگریس پارٹی میں حصہ لیا اور آپ اس کے باقاعدہ ممبر رہے لیکن سورت سیشن کے بعا گاندھی جی کی مدغل پالیسی سے تنگ آکر آپ نے کانگریس پارٹی سے ہمیشہ کے لئے استعفیٰ دے دیا ۔

"اردوئے معلیٰ" ایک سیاسی اور ادبی پرچہ تھا ۔ ۱۹۰۸ء میں اس پرچہ میں "مصر میں انگریزوں کی پالیسی" کے عنوان سے کالج کے ایک طالب علم کا مضمون شائع ہوا ۔ جسے حکومت نے باغیانہ قرار دے کر مولانا پر زور دیا کہ وہ مصنف کا نام بتا دیں مگر مولانا نے صاف انکار کر دیا اس پر ان کو ڈیڑھ سال کی قید بامشقت کی سزا دی گئی ۔

جیل میں ان کو قید تنہائی میں رکھا گیا ۔ ان پر بہت مظالم ڈھائے گئے ۔ لیکن اس مرد قلندر نے اف تک نہ کی اور پھر بھی اپنے اصولوں پر گامزن رہے ۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی نے جرمنی کی حمایت کی تھی ۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت بھی جرمنی کے ساتھ تھی ۔ اس پر ان کو پھر دوبارہ گرفتار کیا گیا یہ حسرت ہی کی ذات تھی ۔ جس نے سب سے پہلے ہندوستان کے لئے مکمل آزاد کا مطالبہ کیا ۔

گاندھی جی سے اختلاف کے بعد حسرت نے ہمیشہ کے لئے کانگریس چھوڑ دی اور آپ مستقل طور پر مسلم لیگ پارٹی میں شامل ہوگئے اور آخیر دم تک اسی پارٹی سے منسلک رہے ۔ قیام پاکستان کے بعد مولانا حسرت نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ۔

Government College Peshawar Athletics and Relay Races Team.

Champion in Secondary Board Relay Races Tournament (1962-63).



Sitting (L to R) — Javaid Mohammad, M. Khalid, Prof. S. Jaffar Hayat (Incharge), Mahabat Khan (Captain), Prof. Mohammad Ismail Sethi (Principal), Mr. Muhammad Nazar, D. P. E., M. Asghar.

Standing (L to R) — A. Rashid, Z. Riaz, M. Nawaz, Daud Khan, Amanullah, Jamalud Din, Sajjad, Mushtaq, Atta Mohd.

بلکہ وہ مسلمانوں کو تنہا ہندوستان میں نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے وعدے پر پورے اترے اور آخر دم تک ہندوستان کے ہی رہے۔

مولانا تقسیم ہند کے بعد پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے اور ہندوستانی پارلیمنٹ میں آپ نے ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت میں بہت ہی معرکتہ الآرا تقاریر بھی کیں۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے سچے خیر خواہ اور پکے مسلمان تھے۔ ہمیشہ تھرڈ کلاس میں سفر کرتے اور ہمیشہ بہت معمولی کھدر پہنا کرتے تھے۔

سادگی طبع ملاحظہ ہو۔ اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ آپ نے پانچ دفعہ حج کیا۔ آخری مرتبہ جب حج سے ۱۹۴۹ء میں واپس لکھنؤ جا رہے تھے تو آپ نے فیصلہ کیا کہ چند دن پاکستان میں بھی قیام کریں۔ لاہور میں آپ کے استقبال کی تیاریاں بڑے زور و شور سے ہونے لگیں۔ تقسیم کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا اور لوگوں میں اس مرد مجاہد کے لئے اور ان کی بے مثال قربانیوں کے لئے بہت جذبۂ عقیدت تھا اس لئے اعلیٰ پیمانہ پر آپ کے استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں۔ آپ کے ٹھہرانے کا بندوبست شاہی مہمان خانہ یا گورنر ہاؤس میں کیا گیا۔ استقبال کے لئے، معزز شہریوں کی کمیٹی بنائی گئی۔ ایک جلوس کا بھی انتظام کیا گیا۔ لیکن جب مولانا کراچی سے لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچے تو آپ نے گورنر ہاؤس جانے سے انکار کر دیا، اور جلوس کے بعد سیدھے بادشاہی مسجد میں گئے۔ جہاں پر انہوں نے دو دن قیام کیا۔ مولانا کی یہ عادت تھی کہ جب بھی وہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کے لئے دہلی جاتے مسجد میں قیام کرتے۔

بہتر ہو کہ ایک دو باتیں آپ کی شاعری کے بارے میں بھی کہتا چلوں۔ مولانا نے گیارہ دیوان مرتب کئے ہیں اور بیشتر حصہ انہوں نے جیل میں لکھا ہے۔ جیل کی تکالیف کے باوجود مولانا شعر کہتے۔ قیدِ تنہائی کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

رمضان کا مہینہ بھی آپ نے جیل میں گزارا۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضان بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

حسرت کا سب سے بڑا احسان اردو غزل پر ہے۔ میر، درد، غالب اور داغ کے بعد غزل بالکل بے جان چیز رہ گئی تھی۔ انہوں نے غزل کی بگڑی ہوئی اداؤں کو ایسا سنوارا اور ایسے نک سک سے ایسا درست کیا کہ بجا طور پر ادب میں رئیس المتغزلین مشہور ہوئے۔ حسرت نے غزل میں نئے تجربے کئے ہیں۔ انہوں نے اس میں تسلسل، ہمواری اور ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ خود ہی کہتے ہیں ؎

تو نے حسرت یہ نکالا ہے عجب ڈھنگِ غزل
اب بھی کیا ہم تری یکتائی کا دعویٰ نہ کریں

ان کا عشق خالص انسانی عشق ہے۔ وہ میر اور مومن کی طرح مجازی منزل سے آگے نہیں بڑھتے۔ ان کے خیالات میں رفعت اور ایک ایسا خلوص ہے جو باتیں بہت اونچا کر دیتا ہے۔ انہیں بندشوں کی چستی، لفظوں کی نشست، تشبیہوں اور استعاروں کی جدت پر کمال حاصل ہے۔ عشق و محبت کے لطیف جذبات کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں کہ جواب نہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

[illegible] + ہم نے [illegible] دل میں [illegible]
[illegible]

زندگی ہے اسی کا نام تو ہم ٭ ایسی درماندگی سے در گذرے
ان سے اظہارِ شوق کون کرے ٭ جان ہی سے کوئی مگر گذرے

ایک اور غزل کے چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

لطف کی ان سے التجا نہ کریں ٭ ہم نے ایسا کبھی کیا، نہ کریں
مل رہے گا جو ان سے ملنا ہے ٭ لب کو شرمندۂ دُعا نہ کریں
مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو ٭ لوگ میرے لئے دعا نہ کریں

حسرتؔ کے یہاں آپ کو لذتیت نام کو نہیں ملے گی۔ انہوں نے غزل کو ایک شریفانہ پیرایہ عطا کرنے کے علاوہ اس کو ایک سچی عاشقانہ زندگی کی تصویر بنا دیا ہے، اور میں تو یہ کہوں گا کہ مولانا حسرتؔ نے غزل کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔

اس چھوٹے سے مضمون میں حسرتؔ کی شاعری کے متعلق تفصیل سے لکھنا ناممکن ہے۔ بس اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ مولانا مردِ درویش اور مردِ قلندر تھے۔ ان میں بہت سی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ بیک وقت ایک اچھے سیاستدان، مدبر، صحافی محبِ وطن، مردِ مومن اور ایک بلند پایہ شاعر تھے۔

گاہے گاہے باز خواں

جز تے پاتے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا!

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار!
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

(غالبؔ)

محفوظ الرؤف بی اے ۔ سال دوم

فلسفۂ خودی

اقبال کی شاعری اور اس کے مقصد کو سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر کا جاننا بہت ضروری ہے ۔ گذشتہ صدی میں مشرق کے افق ں کے بادل چھاتے ہوتے تھے ۔ بخصوصیت سے مسلمانوں کی حالت بہت بد تر تھی ۔ جہالت اور غلامی نے ان کی زندگی کے ہنگاموں کو ر کر دیا تھا ۔ مغرب کے طوفان سے وہ خائف تھے ۔ سرسید نے ان کو ابھارنے کی کوشش کی اور بتایا کہ مسلمان کو بے تکلف مغربی تمدن ر کر لینا چاہیئے ۔ شعر میں حالیؔ نے سوز اور درد کے ساتھ مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان سنا کر گذشتہ عظمت و اقبال کی یاد تازہ ی اور موجودہ پستی و نکبت پر ضرب لگائی ۔ حالیؔ جدت پسند تھے اور قدیم تہذیب کی خرابیوں پر سختی سے نکتہ چینی کرتے تھے ۔ اکبر یہی کام شاعری میں ظرافت سے لیا ، مگر وہ حالیؔ کے مقابلے میں قدامت پسند تھے ۔ نئی روشنی پر ہنسی اڑانے والے پرانی تہذیب راہنے والے اور قوم کو غیروں کی ذہنی غلامی کی ذلت سے آگاہ کرنے والے تھے ۔ ان دونوں بزرگوں نے بیمار قوم کا مرض تو یص کر دیا لیکن سبب نہ پہچان سکے ۔ اکبر نے کہا کہ مذہب سے منحرف ہو کر مسلمانوں کا یہی حال ہوا ہے ۔ حالی کے خیال اجتہاد فکر وسعت نظر کو چھوڑ کر جب مسلمان تقلید پرست اور تنگ خیال بنے تو ان کا یہ حال ہوا ۔ ایک دوسرے مورخ کے نزدیک قوم کا ل اور اس کی پستی کی وجہ دولت اور حکومت تھی ۔ عیش و عشرت نے حرکت کے برعکس جمود پیدا کر دیا تھا ۔ مگر اقبال نے ان میں سے ، ایک وجہ کو تسلیم نہ کیا ۔ مختلف تمدنوں کا وسیع مطالعہ کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مشرق اور خصوصاً مسلمانوں کا انحطاط ان مذ اور خیالات کی وجہ سے ہوا جو رہبانیت ، نفس کشی اور نفی خودی کی تعلیم دیتے تھے ۔

یونانی مفکرین ارتقاءِ فکر میں رفتہ رفتہ جسم سے نفس کی طرف اور ظاہر سے باطن کی طرف آتے گئے ۔ وہ محسوس کو نامحسوس کے بلے میں بے حقیقت سمجھنے لگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان عالم رنگ و بو سے بے تعلق ہو گیا اور ان میں فرار اور گریز پیدا ہوا ۔ افلاطون ار سطو دونوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عقل یا علم اصل چیز ہے اور عمل اس کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور دنیاوی زندگی بقت کا ایک سایہ ہے ۔ اقبال کو اس سبب سے بڑا اختلاف تھا ۔ وجود کی حقیقت اقبال کے نزدیک عقل نہیں عمل ہے ۔ وہ ۔ انائے مطلق ہے جو خلاق ہے اور یہ انا اپنی مسلسل خلاقی میں لاتعداد انا یا مقاصد پیدا کرتی ہے ۔ زندگی جذبہ آفرینش میں جو کچھ پیدا کرتی ہے ، عقل بعد میں اس کا جائزہ لے کر اس میں قواعد و ضوابط ڈھونڈتی ہے ۔ اقبال کے نزدیک زندگی میں عمل مقدم ور عقل یا علم موخر ہے ۔

مسلمانوں نے متصوفانہ فلسفے میں افلاطون کے ازلی اور غیر متغیر مقالات کو اپنی فکر کا جزو لاینفک بنا لیا جس کا نتیجہ اقبال کے نزدیک یہ ہوا کہ مسلمان ہنگامۂ موجود کا منکر ہو کر بود کو نابود اور نابود کو بود کہنے لگا ۔ یہ تصور غیر اسلامی ہے جس نے انفرادی نفس کو باطل قرار دے کر اخلاقی ذمہ داری کے احساس اور سعی و عمل کے ذوق کو مردہ کر دیا ۔ نفی ذات کے اس تصور کی انتہا وحدت الوجود کے عقیدے میں ہوتی ہے ۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ وجود حقیقی صرف خالق کائنات کی ذات ہے ۔ مخلوق کچھ بھی نہیں ۔ عالم غیب اور انسان سبھی داخل

ہیں۔ محض اعتباری اور موہوم وجود رکھتے ہیں۔ اور اسی ایک نور ایزدی کے پرتو ہیں۔ کائنات کا موہوم ہونا، نفسِ انسانی کا بے حقیقت ہونا، زندگی کا بے ثبات ہونا سعی و عمل کا لاحاصل سمجھنا یہ وہ خیالات ہیں جو تھکی ہوئی قوم کو لوریاں دے دے کر سلا دیتے ہیں۔ پھر جب اپنی غفلت سے وہ قوم دولت و حکومت اور قوت و اقتدار کھو بیٹھتی ہے تو یہ دلفریب نغمے جو پہلے صبر و سکون اور کیف و سرور کا سبب ہوتے تھے۔ اب قنوطیت و یاس اور ملال کا باعث بن جاتے ہیں اور قوم کو ایک بار گرانے کے بعد اٹھنے نہیں دیتے۔ مسلمانوں کے تنزل کا دراصل یہی سبب تھا۔

اقبال نفی ذات یا نفی خودی کے سلسلے میں نطشے سے متفق ہیں۔ انحطاط مغلوب اقوام کا عقیدہ ہے، اقبال اس عقیدہ کو اثبات خودی سے رد کرنا چاہتے تھے۔ خودی یا انانیت اردو میں کبر و غرور کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ مگر اقبال نے اسے فلسفیانہ رنگ دے کر اس عقیدے طور پر استعمال کیا ہے کہ فرد کا نفس یا اس کی انا ایک مخلوق فانی ہستی ہے۔ لیکن یہ ہستی اپنا علیحدہ وجود رکھتی ہے جو عمل سے پائیدار ہو جاتی ہے۔ خودی کا یہ تصور فلسفۂ حیات و کائنات کی بنیاد ہے۔

یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی جذبات و تخیلات مستفید ہوتے ہیں۔ یہ پر اسرار شے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے یہ "خودی" یا "انا" یا "میں" جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور حقیقت کی رو سے مضمر ہے جو تمام مشاہدات کی خالق ہے۔ مگر جس کی لطافت نگاہوں کے گرم مشاہدوں کی تاب نہیں لا سکتی۔ کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے؟ یا زندگی میں محض عارضی طور پر اپنے فوری عمل سے اغراضِ حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس دروغِ مصلحت آمیز میں نمایاں کیا ہے!

"اخلاقی اعتبار سے اخلاق یا اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے علما نے کسی نہ کسی صورت میں اسی سوال کا جواب دینے کے لئے دماغ سوزی نہ کی ہو۔

میں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو۔

یہ خیال اقبال نے نثر کے پیرائے میں دیباچۂ اسرار خودی میں نقل کیا ہے۔ تفصیلاً یہ خیال اس باکمال سخن ور کے فیض سے شعر کا جامہ پہن کر بہت زیادہ دلنشین، دلآویز روح پرور اور جان بخش بن جاتا ہے۔

کائنات کی اصل ایک وجود بسیط ہے۔ یعنی خدا جس کے اندر شہود اور ارادے کی قوتیں مضمر ہیں۔ ان قوتوں کو حرکت میں لانے کے لئے اس نے اپنے آپ کو خود اور غیر خود یا فلسفے کی اصطلاح میں موضوع اور معروض میں تقسیم کر دیا ہے۔ غیر خود کی علت غائی یہ ہے کہ وہ خودی کے مشاہدہ کے لئے آئینہ کا اور عمل کے ارتقاء کے لئے معمول کا کام دے خودی اپنی تکمیل اور استحکام کے لئے غیر خود سے ٹکراتی ہے اور اسی تصادم کے ذریعے سے اس کی اندرونی نشو و نما ہوتی ہے اور وہ بتدریج سلسلۂ ارتقا کرتے کرتی ہے اسی کی ہستی مسلسل حرکت عمل پیہم کشمکش اور کارزار ہے۔ جس نسبت سے کوئی شے اپنی خودی میں مستحکم اور غیر خود پر غالب ہے اسی نسبت سے اس کا مدارج حیات میں تعین ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ برابر جاری ہے اور اس سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی انسان ہے۔

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر ٭ ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن تیرے دل میں ہے ٭ فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

جس طرح انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز اپنی خود کا شعور ہے اسی طرح اس کی منزل مقصود یہ ہے کہ خود کو زیادہ مضبوط اور

ستحکم کرنا جاتے وہ اپنے طبعی ماحول سے مسلسل متابلہ کرتا ہے۔ جوں جوں وہ سختیوں سے متصادم ہوتا ہے اور مظاہر فطرت پر قابو پاتا ہے۔ اس کے چھپے ہوتے جوہر نمایاں ہوتے رہتے ہیں، مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی منزل پر رُکے۔ ایک مقصد کو پالینے کے بعد قانع نہ بنے بلکہ ہمیشہ نئی نئی آرزوئیں پیدا کرے اور نئے نئے مقاصد متعین کرتا رہے اور انہیں حاصل کرنے کی سعی میں سرگرم رہے اقبال نے اس چیز کو کئی ناموں سے یاد کیا ہے۔ مثلاً تولید مقاصد، آفرینش مقاصد اور تخلیق مقاصد۔ اگر انسان اپنی ذہنی اور عملی قوتوں کو ہمیشہ سرگرم عمل رکھے تو یہ قوتیں زیادہ سے زیادہ طاقت پائی رہتی ہیں اور نتیجہ" اس کے سینے میں خودی کی آگ روز بروز زیادہ مشتعل ہوتی جاتی ہے ؎

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم ❊ از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اس بے قراری اور بے چینی اس سعی پیہم اور جہدِ مسلسل کا نام زندگی ہے۔ سکون خواہ وہ بہشت کا سکون ہو، روح انسانی کے لئے موت کا پیغام ہے۔

خودی کے منازل ترقی اس عالم زمان و مکان کی تسخیر پر ختم نہیں ہوتے ؎

خودی کی ہے یہ منزل اولیں ❊ مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود ❊ کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود

اس طرح انسان ساری کائنات کی تسخیر کے بعد ان بے نمود جہانوں کو فنا کرکے اپنی خودی کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں مرد کامل یا مرد مومن پیدا ہوتا ہے جس کی مثال حضرت رسول پاک کی ذاتِ گرامی قدر ہے۔

اس راہ کے طے کرنے کے لئے ایک راہ نما کی ضرورت ہے اور وہ راہ نما عشق ہے۔ عشق اس مرد کامل کی محبت کو کہتے ہیں جو معرفت نفس کے مدارج سے گزر کر خودی کی معراج پر پہنچ چکا ہو۔ لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ عاشق اپنے آپ کو معشوق کی ذات میں یا مقلد اپنے آپ کو مرشد کی ذات میں کھو دے۔ عشق سے اقبال کا مطلب یہ ہے کہ عاشق اس برتر شخصیت سے تکمیل بے خودی کا راز سیکھے اور خود اپنی قوتوں کو نشوونما دیکر اپنی شخصیت یا خودی کو استوار کرے۔

اسی طرح ایک لافانی نصب العین کی محبت فانی انسان کی خودی کو تکمیل دے کر اسے بھی لازوال بنا دیتی ہے۔

خودی کی ایک اور اہم شرط فقر و استغنا ہے۔ گدائی اور فقر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گدائی والے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور فقر والے مادی لذتوں اور دنیاوی نعمتوں سے بے نیاز ہو کر کائنات کی قوتوں کی تسخیر کرکے دنیا میں امن کا ڈنکا بجاتے اور مظلوموں کو ظالموں کے پنجۂ استبداد سے چھڑاتے ہیں۔ خودی عشق محبت اور فقر و استغنا سے مستحکم ہوتی ہے۔ مگر اس کے لئے جرأت ہمت اور شجاعت کی ضرورت ہے۔ جب مندرجہ بالا شرائط کے تحت خودی مستحکم ہو چکی ہو تو اس قوت کی تادیب و تربیت کی ضرورت ہے اس میں اول درجہ اطاعت کا ہے۔ اطاعت سے مراد اس قانونِ حیات کی پابندی ہے جو خالق نے مخلوق کے لئے بنایا ہے۔ دوسرا درجہ ضبط نفس ہے یعنی انسان اپنے نفس کی ان ادنیٰ قوتوں کو قابو میں لائے جن کی سرکشی کی کوئی حد نہیں، خصوصاً نفسانی محبت اور خوف کے جذبات جو سب سے زیادہ قوی ہیں۔ ان پر غلبہ پانا ضروری ہے۔ فرائڈ اور دیگر ماہرین نفسیات نے انسانی کردار پر خوف کے خطرناک نتائج پر روشنی ڈال کر اس سے بچنے کی اہمیت خوب واضح کر دی ہے۔ گداگری، غلامی چاہے یہ غلامی سیاسی ہو یا معاشی نسب پرستی یا نسل پرستی یا رنگ و خون کا امتیاز یہ وہ چیزیں ہیں جو انسانی خودی کو کمزور بنا دیتی ہیں اس لئے تربیت و استحکام کے باب میں ان سے بچنا بھی لازم ہے۔

عتیق الرحمٰن ۔ بی اے ۔ سال دوم

غالبؔ ۔ ایک فلسفی اور صوفی

غالبؔ کا اصلی نام مرزا اسداللہ خان غالبؔ تھا۔ مرزا نوشہ عرف تھا۔ آپ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۶ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ غالبؔ نے ایک فارسی غزل دس سال کی عمر میں اپنے استاد مولوی معظم کی خدمت میں اصلاح کے لئے بھیجی تھی۔ فلسفہ خیالات تصوف تک پہنچنے کا راستہ ہیں۔ غالبؔ مرحوم پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اردو غزل کو فلسفیانہ مسائل سے روشناس کرایا۔ آپ کے والدین بچپن ہی میں خدا کو پیارے ہو گئے تھے۔

اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ وہ راستے سے بھٹک گئے اور عرصہ تک لہو ولعب میں مشغول رہے لیکن بہت جلد انہوں نے اپنی روش تبدیل کر لی تھی۔ مگر دختِ رز سے ان کا تعلق مرتے وقت تک قائم رہا۔

آئیے اب ہم ان کے فلسفیانہ مسائل ان کی شاعری میں ڈھونڈیں۔ آل احمد سرور فرماتے ہیں کہ "غالبؔ فلسفی نہیں تھے بلکہ ماہر نفسیات تھے ان کے کچھ مستقل تاثرات تھے۔ گو ان تاثرات کو فلاسفی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ انہوں نے زندگی اور موت کے متعلق کوئی نظریہ پیش نہیں کیا غالبؔ نے اقبال کی طرح کوئی مستقل فلسفیانہ نظریہ اپنی شاعری کے ذریعے پیش نہیں کیا۔ تاہم فلسفہ کے بعض حقائق و نکات اپنے کلام میں نظم کئے ہیں۔ آپ کا دماغ فلسفیانہ تھا۔ غالبؔ نے زندگی کی ترجمانی ہی نہیں کی بلکہ زندگی پر تنقید بھی کی ہے اور اسی وجہ سے یہ رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

شیخ اکرام لکھتے ہیں "جب مرزا نے اپنے ذہن کو اپنی دلی کیفیات اور حیاتِ انسانی کی کشمکش بیان کرنے میں استعمال کیا تو ان کے کلام میں فلسفیانہ خیالات کثرت سے آ گئے۔ لیکن ان کا مقصد کسی خاص فلسفہ کی ترجمانی نہ تھا۔ محض دل پر گزری ہوئی کیفیات کا اظہار مقصود تھا۔" غالبؔ کائنات کی بے ثباتی اور مسلسل تخلیق کو کیسے انداز میں کس خوبی سے پیش کرتے ہیں ؎

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز ٭ پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اس شعر میں عالم کی بے ثباتی پوشیدہ ہے کہ ہر لحظہ نئی نئی چیزیں پیدا ہو رہی ہیں اور خداوند اقدس اپنی جلوہ گری میں مصروف ہے جو مختلف اشیاء کی صورت میں دنیا میں نظر آ رہی ہے اور پرانی چیزیں ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں۔ اب ایسا شعر ملاحظہ فرمائیے جس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ غالبؔ ماہر نفسیات تھے۔ وہ وہی کہتے تھے جو انسان محسوس کرتا ہے اور ہر شخص کو یہ باتیں پیش آ سکتی ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

علاوہ ازیں اسداللہ خان کو تصوف سے خاص مناسبت تھی۔ وہ اپنے آپ کو وجودی کہتے تھے اور اس مسئلے کو انہوں نے ہندوستان میں شاید بیدلؔ اور نظیری کے بعد سب سے زیادہ بیان کیا ہے۔

انسان ایک حقیری شے ہے مگر ایک دنیا ساتھ لئے پھرتا ہے چاہے وہ تنہا ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن مجید میں اس کے متعلق ارشاد ہے

يَا بُنَيَّ اِنَّكَ جِرمٌ صَغِيرٌ وَ فِيكَ عَالِمٌ كَبِيرٌ ۝

ترجمہ:۔ اے میرے بیٹے! بظاہر تو ایک جسم صغیر ہے مگر تیرے اندر ایک عالم کبیر پوشیدہ ہے۔

غالب نے بھی حضرت علیؓ سے یہ نکتہ سمجھا اور اپنے اشعار میں اس طرح فرمایا ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود ایک محشر خیال ٭ ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

چونکہ غالب وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اس لئے ان کا کلام اس قسم کے خیالات سے بھرا پڑا ہے جس میں خدا کی ہستی کو ایک مانا گیا ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے

حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

تصوف اور وحدت الوجود کے مسئلے کو بعض شعراء نے کسی خاص مقصد کے تحت اپنایا ہے۔ اس میں دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ :۔

۱۔ یہ مسئلہ کشت شاعری کے لئے زرخیز میدان ہے۔

۲۔ تصوف اور وحدت الوجود سرتاپا حیرت ہے۔ ہم اس عالم کی جس چیز پر بھی نظر کرتے ہیں۔ حیرت میں ڈوب جاتے ہیں، اور خداوند تعالےٰ کی صناعی کو دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اس مسئلہ کے زیر اثر بحر بیکراں فضائے غیر محدود۔ امواج دریا۔ گلہائے چمن اور سیارہ ہائے غیر متناہی پر شاعری کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے اور عام طور پر انہی قدرتی اشیاء میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب شاعری کے لئے کیا جاتا ہے۔

۳۔ تصوف سے شاعری میں دل کشی، سنجیدگی حسن اور بلندی پیدا ہو جاتی ہے۔ پروفیسر فراق گورکھپوری لکھتے ہیں کہ انسانی عظمت کا شعور، زمان نفس اور کائنات کا روحانی پہلو غزل میں تصوف ہی کے لگاؤ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر انصاف کی رو سے دیکھا اور پرکھا جائے تو یہ مسئلہ بہت مشکل ہے۔ اور صوفیائے کرام کا نظریہ بھی مختلف ہے۔ اگر شاعر اس مسئلہ کے مطالب اور نظریہ سے پوری طرح واقف نہ ہو تو وہ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ شبلی نعمانی جیسے عالم و فاضل نے بھی اس مسئلہ کو نادانستگی میں غلط واضح کیا۔ غالباً شبلی نے یہ شعر پڑھ کر مطلب نکالا ہے ؎

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست

اما نمی تواں کہ اشارت باد کنند

شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔ حالانکہ دوسرے مصرعے میں شاعر نے مطلب واضح کرنے کی کچھ کوشش کی ہے۔

"لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال وحدت وجود کی حد تک پہنچ گیا۔ یعنی یہ کہ درحقیقت خدا کے سوا کوئی اور چیز سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ یا یوں کہو کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے"

اَللّٰهُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

ترجمہ (اللہ ہی نور ہے زمینوں کا اور آسمانوں کا) نور کا معنی ہے جو چیز خود ظاہر ہو اور دوسری اشیاء کو ظاہر کرے۔ یعنی اللہ ہی اس کائنات کی حقیقت ہے۔

پھر ایک اور جگہ ارشاد ہے۔ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ

ترجمہ:۔ اللہ کی ذات کے سوا ہر شے ہلاک ہونے یعنی بالفعل معرض فنا میں ہے۔

حضرت امام غزالیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "ہالکٌ اسم فاعل ہے اور اسم فاعل میں زمانہ کی قید نہیں۔ اس لئے آیت شریفہ ترجمہ کرتے وقت ہم یہ نہ کہیں گے۔ ہر شئے زمانہ آئندہ میں فنا ہوگی۔ بلکہ اس وقت بھی فنا کا عمل جاری ہے۔ یعنی خدا کے سوا کوئی چیز حقیقی معنوں میں موجود نہیں ہے۔" مگر جناب غالب اپنے آپ کو مسائل فلسفیانہ اور تصوف کا بادشاہ سمجھتے ہوتے فخر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ہیں کہ بادہ خواری آڑے آگئی ورنہ غالب اپنے آپ کو ولی سمجھ بیٹھتے۔ غالب خود کہتے ہیں ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ تیرا بیان غالب ✧ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ وجودِ حق کلی طبعی نہیں ہے بلکہ جزئی حقیقی ہے۔ یعنی یہ کائنات جزئیاتِ کل میں شامل ہے۔ یہ وجہ ہے کہ منصور نے اپنے آپ کو خدا کہا کیونکہ اس نے اپنے آپ میں خدا کا جلوہ کارفرما دیکھ لیا تھا۔ اگر غور کیا جائے تو ہر شے میں خدا کا سایہ موجود ہے۔ اقبال اسی لئے کہہ گئے ہیں کہ

کیا شانِ احمدی کا چمن میں ظہور ہے ✧ ہر گل میں ہر شجر میں محمدؐ کا نور ہے

یہاں اقبال کا منشا خدا کی تعریف سے ہے گو کہ بظاہر وہ رسول اکرمؐ کی حمد میں شعر کہہ رہے ہیں۔ پس ثابت ہوتا ہے کہ ہر جزو ہے کُل کا، اور وہ کُل حقیقی خداوند تعالےٰ کی ذات ہے بعینہ قطرہ جزو ہے، دریا کا یعنی کل کا۔ اسی مسئلے کو اقبالؒ نے دوسری جگہ پیش کیا ہے، کہتے ہیں ؎

حقیقت اک ہے ہر شئے کی نوری ہو کہ خاکی ہو ✧ لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

غالب نے اس کو یوں کہا ہے ؎

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر ✧ یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

اس قسم کے کئی مسائل پر غالب مرحوم نے قلم اٹھایا ہے۔ ان کے شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وہاں تھے، جہاں کوئی اور نہ تھا

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود ✧ قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

"فرماتے ہیں کہ دُنیا والوں نے قبلہ نما کو قبلہ تصور کر لیا ہے اور دل میں خیال کرتے ہیں کہ ہم قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہے ہیں۔ مگر ہمارا تو نظریہ ہی دوسرا ہے۔ ہم تو اس قبلہ کو صرف قبلہ کی طرف رہنمائی سمجھتے ہیں اور نماز کو راہبر سمجھتے ہوتے اپنے مسجود کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ یعنی نماز صرف خداوند تعالےٰ کے نزدیک پہنچنے کے لئے رہنما ثابت ہوتی ہے۔ اصلی قبلہ تو معبودِ حقیقی ہے۔"

غالب اپنے فخر کے آگے دوسرے صوفیہ و علماء کو فراموش نہیں کرتے۔ وہ انگریزی دان طبقے کو یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ اس جہانِ فانی میں شکسپیر ملٹن کالرج براؤننگ اور ہیگل وغیرہ کے علاوہ اور بھی کئی شعراء ہیں۔ نوجوان ان لوگوں کے اندازِ بیان سے تو آگاہی حاصل کر لیتے ہیں مگر عربی سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے شیخ اکبر و دیگر مشہور صوفیائے کرام و شعراء کے اسلوب نگارش سے ناآشنا رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غلط فہمی اور ناسمجھی کے گہرے کھڈ میں جا گرتے ہیں۔" مگر اس کے ساتھ ساتھ غالب کا اپنے آپ پر فخر غالب رہتا ہے، فرماتے ہیں کہ ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

مگر تاریخ کے اوراق کو پلٹنے سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ اور دہلی کی معاشی زندگی نے لوگوں کے دماغوں پر بہت اثر ڈالا ہے۔ عورت اور اس کی جسمانی خوبیاں لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کی خصوصیت ہیں، برعکس اس کے دہلی کے دبستانِ شاعری میں تصوف

راس کے لوازمات پاتے جاتے ہیں۔ لکھنؤ کی یہ کیفیت شاہانِ اودھ کی عیاشی کی وجہ سے تھی۔ مگر دہلی شروع ہی سے تبلیغ کا مرکز رہا ہے۔ سلطان الہند خواجہ غریب نواز اجمیریؒ کے خلیفہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے سلطان التمش کے عہد حکومت میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا تھا۔

غالب کے صوفیانہ خیالات کی پرورش میں مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی کا بڑا حصہ ہے۔ جن سے غالب نے فارسی سیکھی تھی اور ان کی صحبت کا اثر بہت زیادہ قبول کیا۔

وہ بڑے فلسفی، منطقی اور وحدت الوجود کے عالم تھے اسی لئے غالب کے کلام میں بھی وحدت الوجود کا اثر غالب ہے۔

کرامت علی شاہ بی۔اے۔ سال اول

غزل

جب کھلیں پھول جب بہار آئے
کاش وہ جانِ انتظار آئے

ہم بھی اپنے لہو سے اے یارو!
کتنے اُجڑے چمن سنوار آتے!

اتنے سجدے کئے جبیں نہ رہی
بندگی بار تھی، اُتار آتے!

کوئی پرسانِ حالِ دل نہ ہوا!
یوں تو کتنے ہی غمگسار آتے!

اَب کرامت جئیں تو کس منہ سے
زندگی جب نہ سازگار آئے

نثار احمد شاکر۔ سال دوم فزکس

اموی دور کے عرب شعراء

کسی قوم کے ذہنی شعور قومی جذبات اور روایات کی عکاسی اگر کوئی چیز اچھی طرح سے کر سکتی ہے، تو وہ شعر ہے۔ اگر آپ اس قو
کے جذبات وحیات کو جاننا چاہیں تو اس قوم کے شعراء کے دیوان اٹھا لیجئے۔ آپ اس قوم کے بارے میں اتنا کچھ جان جائیں گے کہ پھر
آپ کو تاریخ کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اموی دور کا شعر بھی اپنے وقت کا عکاس تھا۔ اموی دور میں کچھ صحابہ کرامؓ زندہ تھے۔ آخری صحابی ۹۴ھ میں اس دنیا سے
رخصت ہوئے۔ بڑے تابعین کا دور کوئی ایک سو سال رہا۔ ان لوگوں کی وجہ سے عوامی زندگی بہت سلجھی ہوئی تھی۔ لیکن ہر معاشرے
کی طرح اس معاشرے میں بھی کچھ عیب تھے۔ اقتدار و اختیار، دولت و ثروت، حکومت و سلطنت نے یہ جھول کافی بڑھا دیئے تھے
ان جھولوں کی عکاسی تاریخ سے تو ہوتی ہے۔ مگر شعر سب سے بڑا عکاس ہے۔ اس کے بعد اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ اس دور
میں سوائے ایک شاعر اخطل کے باقی تمام شعراء مسلمان تھے۔ بعض بڑے صحابہ کی اولاد تھے۔ مثلاً عبد الرحمٰن جو حسان بن ثابت کے بیٹے
تھے۔ عمرو ابن ابی ربیعہ جو عبد اللہ صحابی کے بیٹے تھے۔ اس دور کا شعر یوں تو آزاد ہے، اور اس میں غزل تک موجود ہے۔ لیکن
اس دور کے شعر کی یہ خصوصیت قابلِ ملاحظہ ہے کہ شعراء کا ذہن اس ذہن سے بہت مختلف ہے، جو جاہلیت کے زمانے کا ذہن تھا
اور جسے رسول اکرم صلعم نے یکسر بدل ڈالا تھا۔ تعجب کا مقام ہے کہ اموی خلفاء نے قرآن و حدیث کے معلمین کی خاص عزت افزائی نہیں
کی۔ لیکن شعراء کو انہوں نے بہت عزت دی۔ خصوصیت سے اخطل فرزدق، جریر اور نصیب نے تو امویوں کی وجہ سے ایک طرح کی
بادشاہی کی تھی۔ اموی دربار سے دور رہنے والے شعراء عمرو بن ابی ربیعہ، جمیل اور کثیر تھے۔ ایک بار عمرو سے سلیمان بن عبد الملک نے
شکوہ بھی کیا تھا۔ اے بڑے شاعر کیا بات ہے۔ تم ہماری تعریف میں کچھ نہیں لکھتے تو اس نے جواب دیا تھا، اس لئے کہ ہم صرف
عورتوں کی تعریف کرتے ہیں۔

بہر حال اموی دور سے ایک نئی طرز کی جماعتی زندگی کا نمود ہوا اور اسلامی زندگی نہ تھی، لہٰذا اس دور کا شعر بھی خالص اسلامی
نہیں۔ اسلامی شعر تو حسان بن ثابت اور اُن کے گروہ کا ہے۔

عمرو بن ابی ربیعہ، جمیل، کثیر، فرزدق، جریر، نصیب کو اچھے اور آزاد خیال شعراء تھے۔ لیکن وہ خود کو مسلمان سمجھتے اور فخر کرتے
وہ قرآن کی آیات اپنے دفاع میں پیش کرتے۔ اس دور کے غزل گو شعراء میں عمرو، جمیل، کثیر، نصیب قریب قریب ہم پلہ ہیں۔ عمرو
امام ہے اور باقی اس کے مقتدی۔ اموی دور میں عمرو بن ابی ربیعہ کو سب سے بڑا غزل گو شاعر مانا گیا ہے۔ اور وہ اس لئے کہ
اسے بڑی عورتوں سے عشق کرنے ان کی صحبت سے فیض یاب ہونے اور ان سے اپنے اشعار منسوب کرنے کی عزت دوسروں کی
نسبت زیادہ نصیب ہوئی۔

عمرو مکہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی ماں نصرانی تھی اور آخر وقت تک نصرانی رہی۔ یہ ماں کی صحبت کا اثر تھا۔ یا ایک مالدار باپ کا

پیدا ہونے کی بات تھی کہ عمرو بڑا آزاد منش نوجوان تھا۔ گو اس کے باپ بھی صحابی تھے، اور حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت عبداللہ بن عباس اور دوسرے صحابہ سے ملاقات کا شرف بھی اسے نصیب تھا۔ اس کے باوجود اس کی تربیت اتنی صالح نہ تھی۔ وہ اپنے شعر کے سبب اس وقت کے معاشرہ میں محترم سمجھا جاتا۔ وہ آزادانہ اس دور کی بڑی بڑی عورتوں سے ملتا۔ ان کی تعریف میں شعر کہتا۔ ان بڑی عورتوں میں عائشہ بنت طلحہ، فاطمہ بنت عبدالملک اور عاتکہ بنت معاویہ جیسی بڑی عورتیں تھیں۔ لیکن ایسی عورتیں بھی تھیں جو اسے دیکھتے ہی اس سے پناہ مانگتیں۔

حقیقتاً امویوں نے شعر کی اچھی طرح سے سرپرستی کی۔ خصوصیت سے عمرو تو اپنی غزل کے سبب بہت ہی پسند کیا جاتا۔ حتیٰ کہ حضرت سکینہ بنت حسین جیسی بڑی خاتون عمرو کا احترام کرتیں اور اس سے شعر سنتی تھیں۔

فرزدق اس دور کا سب سے بڑا شاعر مانا گیا ہے۔ وہ عمرو بن ابی ربیعہ کو اغزل الناس کہتا تھا۔

فاطمہ بنت عبدالملک حج کے لئے آئی۔ عمرو کے اشعار سن چکی تھی اور شہرت سے بھی واقف تھی۔ اس لئے اس کی بڑی خواہش تھی کہ عمرو سے اشعار سن لے، لیکن عمرو عبدالملک کے ڈر سے گھر میں چھپا بیٹھا تھا۔ حج کے خاتمے پر جب فاطمہ جانے لگی تو ایک آدمی کو عمرو کے پاس بھیجا اور لعنت ملامت کی۔ ہم مکہ سے دمشق جا رہی ہیں۔ ہمارے ساتھ منتخب حسن ہے اور تجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ہمیں زادِ راہ کے طور پر چند اشعار عطا کر دیتا۔ عمرو نے غزل بھی بھجوائی اور کچھ اشعار اپنے متعلق بھی کہہ کر بھیجے، جن میں کچھ کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"اے کاش اس کے سفر اختیار کرنے کے دن میری موت مجھے آلیتی۔ اے کاش میں اس کے رخصت ہونے سے پہلے مرجاتا۔ میں شدت درد کے سبب بات کہنے کی جرأت نہ کر سکا اور میرے آنسو منہ زور ندی کی طرح میرے چہرے پر بہتے رہے"۔

اسی طرح جمیل بھی اس دور کا ایک بڑا غزل گو شاعر ہے۔ عمرو ہرجائی تھا مگر جمیل نے صرف ایک عورت کے عشق میں شعر کہے اور وہ بثینہ تھی۔ جمیل مدینے کا رہنے والا بڑا محترم شاعر تھا۔ ایک مرتبہ نصیب مدینہ آیا اور شعر کے ایک بڑے نقاد ولید بن سعید کے ساتھ مسجد میں بیٹھا تھا۔ وہاں عبدالرحمن بن حسان ثابت بھی تھے۔ ناگاہ ایک خوبصورت اور لمبے قامت کا شخص آیا۔ لوگ پکارنے جمیل آگئے۔ یہی جمیل مدینہ کا بڑا شاعر تھا۔ حاضرین نے اس سے درخواست کی کہ کچھ اشعار سناتے۔ اس نے اشعار سنائے اور چلا گیا۔ وہ گیا تو ولید نے اس کی تعریف کی۔ جمیل عہد اسلام کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ عبدالرحمان بن حسان نے لقمہ دیا وہ "عہد جاہلیت کے سارے شعراء پر بھی بھاری ہے"۔

یہ امر واقعی تھا کہ جمیل میں بے حد خلوص تھا۔ اس نے بثینہ سے والہانہ محبت کی تھی اور اس محبت نے اس کے دل و دماغ میں ایک عجیب آگ بھر دی تھی۔ اسی نے اس کے شعر کو لازوال تاثر بخشا۔ گو وہ اپنی محبت میں محروم رہا۔ وہ اپنی محبوبہ سے تنہائیوں میں بھی ملا لیکن اس نے کبھی ایسی بات نہ کی جس سے ہوس کی بو آتے۔

اکثر بیشتر جب جمیل بثینہ سے ملنے جاتا۔ ایک دوسرا بڑا شاعر کثیر اس کے ساتھ ہوتا اور بثینہ بھی اپنی بہن کے ساتھ ان سے ملنے آتی، شعر سنتی، آنسو بہاتی اور گھر لوٹ جاتی۔ جمیل کا دوست کثیر بھی صرف مدینہ ہی میں نہیں بلکہ عرب دنیا میں اونچا شاعر مانا گیا ہے۔ جمیل کی طرح کثیر بھی ایک لڑکی عزہ کو بہت پسند کرتا تھا۔ مگر جمیل کی طرح وہ عزہ کے لئے پریشان تو رہتا۔ صرف اس کا نام لے کر شعر کہتا۔ وہ عزہ سے بہت کم ملا۔ البتہ اپنی غزل کو اس کی محبت سے بہت لذیذ بنایا۔ بڑی بڑی خواتین کی خواہش تھی کہ کثیر ان کے ناموں سے اپنی غزلیں منسوب کرے۔ لیکن اس نے بہت کم ایسا کیا۔ سیلانی آدمی تھا۔ کبھی یہاں ہوتا کبھی مصر چلا جاتا اور کبھی دمشق۔ جہاں

عبدالملک اس کا بہت احترام کرتا۔ کثیر چونکہ شاہی درباروں میں جاتا اس لئے اس کی شہرت وقت قریب قریب ساری عرب دنیا میں پہنچ چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ اتنا وسیع الظرف تھا کہ جمیل کو اپنے اوپر ترجیح دیتا تھا۔

اخطل بھی بڑا اچھا شاعر تھا چونکہ وہ نصرانی تھا وہ آزاد خیال درباری شاعر تھا۔ عبدالملک کو وہ بہت عزیز تھا۔ بارہا اس نے اس سے خواہش ظاہر کی کہ اسلام لے آئے اور شراب چھوڑ دے۔ دس ہزار درہم ماہانہ تنخواہ بھی پیش کی مگر اخطل نے نہ اسلام قبول کیا۔ اور نہ ہی شراب چھوڑی۔ وہ اپنے سامنے کسی کو شاعر نہ مانتا لیکن کبھی کبھی اپنے دو حد مقابل فرزدق اور جریر کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا اور لوگوں سے کہتا "یہ دو کتے عرب مجھ سے کبھی کبھی بازی لے جاتے ہیں"

لیکن اس دور میں جن دو شاعروں سے عرب کا بچہ بچہ واقف ہوا، وہ فرزدق اور جریر تھے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل تھے۔ یہ بڑے میلوں، بڑے اجتماعوں اور بڑی مجلسوں میں ایک دوسرے کے مقابلہ میں شعر کہتے اور داد عام پاتے۔ گو پورا زور لگا کر ایک دوسرے کی ہجو کرتے۔ ایک کی بات کو دوسرا کاٹتا۔ لیکن دو ہر وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے۔

فرزدق جریر سے پہلے فوت ہوا۔ جریر کو جب فرزدق کی موت کی اطلاع ہوئی تو وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ لوگوں نے روتے دیکھا تو تعجب کا اظہار کیا۔ جریر نے کہا "ظالمو! تم کیا جانو ہم دونوں کے لئے ایک دوسرے کا وجود کتنا ضروری تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو آئیڈیل سمجھ کر اشعار کہتے"

ایک بار فرزدق حضرت سکینہ بنت حسین کے دردولت پر اس خواہش سے حاضر ہوا کہ حضرت سکینہ اس کا کلام سنیں۔ وہ تین دن تک متواتر حاضری دیتا رہا۔ لیکن جب وہ آتا حضرت سکینہ اسے جریر کے اعلیٰ درجے کے اشعار بھی سناتیں اور اس مضمون میں اس کے اشعار بھی پڑھتیں اور کہتیں کہ تم سے تمہارے ساتھی نے اچھے شعر کہتے ہیں۔ فرزدق کو آخر وقت تک انہوں نے اشعار سنانے کا موقعہ نہیں دیا۔

فرزدق گو اموی دربار کا شاعر تھا مگر اسے خاندان نبوی سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ ایک بڑے صحابی کا پوتا، نام ہمام، کنیت ابوفراس اور فرزدق تخلص تھا۔ قصیدہ اور ہجو کا تو وہ بادشاہ تھا۔ وہ جریر اور اس کے خاندان کے عیب گنواتا اور جریر اس کے مقابلے میں اسکے خاندان پر حملہ کرتا۔ وہ قصیدے لکھ کر لاتے اور میلوں اور منڈیوں میں جو ان کے نام سے مشہور ہو گئی تھیں۔ کبھی اونٹنیوں پر چڑھ کر شعر کہتے اور کبھی محفلیں جماتے۔

فرزدق عبدالملک سے لے کر ولید اور سلیمان کے عہد تک درباری شاعر رہا۔ سلیمان کے عہد میں اس نے بڑا عروج پایا۔ ایک بار تو عجب اتفاق ہوا۔ اس نے سلیمان کو بے تکلفی میں کچھ ایسے اشعار سنائے، جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے نامحرم عورتوں سے اختلاط کیا ہے۔ سلیمان نے اس کی گرفت کی اور اس سے کہا تمہیں معلوم ہے ہم امام ہیں اور امام کے سامنے جو شخص اپنے گناہ کا اعتراف کرے۔ امام کا فرض ہے کہ اس پر حد جاری کرے۔ اس لئے ہم بھی تم پر حد جاری کریں گے۔ بات بڑی ٹیڑھی تھی۔ لیکن ذہین فرزدق نے قرآن کی آیت پڑھی، ترجمہ ہے۔

"شعراء خیالی باتوں کے پیچھے دوڑتے ہیں، کیا تم نہیں دیکھتے۔ وہ ہر وادی میں آوارہ پھرتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں، جو نہیں کرتے"

ہم نے بھی جو باتیں اپنے شعر میں کہیں یوں ہی کہہ دی تھیں، کی نہیں تھیں"

کہتے ہیں ایک بار سلیمان عبدالملک کے سامنے چند مجرم پیش ہوئے جن کے لئے قتل کی سزا تجویز ہوئی تھی۔ سلیمان نے تلوار فرزدق کے ہاتھ میں پکڑا دی کہ ان قیدیوں کو قتل کرے اور ثواب کمائے۔ فرزدق شعر میں خوب تلوار چلانے کا عادی تھا۔ مگر یوں کبھی اس نے

حرکت نہ کی۔ تلوار تو اٹھائی۔ مگر آدمی کے قتل پر دل آمادہ نہ ہوا۔ تلوار کا ایک وار بھی کیا لیکن وُہ چٹ گیا۔ اور مجرم کا ایک قطرۂ خون بھی نہ بہا سکا۔ سلیمان اور حاضرین بڑی طرح ہنسنے لگے۔ شاعر نے خفت مٹانے کے لئے چند اشعار بھی کہے مگر بات نہ بنی۔ اگر وہ کسی کو مانتا تھا تو وہ جریر تھا۔ جو بصرہ آنے سے پہلے یمن میں رہتا تھا۔ اس کی شہرت اسے بصرہ لے آئی اور جبراً حجاج بن یوسف کے دربار میں حاضری دینی پڑی۔ جریر پہلا شاعر تھا جس نے وقت کے اس بڑے خطیب اور ظالم حجاج سے داد پائی، اور پھر حجاج نے اسے ایک وفد کا سربراہ مقرر کر کے دمشق بھیجا اور جریر کو عبد الملک کے دربار میں پہلا قصیدہ پڑھنے کا موقعہ ملا۔ قصیدہ کیا تھا، دربار کا رنگ بدل گیا عبد الملک اس قدر خوش ہوا کہ جریر کو خلعت فاخرہ بھی عطا کی۔ سو اونٹنیاں، اسی غلام اور بہت سارو پیہ عطا کیا۔ صاحب الاغانی کا بیان ہے کہ جریر فرزدق سے زیادہ قادر الکلام اور زیادہ عمدہ شعر کہنے والا تھا اور اکثر جب مربد میں جو بصرہ کی سب سے بڑی منڈی تھی۔ جریر اشعار سنانے کے لئے کھڑا ہوتا تو آدمیوں کا سمندر کا سمندر اس کے اشعار سننے کے لئے آن جمع ہوتا۔ دالراویہ اس دور کے ایک بہت بڑے عالم اور شعر و نثر کے بڑے نقاد تھے۔ فرزدق نے ایک بار ان سے پوچھا ہم دونوں میں بڑا شاعر کون ہے تو انہوں نے جواب دیا کبھی آپ بڑے نظر آتے ہیں اور کبھی جریر۔

ایک بار ایک اعرابی سے عبد الملک نے کسی بڑے شاعر کے اشعار سنانے کی فرمائش کی۔ اعرابی نے جریر کے اشعار سنائے اور ہر مضمون اور ہر بحر میں سنائے۔ عبد الملک نے بہت خوشی کی وجہ سے خلعت فاخرہ اُسے عطا کی۔ حالانکہ فرزدق اس کا درباری شاعر تھا۔ جریر غزل بھی بڑی اچھی کہتا اور یہ بات فرزدق میں نہ تھی۔

اخطل ہی ایسا شاعر تھا جو جریر کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اتفاقاً دونوں ایک ہی جگہ بنی تغلب کے ہاں مہمان ہوتے۔ اخطل نے جریر سے پوچھا، تم کس قبیلے سے ہو۔ جریر نے جواب دیا۔ بنی تمیم سے۔ بنی تمیم اس وقت شہرت کے آسمان پر چمک رہا تھا اور یہ جریر اور فرزدق کی بدولت ـــ مگر اخطل چونکہ فرزدق سے آشنا تھا۔ اس لئے اس نے فرزدق کا نام تو نہ لیا۔ البتہ جریر کا لیا اور طنز کی۔ "تم اس قبیلے سے ہو، جس کے ایک بے ہودہ شاعر کی شان میں ہم نے ہجو کی"۔ پھر ہجو کے اشعار سنائے۔ جریر نے اشعار سنے اور جواب دیا۔ اس بے ہودہ شاعر نے کچھ تمہاری خدمت میں بھی اشعار کا تحفہ بھیجا ہے۔ پھر اشعار سنائے۔ پھر دونوں کو اشعار سنانے کی بیماری ہوگئی اخطل چیخ اٹھا بخدا تم جریر ہو اور کوئی نہیں۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کر دے

(اقبال)

پروفیسر نیاز احمد فقیر

گیت

تجھ بن پریتم چین نہ پاؤں

نیل گگن پر بادر چھاتے ؛ پریتم تیری یادیں لاتے
پون چلے تو جی گھبراتے ؛ منوا پاگل کل نہ پاتے
پگ پگ چلتے ٹھوکر کھاؤں
تجھ بن پریتم چین نہ پاؤں

رم جھم رم جھم بادل برسیں ؛ دیکھ کے جن کو انکھیاں ترسیں
امڈ امڈ کے ساگر چھلکیں! ؛ پل پل بھیگتی جائیں پلکیں
ٹیس اٹھے تو چھپ چھپ روؤں
تجھ بن پریتم چین نہ پاؤں

پیار کی من میں جوت جگا کر ؛ جیون کا اک روگ لگا کر
روٹھ گئے ہو چھوڑ گئے ہو ؛ مکھ بالم سے موڑ گئے ہو!
مل جاؤ تو پھر سے مناؤں
تجھ بن پریتم چین نہ پاؤں

آشاؤں کے دیپ جلاتے ؛ راہ میں تیری نین بچھائے
بیٹھی ہوں میں جانے کب سے ؛ صدیاں بیت گئی ہوں جیسے
ہر آہٹ پہ دل بہلاؤں
تجھ بن پریتم چین نہ پاؤں

ہر سو دیکھے جگ اندھیارا ؛ تجھ بن مورا جیا اُجیارا!
کب تک مجھ سے دور رہو گے ؛ یونہی دیس بدیس پھرو گے
آ جاؤ تو میں مسکاؤں
تجھ بن پریتم چین نہ پاؤں

پروفیسر قیصر امین الدین
ایم۔ اے

آس کے پھول

بس جب اڈہ پر رکی تو رحیم جو کہ بس کی سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھا گھنٹوں سے دھول پھانک رہا تھا۔ نیچے اترا اور اپنی لٹھے کی کلف لگی ہوئی کڑکڑاتی نئی شلوار جھاڑنے لگا۔ کپڑے جھاڑ کر اس نے جیب سے ایک ادھ جلا سگریٹ نکال کر سلگایا اور زور زور کے کش لیتا ہوا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ شاید کوئی اونٹ یا خچر والا مل جائے اور وہ جلد اپنے گاؤں پہنچ جائے۔ اس کا گاؤں سید دوال بس کے اڈہ سے سات کوس کے فاصلے پر تھا اور راستہ دشوار گزار ہونے کے باعث کوئی ٹانگہ یا بس وغیرہ وہاں نہیں جاتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ بس کی آمد کے وقت خچروں اور اونٹوں والے اڈے پر پہنچ جاتے اور مسافروں کو اپنی منزلوں تک لے جاتے، کچھ دیر وہیں کھڑے رہنے کے بعد اس نے اپنے کالے صندوق کو کندھے پر رکھا اور گاؤں جانے والی پگڈنڈی پر ہولیا۔

جب سے وہ بھرتی ہو کر لام پر گیا تھا آج واپس لوٹ رہا تھا۔ گو یہ چار سال آنکھ جھپکتے ہی گذر گئے لیکن آج اسے ہر چیز بدلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ کھیتوں کے کنارے لگے ہوئے شیشم اور آم کے پودے اب تناور درخت بن چکے تھے، کچے مکانوں کی جگہ پختہ مکانوں نے لے لی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ خود بھی تو کتنا بدل گیا ہے۔ اس کی مونچھیں اب گھنی اور ماتھے پر شکنیں زیادہ نمایاں ہوگئی ہیں۔ ہاں اگر کسی چیز میں تبدیلی رونما نہیں ہوئی تو وہ سبیلی کے لئے اس کی محبت ہے جو اب بھی ہری بھری ہے جو اب بھی جوان ہے، موت اور زندگی کی کشمکش سے رنگے ہوتے ان چار سالوں میں وہ ایک لمحہ بھی سبیلی کی یاد سے غافل نہیں رہا۔ محاذ پر جب موت برس رہی ہوتی تو سبیلی زندگی بن کر اس کے سامنے آجاتی موت اس سے دور بھاگ جاتی اور اُسے یقین ہو جاتا کہ وہ زندہ رہے گا۔ سبیلی اس کی ہو کر رہے گی۔ وہ ضرور اس کے بچوں کی ماں بنے گی اور اپنی محبت کی راہوں میں اس کے قدم کبھی نہیں ڈگمگاتے تھے، اسے معلوم تھا کہ قدموں کا ڈگمگانا تھکن ظاہر کرتا ہے اور تھک جانا منزل سے دوری ہوتی ہے اور منزل سے دوری اصل موت ——— اسی لئے وہ اپنی اور سبیلی کی محبت پر پورا بھروسہ اور اعتماد لئے اپنی راہ پر گامزن تھا۔

سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جھکتا جا رہا تھا، درختوں اور چھوٹی چھوٹی بوٹیوں کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں اور بسیروں کی تلاش میں مصروف پرواز تھے اور رحیم آسمان پر نگاہیں گاڑے اپنے آپ کو ایک پرندہ ہی سمجھ رہا تھا، کیونکہ آج وہ بھی آزاد تھا، نہ "مارو اور مر جاؤ" کے احکام تھے نہ ملک سے وفاداری کے وعدے نہ افسروں کی ڈانٹ ڈپٹ تھی نہ موت کا مسلسل خطرہ ——— غرضیکہ وہ بھی ایک آزاد پنچھی تھا جو اپنے بسیرے کو لوٹ رہا تھا ——— انہیں خیالات میں غرق وہ سنسان اور ویران سے راستے کو جلدی جلدی طے کئے جا رہا تھا۔ سبیلی بُری طرح اس کے ہوش پر چھائی ہوئی تھی، اور آخری ملاقات کی ایک ایک بات اس کے ذہن میں ابھر رہی تھی ——— وہ اب اس تالاب کے کنارے پر پہنچ گیا تھا جہاں برگد کے بوڑھے درخت کے نیچے بیٹھ کر اس نے اور سبیلی نے ایک دوسرے کے انتظار کے، محبت کے اور وفاؤں کے عہد و پیمان کئے تھے پھر کتنی سے کڑی تھی یہی اور تمام کی تمام باتیں اس کے دماغ میں تازہ ہونے لگیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے اس درخت کے نیچے ٹھہر گیا ———

اسے یاد آیا کہ سجیلی نے اس رات اپنی سہیلی ریشماں کا قصہ سنایا تھا۔ ریشماں کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کسی دوسرے گاؤں میں ہو گئی تھی۔ پھر اس کی سسرال والوں کو اس کے گاؤں کے ایک لڑکے کے ساتھ تعلقات کا پتہ چل گیا۔ انہوں نے اسے طعنے دے دے کر بستر پہ لٹا دیا اور کچھ دنوں بعد وہ مر گئی تھی۔ سجیلی نے اس کے بازو پر سر رکھے روتے ہوئے کہا تھا" رحیم تم جلدی واپس آنا کہیں میں بھی تمہاری یاد میں گھل گھل کر نہ مر جاؤں کہیں مجھے بھی دنیا والے تمہارے نام کے طعنے دے دے کر نہ مار دیں"۔ رحیم خوش تھا کہ وہ جلدی آ گیا ہے۔ چار سال کا عرصہ بھی کوئی عرصہ ہے سجیلی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ وہ اب اسے بیاہ کر جلدی اپنے گھر لے آئے گا۔۔۔ چند لمحوں کے بعد وہ چل پڑا۔ اب وہ ان کھیتوں میں سے گذر رہا تھا جہاں اس آخری ملاقات کی رات ایک کسان لالٹین ہاتھ میں لئے کھیتوں کو پانی دیتے ہوئے پرسوز آواز میں گا رہا تھا۔

اج دی رات وصال والی بلکے کی جان کیڑا رنگ ہوسی۔
میلے خیر محمدا اے قسمتاں دے کتھے شمع تے کتھے پتنگ ہوسی۔

(آج کی رات تو وصال کی رات ہے کل نا معلوم کیا رنگ ہوگا۔ محمد یہ تو قسمتوں کے میلے ہیں پتہ نہیں شمع کہاں ہوگی اور پتنگا کہاں ہوگا) اور سجیلی کو روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی پھر وہ جدا ہو گئے تھے۔

وہ بچپن ہی سے ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ سارا سارا دن اور گئی شاموں تک وہ کھیل میں مگن رہتے۔۔۔ جب جوان ہوئے تو ان کی ملاقاتوں کی نوعیت بھی بدل گئی اور وہ چھپ چھپ کر گرے مکانوں، غیر آباد کنوؤں اور ویران کھلیانوں میں ایکدوسرے سے ملتے رہے اور آہستہ آہستہ ایک دوسرے میں کھو گئے۔۔۔ بیساکھی میں جب گاؤں کی تمام اُلھڑ لڑکیاں اور جوان عورتیں اکٹھی ہو کر رات کو کھلیان میں ناچتی، گاتیں اور شور مچاتیں تو سجیلی رحیم کو چوری چھپے گائے بھینسوں کے چھپر میں گھسیٹ دیتی اور وہ گھنٹوں اُن کی مستیاں دیکھتا رہتا۔ جب سجیلی ناچتی تو اسے ایسے لگتا کہ ساری کائنات ناچ رہی ہے۔ اس کا سر گھومنے لگتا اور سجیلی کے پیروں میں بندھے ہوئے گھنگھروؤں کی چھن چھن اس کے دل کے تار چھیڑتی رہتی۔ واپس آکر وہ گھنٹوں سجیلی کا پھڑکتا ہوا انگ انگ اپنی نظروں کے سامنے پھرتا محسوس کرتا رہتا۔

سورج اب ڈوب گیا تھا اور آسمان پر روشن چاند کی کرنیں اب پانی میں جھلکنے لگی تھیں۔ دور اسے اپنا گاؤں دکھائی دے رہا تھا، جس پہ ہلکی ہلکی دھند چھائی ہوئی تھی۔

جب وہ اپنے گاؤں میں داخل ہوا تو دہلیزوں پر بیٹھے ہوئے کتے بھونکنے لگے اور چھوٹے چھوٹے ننگ دھڑنگ بچے اس کے پیچھے ہو لئے۔۔۔ اپنے محلے میں ایک بے نام سا سکوت اسے کچھ عجیب سا لگا وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچا تو دروازے پر تالا پڑا ہو دیکھا پھر وہ اپنا صندوق اٹھائے آگے چلدیا تا کہ کسی جان پہچان سے اپنے گھر والوں کی بابت دریافت کرے۔ تھوڑی ہی دور چلنے کے بعد وہ ایک گھر کے سامنے رکا۔ دہلیز پر کوئی اُسے بیٹھا ہوا نظر آیا۔۔۔ یہ مائی غفوراں تھی اس کی ماں کی سہیلی۔

سلام دعا کے بعد رحیم نے اپنے گھر والوں کے متعلق پوچھا تو غفوراں نے ایک آہ بھری اور بولی" آج چوہدری احمد کی لڑکی سجیلی مر گئی ہے تمہارے گھر والے وہاں گئے ہیں" "ہیں! سجیلی مر گئی؟" "وہ کیسے مر گئی کیوں مر گئی؟" "سجیلی نہیں مر سکتی وہ نہیں مر سکتی"۔ "بیٹے وہ بہت دکھی تھی مر کر چھوٹ گئی ایک برس پہلے احمد خان نے اس کی شادی کر دی تھی، اس نے تمہارا بہت انتظار کیا وہ روتی چیختی لیکن لڑکی تھی کہاں تک اس کا زور چلتا۔ تم جلدی آنے کا وعدہ کر کے گئے تھے، دیر سے لوٹے ہم نے تو تمہیں مرا ہوا سمجھ لیا تھا مگر جب تمہاری خیریت کی خبر ملی تو سجیلی بیاہی جا چکی تھی۔۔۔ پھر اس کی سسرال والوں کو تمہارے اور اس کے تعلقات کا پتہ چل گیا

وہ اسے طعنے دیتے رہے اس پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتے رہے ادھر تمہارا غم اُسے گھن کی طرح چاٹتا رہا۔"
رحیم کے کندھے پر رکھا ہوا صندوق پھیلنا شروع ہوا، پھیلتے پھیلتے ایک پہاڑ بن گیا —— وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

کہتے ہیں سیدو وال میں جب رات بھیگ کر خاموشی کے سروں کو چھیڑتی ہے۔ جھینگر ٹرا ٹرا کے خاموش ہو جاتے ہیں تو "بیجلی! بیجلی" کی آوازوں سے سارا گاؤں گونج اٹھتا ہے پھر یہ آوازیں چیخوں میں بدل جاتی ہیں اور آس پاس کی پہاڑیوں سے ٹکرا کر فضا میں ارتعاش پیدا کرتی رہتی ہیں ایک بڑھی ہوئی داڑھی اور بڑھے ہوئے بالوں والا نیم برہنہ آدمی اِدھر سے اُدھر دوڑتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی کبھی بیجلی کی قبر پر بہت سے گلاب کے پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی ہوتی ہیں۔

(بقیہ، سلطان محمد تغلق)

جیسے مشکل زمانے میں ایک عرصہ دراز تک سلطنت کی بھاری ذمہ داری کو سنبھالے رکھا اور آخری دم تک نہایت ہی پامردی سے مشکلات اور مصائب کا سامنا کرتا رہا۔

مشتاق، اے ۔ ساول ۔ بی ۔ اے ۔ سال اول

بھکاری

وہ نئی کالونی کی خوبصورت شاہراہ پر جا رہا تھا بوسیدہ پتلون کی پھٹی ہوئی جیبوں میں بار بار اس کے ہاتھ جاتے لیکن کچھ بھی نہ پاکر ناکام واپس لوٹ آتے ـــــ ابھی جاڑے کی ابتدا ہی تھی لیکن اس شام بارش کی وجہ سے خنکی میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا ـــــ اسے سگریٹ کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن اس کے پاس بیڑی کے لئے بھی پیسے نہیں تھے۔

آج اسے نوکری کی تلاش کرتے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا یکایک اسے فٹ پاتھ پر ادھ جلا ہوا سگریٹ کا ٹکڑا ملا، اس کی نظریں وہاں جم سی گئیں اس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر سگریٹ اٹھالی وہ سڑک کے کنارے بس اسٹاپ پر بچھے ہوئے بنچ پر بیٹھ گیا اور خیالوں کے اتھاہ سمندر میں غرق ہو گیا ـــــ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی جھونپڑی میں قدم رکھا اندھیرے میں چراغ ٹمٹما رہا تھا، اپنی بے بسی کا ماتم کرتا اور ماہیں دکھاتی ـــ

انور! اس کے باپ کی مدھم سی آواز گونجی۔ نوکری ملی بیٹا ـــــ نہیں ـــ اس کا مختصر سا جواب تھا۔

کوئی بات نہیں بیٹھ جاؤ۔

وہ اپنے باپ کے سرہانے بیٹھ گیا ـــ تم جانتے ہی ہو میں نے تمہیں کیسے پڑھایا۔ اس کے باپ نے کہنا شروع کیا ـــ جب ہم نے ہندوستان کو چھوڑا تو اس وقت صرف تم ہی میرے ساتھ تھے ـــــ نئے وطن میں میں نے نوکری کی تلاش کی لیکن مجھے کیا آتا تھا۔ میں ان لوگوں میں سے تھا جو ناز و نعم کی گود میں پرورش پاتے ہیں۔ بد قسمتی سے تعلیم بھی مکمل نہ کر سکا تھا ـــــ نئے وطن میں جب فاقوں کی نوبت آ پہنچی تو صرف تمہاری وجہ سے مانگنے پر مجبور ہو گیا۔ مانگنے کا چسکہ ایسا لگا کر آج تک میرے دامن پر بھکاری ہونے کا دھبہ لگا ہوا ہے۔ یہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ جو راستے میں کام آ گئی تھی، اب بڑی سود مند ثابت ہوئی ـــــ اس طرح مانگ کر میں نے تمہیں پڑھایا اور آج تک کسی کو پتہ نہیں چلا کہ تم ایک بھکاری کے بیٹے ہو" ـــــ یہ کہتے ہوتے وہ سانس لینے کے لئے تھوڑی دیر رکا اور اس نے پھر کہنا شروع کیا ـــ " آج بستر مرگ پر بیٹا تم سے آخری دفعہ باتیں کر رہا ہوں مجھے معلوم ہے کہ میں چند گھڑیوں کا مہمان ہوں۔ ہمارا خاندان قدرت کے عروج و زوال کے چکر کی زد میں آ کر تباہ ہو گیا تھا لیکن اب تمہارا فرض ہے کہ اس کی ساکھ کو دوبارہ قائم کرو ـــ نوکری کی تلاش کرو اور اپنے لئے اس جہانِ فانی میں کوئی مقام پیدا کرو" ـــــ اپنے باپ کے آخری الفاظ اسے اس طرح سنائی دیتے جیسے بہت دور سے کہے جا رہے ہوں اور کچھ دیر کے بعد اس کے باپ کی گردن ایک طرف کو ڈھلک سی گئی اور دوسرے دن بستی کے قبرستان میں ایک نئی قبر کا اضافہ ہو گیا ـــــ

اس کے ہاتھ میں جلن محسوس ہوئی، چونکا ـــ سگریٹ کا ٹکڑا ختم ہو چکا تھا ـــــ وہ اٹھا اور اپنے باپ کی کٹیا کی طرف روانہ ہو گیا آج اسے فاقے سے تیسرا دن تھا اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے ـــــ یکایک اس کی نظریں اپنے باپ کی بیساکھیوں اور چیتھڑوں پر پڑیں اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں ـــــ اور کچھ دیر کے بعد ایک لنگڑا فقیر کٹیا سے باہر آ رہا تھا یہ انور

ہی تھا۔ اپنے باپ کے کپڑے پہن کر اور بیساکھیاں لے کر جب وہ باہر آیا تو بالکل ایک لنگڑا فقیر معلوم ہوتا تھا۔ چہرے پر بھوک کی وجہ سے مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ داڑھی کافی حد تک بڑھ گئی تھی، اور اس کی مصنوعی لنگڑی ٹانگ تو اس بڑی اور بھدی سی شلوار میں بالکل چھپ سی گئی تھی۔ اس طرح شہر کی سڑکوں پر ایک اور فقیر ہاتھ پھیلاتے آوارہ گردی کرنے لگا —— معاشرے کے دامن پر ایک اور داغ لگ گیا ملک کی قسمت کا ایک اور ستارہ ٹوٹ گیا۔ معیشتِ ملی کی مشین کا ایک اور پرزہ بیکار ہوگیا —— اس طرح باپ کے بعد بیٹے کو بھیک مانگنے کا چسکا پڑگیا — اب اس کی زندگی بدل گئی تھی۔ پہلے تو اس کا یہ کاروبار معمولی سا تھا مگر رفتہ رفتہ خوب چمکنے لگا۔ اب اس نے اپنے جیسے کئی بھیک منگوں کا ایک پورا گینگ بنا لیا اور خود ان کا سردار بن بیٹھا —— رات گئے وہ ایک نئے روپ میں باہر آتا تھا۔ اس وقت اس کے بدن پر ایک عمدہ سا سوٹ ہوتا اور پاؤں میں نوکیلے چمکدار بوٹ —— وہ شہر کے بڑے شبینہ کلب کا ممبر تھا جہاں وہ برج کھیلتا۔ عرق انگور پیتا اور کسی لیلائے مغرب کو ہم آغوشِ مشرق کرتا یا کسی عندلیبِ شب سے سازِ مغرب کی دھن پر سوزِ میر سنتا —— یہ تھی اس کی کل کائنات۔ مانگا اور لٹایا۔

ایک دن مانگتے ہوئے اپنے گینگ کے فقیروں کی نگرانی کرتے ہوئے شہر کے فیشن ایبل علاقے کی طرف نکل گیا یہاں اسے چند غیر ملکی نظر آئے جو بغل میں کیمرے لٹکائے گھوم رہے تھے، ایک جگہ ایک بہت عالیشان کوٹھی تھی جس کے پائیں باغ میں بہت خوبصورت فوارے چھلک رہے تھے اور پھول لہرا رہے تھے۔ سامنے چند دوشیزگانِ تہذیبِ حاضرہ چست جامے زیب تن کئے بڑی چستی سے تاش کے پتوں سے دل بہلا رہی تھیں۔ غیر ملکیوں میں سے ایک کیمرہ لے کر اس منظر کا عکس اتارنے لگا دوسرے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگریزی میں کہا "ایسی کوٹھیاں تو امریکہ میں بہت ہیں کیا کرو گے فوٹو لیکر" —— اور وہ چل دیئے۔

انور ان کے پیچھے تھا اب وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچے جہاں ننگ دھڑنگ میلے کچیلے بچے گندی نالیوں میں کھیل رہے تھے، عورتیں اپنے جھونپڑی نما ٹوٹے پھوٹے چھوٹے چھوٹے گھروں کے سامنے چقیں اور بوریاں لٹکاتے پردے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں، کوئی اپنے میلے کچیلے چیتھڑوں میں جوئیں تلاش کر رہی تھی اور کوئی دوسری عورت کا سر دیکھ رہی تھی۔ کوئی بچہ اپنی ماں سے ایک پیسہ کے لئے لڑ رہا تھا اور کوئی بہن اپنے بھائی سے تھوڑی سی روٹی مانگ رہی تھی اور بھائی اس کے بدلے بہن سے چٹنی مانگ رہا تھا —— یہ ماحول جانے ان غیر ملکیوں کو کیوں پسند آگیا اور وہ اس علاقے کے بیسیوں فوٹو اتارنے لگے — ان میں سے اس آدمی نے جو پہلے کوٹھی کا فوٹو لینا چاہتا تھا پوچھا "آخر ان گندے فوٹوؤں کو تم کیا کرو گے"۔ دوسرے نے جواب دیا۔ "وقت آنے پر ہم انہیں بتائیں گے کہ تم کیا تھے اور ہم نے کیا بنا دیا" —— جانے انور کو کیوں آگ سی لگ گئی اس بھکاری کا مردہ ضمیر کیوں جاگ اٹھا کہ اس نے جھپٹ کر کیمرہ توڑ دیا اور اس غیر ملکی کو کئی ہاتھ جھاڑ دیئے —— اور اس طرح وہ جیل بھیج دیا گیا۔

اب اس کا ضمیر حیرت انگیز طور پر جاگ گیا تھا، اس نے بھیک مانگنے سے توبہ کرلی۔ جب جیل کے عملے نے اس سے کوئی ہنر سیکھنے کو کہا تو وہ فوٹو گرافری ہی سیکھنے پر آمادہ ہوا جو اس کی زندگی میں ایک انقلاب لائی تھی اور جب وہ چھ ماہ کے بعد باہر نکلا تو ایک مکمل فوٹو گرافر تھا۔ اس نے ایک فوٹو گرافر کے پاس نوکری کرلی چونکہ اب اس کے پاس تعلیم کے ساتھ ہنر بھی تھا اس لئے نوکری بہ آسانی مل گئی —— کچھ دن بعد اس نے چھوٹی سی دکان کرلی اور اس طرح ترقی کرتے ہوئے شہر کا سب سے بڑا فوٹو گرافر بن گیا۔

محمد خالد سال دوم فنون

آوارہ

کامنی اپنی بغل میں نفیس اور قیمتی ساڑھیوں کا بنڈل اٹھائے اپنے شوہر اشوک کے ہمراہ ماڈرن کلاتھ ہاؤس سے باہر نکل کر سڑک کے فٹ پاتھ پر آگئی ـــــ ابھی وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ میونسپلٹی کے لیمپ کے سائے میں کسی کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ بکھرے ہوئے کشادہ پیشانی، گھنی گھنی بھوؤں کی آغوش میں دو چمکیلی آنکھیں، متوسط ہونٹوں پر باریک ترشی ہوئی مونچھیں، سفید قمیض کے کھلے ہوئے گریبان سے جھانکتے ہوئے سیاہ بال۔ ابالی پن سے کندھے پر پڑا ہوا کوٹ، اور پتلون کا ایک پائنچہ نیچا اور دوسرا اوپر ـــــ اس نوجوان کو دیکھ کر کامنی کا دل وفور مسرت سے دھڑکنے لگا خوشی سے چہرہ تمتما اٹھا، ہونٹوں پر ایک دل آویز اور پاکیزہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

غیر ارادی طور پر اس کے قدم اس نوجوان کی طرف بڑھنے لگے۔

کامنی ـــــ اشوک نے اسے اس طرف جاتے ہوئے پکارا۔

آں ـــــ کامنی جیسے کسی گہرے خواب سے بیدار ہوگئی ہو۔

یہ تم کہاں جا رہی ہو ـــــ اشوک نے حیرانگی سے پوچھا۔

کہیں بھی نہیں ـــــ وہ سامنے جو سرخ کپڑوں میں ملبوس لڑکی جا رہی ہے نا ـــــ وہ میری گہری سہیلی رہ چکی ہے۔ مدت بعد آئی ہے۔ سوچا ذرا مل لوں ـــــ بہانہ تراشتے ہوئے کامنی کے شگفتہ چہرے پر خزاں کے پھولوں کی مانند زردی چھاگئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلملانے لگے۔

اوہ ـــــ تو بھئی بلا لو اُسے کیفے میں گرم یا ٹھنڈا مشروب پلا دیں گے ـــــ اشوک مسکراتے ہوئے بولا۔

"نہیں ..... نہیں ..... چلی گئی ہے۔ پھر کبھی سہی" ـــــ کامنی گھبرا گئی۔

اچھا ـــــ جیسے تمہاری مرضی ـــــ اشوک لاپرواہی سے بولا۔

کامنی اشوک کا بازو تھامے، خوفزدہ ـــــ سی لمبے لمبے ڈگ بھرتی جا رہی تھی، اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر وہی نوجوان بظاہر لاپرواہی سے مگر نکھیوں سے دیکھتے ہوئے چل رہا تھا۔ کامنی اور اشوک بارونق بازار سے ہوتے ہوئے ایک تنگ سی گلی میں داخل ہوئے۔ گرین بلڈنگ کی خوبصورت اور فلک بوس عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ کامنی نے آگے بڑھ کر کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا ـــــ دوسرے ہی لمحے گرین بلڈنگ میں گھنٹی گونج رہی تھی۔ ملازم نے دروازہ کھولا ـــــ اور کامنی بڑی سرعت سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اوپر پہنچ کر صوفے پر گر گئی۔

اشوک تعاقب کرتا ہوا اس کے قریب آیا، اور اس کے گھنے چمکیلے بالوں میں محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"کامنی ـــــ کیا بات ہے؟"

کچھ نہیں ـــــ ذرا سر میں درد ہو رہا ہے ـــــ ملازم سے کہئے چائے تیار کر دے ـــــ کامنی نے کہا۔

ڈاکٹر گوپال کو فون کردوں ؟ ـــــ اشوک نے رائے دی۔

نہیں ...... نہیں ، معمولی سا درد ہے خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ کامنی نے جواب دیا۔

اشوک ملازمہ کو چائے کا آرڈر دے کر لوٹا تو کامنی غسل خانے میں داخل ہو چکی تھی ادھر چائے آئی ـــ اُدھر کامنی نئی ساڑھی میں ملبوس غسل خانے سے باہر نکلی۔ اس کے چہرے کی گھبراہٹ اور پریشانی چھٹ چکی تھی۔ اب وہ پہلے جیسی شگفتہ اور ہشاش بشاش دکھائی دے رہی تھی۔ اشوک نے دو پیالیوں میں چائے انڈیلی اور دونوں شڑپ شڑپ چسکیاں پینے لگے۔

رات ڈھل چکی تھی۔ تمام کائنات نیند کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لیکن کامنی جاگ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں ماضی کے واقعات انگڑائیاں لے کر بیدار ہو رہے تھے اور دل میں ایک انجانی خوشی کے ساتھ نامعلوم غم آنکھیں کھول رہا تھا ـــ وہ نوجوان کوئی بیگانہ تھوڑا ہی تھا۔ اس کا سگا بھائی کیلاش تھا ـــ کیلاش جسے وہ بے حد پیار کرتی تھی اور کیلاش تو اسے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ جیسے کامنی اس کی بہن نہ ہو بلکہ محبوبہ ہو ـــ جس سے چند ساعتوں کی جدائی بھی گوارا نہیں ہوتی ـــ وقت کی گردش نے دونوں کے درمیان ناقابل عبور خلیج حائل کر دی ـــ کیلاش نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو شراب ، جوا اور رنڈی اس کے وجود کے ساتھ جونک کی طرح چمٹ گئے ـــ باپ کی تمام دولت تو در کنار کامنی کے جہیز کے لئے بنے ہوئے زیورات بھی ان عیاشیوں کی نذر ہو گئے۔ روپیہ ختم ہو گیا ـــ مگر بری عادت نہ چھٹ سکی۔ کیلاش چور اور آوارہ بن گیا ـــ لوگوں کی جیب تراشنا اس کی زندگی کا اولین مقصد ہو گیا۔ کئی بار وہ سزائیں بھی بھگت چکا تھا ـــ کامنی جوان تھی ـــ خوبصورت تھی ـــ پڑھی لکھی تھی ـــ مگر کیلاش والدین اور آوارہ بھائی کو دیکھتے ہوئے کسی نے اس سے شادی نہ کی ـــ سبھی جانتے تھے کہ لڑکی بڑی آسانی سے مل سکتی ہے مگر جہیز میں کچھ نہیں آئے گا ـــ اس لئے کامنی کنوارپنے ہی میں بائیس سال کی ہو گئی ـــ

آخر قسمت کی دیوی مسکرائی ـــ زندگی کے ایک خوشگوار موڑ پر اسے اشوک مل گیا۔ اشوک دہلی کا مشہور تاجر تھا اور تجارت کے سلسلے میں پونا آیا تھا۔ ایک روز اتفاقی طور پر دونوں کا کریسنٹ ہوٹل میں سامنا ہوا۔ اجنبی اور غیر مانوس نگاہیں ٹکرائیں ـــ دو امنگوں اور آرزوؤں بھرے دل دھڑکے اور آنکھوں نے ایک دوسرے کو جیون ساتھی بنانے کا تہیہ کر لیا۔

کامنی جانتی تھی کہ اشوک جیسے امیر اور خوبصورت نوجوان سے شادی کرنے پر اس کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا ـــ مگر جہیز اور آوارہ بھائی ـــ شاید اشوک انکار کر دے اس نے سوچتے ہوئے ایک من گھڑت کہانی سنائی ، یعنی اس کی شادی ہونے میں چند دن رہ گئے ہیں ـــ سب انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ اس حالت میں والدین یہ کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ وہ اشوک سے بیاہ کر لے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اشوک اُسے بھگا کر لے جائے۔

اشوک والدین کا اکلوتا لڑکا ہونے کی وجہ سے لاکھوں روپے کا بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ اور اس کے باوجود اس کا ذاتی کاروبار بھی چمک رہا تھا۔ بھلا اسے جہیز کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق اسی شام وہ اشوک کے ساتھ پونا سے بھاگ کر دہلی آگئی ـــ یہاں اسے آتے ہوتے تین برس گذر چکے تھے۔ مگر اس طویل عرصہ میں اسے گھر کا کوئی فرد نہیں مل سکا تھا۔ ملتا بھی کیسے ؟ انہیں کیا پتہ تھا کہ کامنی دہلی میں ہے۔ کامنی اگر خط لکھتی تو کچھ بات بھی بنتی ، آج اس نے اتنی مدت بعد اپنے بھائی کیلاش کو دیکھا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی کامنی کے دل میں پاکیزہ اور مقدس محبت کا سیلاب موجزن ہو گیا ـــ اس کے انگ انگ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ـــ مگر اس خوشی کو کچلتا ہوا ایک خوف کا احساس بھی ذہن میں بیدار ہو گیا۔ اشوک کو اگر پتہ چل گیا کہ اس نے قلاش والدین اور اوباش بھائی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اشوک کو فریب دیا ہے تو اس کے دل پر کیا گذرے گی۔ اشوک اس کے والدین کی مفلسی اور

جاتی کی آوارگی نظرانداز کرسکتا ہے ــــ مگر یہ دھوکا ــــ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے ــــ ؟ کیلاش یہاں ضرور آئے گا اور اس کے آنے سے تمام راز فاش ہو جاتے گا۔ یہ سوچتے ہوئے کامنی کا ذہن ماؤف ہو گیا ــــ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل رواں ہو گیا اور گلے میں کانٹے سے چبھنے لگے ــــ وہ بیڈ لیمپ کی دھندلی روشنی میں پانی پینے کے لئے اٹھی۔ میز پر پڑا پانی کا لبریز گلاس اٹھایا۔ اس سے پیشتر کہ گلاس اور ہونٹوں کا فاصلہ طے ہوتا ــــ گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جھنکار پیدا کرتا ہوا چھوٹی چھوٹی بے شمار کرچوں میں تبدیل ہو گیا ــــ کیلاش کھڑکی پھلانگ کر اندر آ رہا تھا۔

"ہشت" اس سے پہلے کہ کامنی کچھ کہتی۔ کیلاش نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر کامنی کو بازو سے پکڑ کر کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگیا۔

کیلاش ــــ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ کامنی کے لہجہ میں گھبراہٹ تھی۔

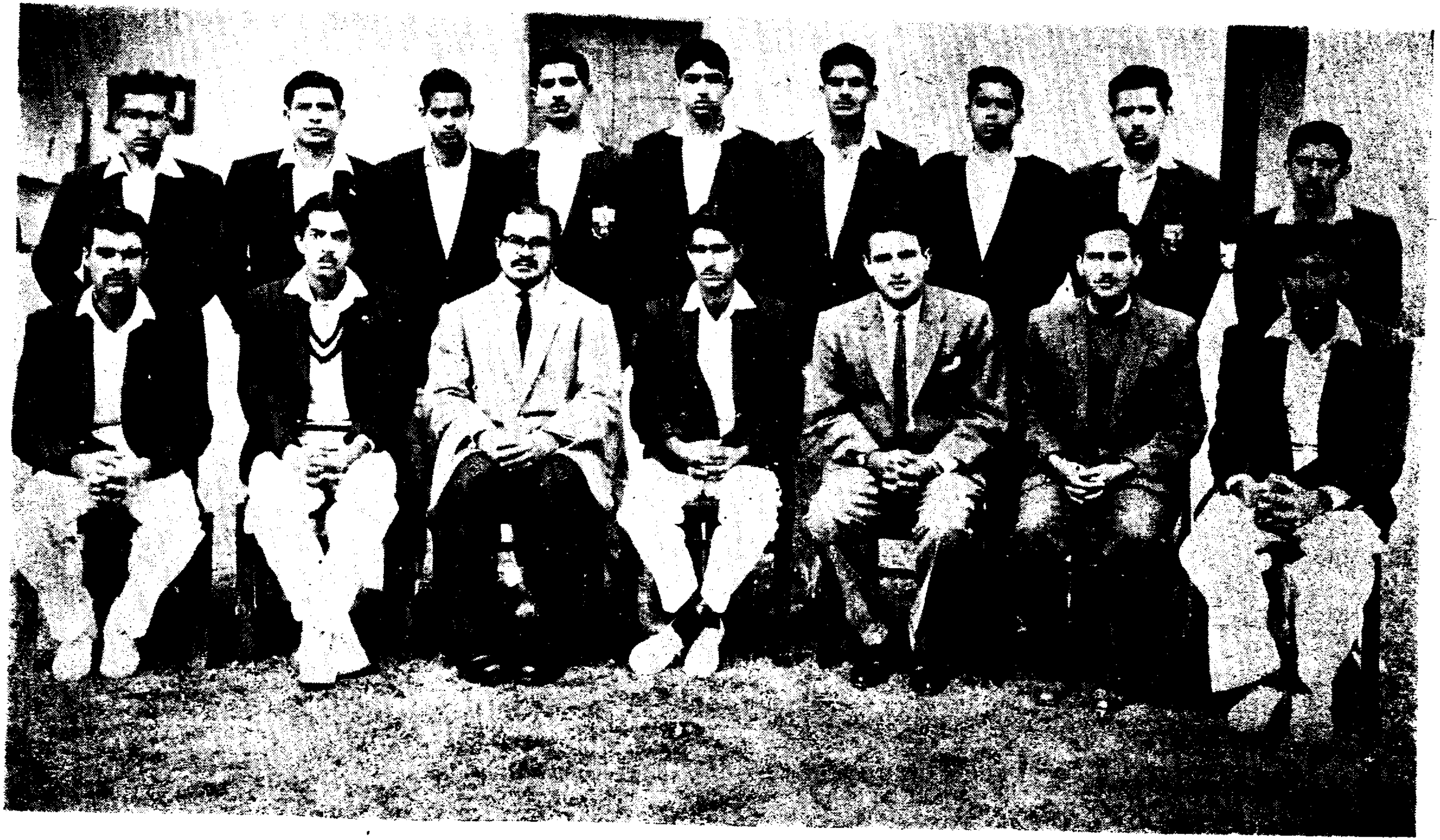
کامنی میں جانتا ہوں کہ میں بدنام ترین شخص ہوں ــــ میری آمد سے تمہاری ازدواجی زندگی میں تاریکیوں کی مہیب گھٹائیں چھا سکتی ہیں ــــ لیکن تم میری بہن ہو کامنی ــــ تمہیں ایک طویل عرصہ کے بعد دیکھ کر میرے دل میں پیار کا فطری جذبہ جاگ اٹھا ــــ میں نے سوچا کہ دن کے وقت تم سے ملنے آؤں ــــ لیکن کامنی ــــ اس لئے رات کو چوروں کی طرح آ دھمکا ہوں۔ کیلاش ــــ کامنی کے سینے میں پاکیزہ جذبات کا سیلاب موجزن ہو گیا ــــ وہ تڑپ کر کیلاش کے چوڑے چکلے سینے سے چمٹ گئی۔ کیلاش کے کانوں میں چارپائی کے چرمرانے کی ہلکی سی آواز آئی اس نے آنکھیں پھاڑ کر کمرے کی جانب دیکھا ــــ کوئی سایہ بیڈ لیمپ کی دھندلی روشنی میں بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ کون ہے ــــ ؟ کہیں یہ ــــ ؟ مگر یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا ــــ کامنی کی زندگی اور موت کا سوال تھا اس لئے کیلاش نے کامنی کو اپنے جسم سے ایک جھٹکے کے ساتھ علیحدہ کیا اور رعب دار آواز میں بولا "بتاؤ زیورات اور نقدی کہاں رکھی ہے ؟"

اس غیر متوقع حملے پر کامنی سٹپٹا گئی ــــ اس نے کہنے کے لئے اپنے لب وا کئے ــــ مگر ایک مانوس اور گرج دار آواز اس کی قوت گویائی سلب کرتی ہوئی ابھری۔

ہینڈز اپ ــــ کامنی نے گھوم کر دیکھا اشوک ہاتھ میں ریوالور لئے کھڑا تھا ــــ کامنی ــــ مقامی پولیس اسٹیشن میں فون کر دو ــــ اشوک نے حکم دیا۔ کامنی لرز اٹھی۔ غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں کیلاش کے متبسم اور شگفتہ چہرے پر جم گئیں ــــ کیا سوچ رہی ہو جلدی کرو ــــ اشوک درشت لہجہ میں بولا ــــ آں ــــ کامنی کی بھیگی بھیگی نگاہیں کیلاش کے چہرے سے لوٹ آئیں، وہ دھڑکتے دل اور ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھی ــــ اور کانپتی انگلیوں سے فون کا ڈائل گھمانے لگی۔

Runner-up Peshawar University Cricket Championship

Govt. College Peshawar Cricket Eleven 1962—63



Sitting:— L to R Zahid Hussain, Saleem Amjad, Prof. M. Ismail Sethi (Principal), Razaullah (Captain), Prof. Qaiser Aminuddin (I/c), Mr. Ataullah (D. P. E.), Rahman-ul-Haque.

Standing:— Riaz Ahmad, Ishfaq Raza, Iftekhar Hussain, Saiful Islam, Hamid Haroon, Yusuf, Matloob-ur-Rauf, Sabz Ali, Mudassir Ali

محمد جاوید اختر۔ سال دوم میڈیکل

کوایجوکیشن

کوایجوکیشن نہ جانے اس لفظ میں کونسی دلکشی ہے کہ لوگ اسے پڑھتے ہی سرور سا محسوس کرتے ہیں۔ بعض لوگ تو اس لفظ کو مسرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر نہ جانے شاہد کو اس لفظ سے کیوں چڑ سی تھی۔ جب وہ اس لفظ کو پڑھتا تو اس کا خون کھولنے لگتا اور اس کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو جاتا۔

آج سے دو سال پہلے شاہد نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ شاہد شہر کی رونقوں سے دُور ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا تھا۔ شاہد کا والد گاؤں کا ایک اچھا زمیندار تھا۔ کافی زمینیں تھیں۔ شاہد کو بہت شوق تھا کہ وہ بھی کسی ایسے گاؤں میں داخلہ لے جس میں کوایجوکیشن ہو۔ چنانچہ شاہد نے بھی شہر کے ایک اچھے سے کالج میں داخلہ لے لیا۔

دن گزرتے گئے۔ شاہد کی کلاس میں ایک لڑکی تھی جس کا نام نجمہ تھا۔ نجمہ بہت ہی بھولی بھالی اور خوبصورت تھی شاہد نے جب پہلی دفعہ نجمہ کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا سبحان اللہ! نجمہ نے جب یہ سنا تو مڑ کر شاہد کو دیکھا اور سر کو ہلاتی ہوئی گزر گئی۔ اس واقعہ کے بعد نجمہ بھی شاہد سے بے تکلف ہوتی گئی۔ وہ دونوں اکٹھے پیریڈوں پر جاتے اور گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے۔

شاہد کا والد ہر مہینے شاہد کو دو سو روپے بھیجتا مگر یہ دو سو روپے تو مہینے کے پہلے دس دنوں ہی میں ختم ہو جاتے۔ ان دس دنوں میں وہ دونوں خوب عیش کرتے مگر جب دو سو روپے ختم ہو جاتے تو نجمہ بھی شاہد کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ گھومتی نظر آتی۔

شاہد کا ایک ہم کلاس نثار تھا۔ نجمہ اکثر نثار کے ساتھ گھومتی نظر آتی تھی۔ نثار گورے رنگ لمبے قد، گھنگریالے بال اور اچھے ڈیل ڈول والا تھا۔ جب کبھی بھی شاہد نجمہ کو نثار کے ساتھ گھومتے ہوتے دیکھتا اس کا خون جوش مارنے لگتا، مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا کیونکہ نثار اس سے طاقت میں بہت آگے تھا۔ شاہد نے نجمہ سے بہت دفعہ اس کی شکایت بھی کی مگر نجمہ اسے باتوں باتوں میں ہی ٹال دیتی۔ جب کبھی بھی شاہد نجمہ کو نثار کے ساتھ دیکھتا تو عہد کر لیتا کہ وہ آئندہ کبھی بھی نجمہ سے منہ نہ لگائے گا مگر جب مہینہ شروع ہونے کو ہوتا تو نجمہ پھر شاہد سے پیاری پیاری باتیں کر کے اُسے پھر راضی کر لیتی اور شاہد پھر تمام روپے نجمہ کے ساتھ عیش میں اڑا دیتا۔

مہینہ ختم ہونے کو تھا اور شاہد پر کالج کا جرمانہ اور کینٹین کا قرضہ بھی تھا اور شاہد نے یہ عہد کر لیا تھا کہ اس دفعہ وہ روپے عیش و عشرت میں نہیں اڑائے گا۔ آج شاہد بہت خوش تھا کیونکہ آج اُسے منی آرڈر موصول ہوا تھا اور وہ ان پیسوں سے قرضہ اور دوسرے جرمانے وغیرہ ادا کر دیگا۔ مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

رات کے تقریباً آٹھ بجے کا وقت تھا۔ اور شاہد سونے کی تیاریوں میں مشغول تھا مگر اس نے سوچا کہ چلو آج سونے سے پہلے کچھ فزکس کا مطالعہ ہی کر لوں پس شاہد نے فزکس کی کتاب اٹھائی اور پڑھنے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا۔ چونکہ آج تقریباً دو ماہ بعد اس نے فزکس کی کتاب کو کھولا تھا مجبوراً اس نے کتاب غصے سے دور پھینک دی اور چارپائی پر لیٹ گیا ابھی وہ سونے بھی نہ پایا تھا کہ دروازہ پر زور سے دستک ہوئی اور نجمہ کی آواز آئی جو کہ دروازہ کھولنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ شاہد جلدی سے اٹھا اور دروازہ کھولا تو دیکھ

کر حیران رہ گیا کہ نجمہ گھبرائی ہوئی اور بال بکھرائے ہوئی سامنے کھڑی تھی ۔ اس سے پہلے کہ شاہد کچھ پوچھتا نجمہ نے گھبرائی ہوئی آواز سے کہا ، شاہد میرے والد کا ویگن سے ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور وہ ہسپتال میں پڑے ہیں اور میں ابھی ابھی وہیں سے آرہی ہوں ۔ مجھے اس وقت دوسو روپے کی سخت ضرورت ہے ۔ شاہد تجھے میرے سر کی قسم مجھے اس وقت دوسو روپے دے دو ۔ شاہد یہ میری موت اور زندگی کا سوال ہے ۔ تجھے معلوم ہے کہ اس دنیا میں میرا میرے والد کے سوا اور کوئی بھی نہیں ۔ شاہد نے طنز کرتے ہوئے کہا نثار جو ہے جاؤ اس کی جا کر منت کرو شاید وہ تمہیں دوسو روپیہ دے دے ۔ نجمہ نے خوشامد کرتے ہوئے کہا اچھے شاہد خدا کی قسم میں تو نثار کو بالکل نہیں چاہتی ، میں تو تم کو پسند کرتی ہوں ، شاہد تم کتنے خوبصورت ہو بھلا میں تمہیں چھوڑ سکتی ہوں ۔ شاہد نے جو نجمہ کے منہ سے اپنی تعریف سنی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا اور فوراً دوسو روپے نکال کر نجمہ کے حوالے کر دیئے اور نجمہ شکریہ ادا کر کے چلی گئی ۔

شاہد تمام رات نہ سو سکا ۔ وہ سوچتا رہا کیا واقعی میں خوبصورت ہوں اور کیا واقعی نجمہ مجھ سے محبت کرتی ہے ، نثار سے نہیں ۔

صبح ہوئی اور جب شاہد کلاس میں پہنچا تو نثار کے دوستوں سے یہ سن کر بہت تعجب ہوا کہ نثار اور نجمہ دونوں پہاڑ سیر کے لئے گئے ہوئے ہیں ۔ شاہد کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا اور اس نے دل میں کہا ، حلوائی کی دکان اور نانا جی کا فاتحہ ! نجمہ کتنی چالاک تھی ، پیسوں کو حاصل کرنے کے لئے اس نے کیسا کھیل کھیلا تھا ۔

اس واقعہ کو تین دن ہوگئے مگر نجمہ ابھی تک نہیں آئی تھی ۔ چوتھے دن جب شاہد کالج کے ہال میں پہنچا تو اس نے نجمہ کو اپنی سہیلیوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا ۔ شاہد فوراً نجمہ کے پاس پہنچا اور اسے ایک طرف لے جا کر کہا ، نجمہ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اتنی چالاک نکلو گی ۔ تم نے دوسو روپے حاصل کرنے کے لئے جو کھیل کھیلا ہے میں اس سے خوب باخبر ہوں ۔ اب خیریت اسی میں ہی ہے کہ مجھے میرے روپے واپس کر دو ۔ نجمہ پہلے تو بوکھلا گئی مگر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولی شرم نہیں آتی کونسے روپے ۔ تم مجھے بھرے ہال میں بے عزت کرنا چاہتے ہو ۔ میں تمہاری پرنسپل سے رپورٹ کر دوں گی ۔ یہ سن کر شاہد کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو اور وہ ہوا میں معلق رہا ہو اور دوسرے ہی لمحہ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اٹھا اور نجمہ کے نازک نازک گالوں پر جا پڑا ۔

یہ شور سن کر تمام ہال اب شاہد اور نجمہ کی طرف متوجہ ہوگیا تھا ۔ آخر کار ان کا مقدمہ سٹاف کے سامنے پیش کر دیا گیا اور شاہد کو تین سال کے لئے کالج سے نکال دیا گیا ۔ جب شاہد کالج کو چھوڑ کر گاؤں جا رہا تھا تو کالج کے در و دیوار سے قہقہوں کی آوازیں دور تک اس کے کانوں میں آرہی تھیں ۔

نور پرویز سال اول سائنس

غم ناگہاں

رات کا خاموش اور خوفناک دیو جاگ چکا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام کائناتِ عالم کو اپنی آغوش میں لے رہا تھا۔ یہی اس کا روز کا معمول تھا اور اس کے ساتھ ساتھ جنرل ہاسپٹل کی گہما گہمی اس کی ہمقدم تھی کیا مجال کہ دونوں کے معمول میں کوئی فرق آجاتے۔ رات گیارہ بجے کے بعد کی ڈیوٹی کے لئے سسٹر شانتی دوسری نرس سے چارج لے رہی تھی۔

T. B. وارڈ بیڈ نمبر ۱۲ کو آج بہت تکلیف رہی (Glucose) دیا جا رہا ہے ...... پہلی نرس سسٹر شانتی کو رپورٹ دے رہی تھی...... اور پھر وہ چلی گئی۔

T. B. وارڈ ایک مشترک وسیع قبر...... جس میں بیسیوں مردے برابر برابر پڑے ہوئے ہیں...... ہاں یہ ایک قبر ہی تو ہے ...... اور ...... اور یہ مریض!! نحیف و نزار زرد رُو ...... یہ زندہ مردے نہیں تو اور کیا ہیں! ...... سسٹر شانتی نے سوچا اور پھر یکبارگی تمام پلنگوں پر نظر دوڑا گئی۔ لیکن پھر اس کی نظر ایک سمت رُک گئی جیسے اس نے اپنی مطلوبہ چیز پالی ہو۔ "نمبر ۱۲" ایک گول سے ٹکڑے پر لکھا ہوا تھا...... اچھا تو یہ ہے وہ مریض...... بے چارہ!!! ایک دم ہی اس کے دل میں رحم کے جذبات امڈنے لگے۔ تمام مریض سو رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے کراہنے کی ہلکی سی گونج کمرے کے سکوت کو توڑ دیتی اور پھر وہی خاموشی۔ سسٹر شانتی ہلکے ہلکے بے آواز قدموں سے ہر مریض کے پاس سے گذرتی ہوئی "بیڈ نمبر ۱۲" پر پہنچ چکی تھی۔

یہ مریض آج ہی داخل ہوئی تھی۔ پچیس چھبیس برس کی جوان لڑکی...... کمزور اور زرد چہرہ، سفید چادر پر ایک بے جان سا مختصر جسم پڑا تھا اور "گلوکوز" آہستہ آہستہ اس کے جسم میں داخل ہو رہا تھا۔ ایک دم ہی اس کے دل میں اندیشہ پیدا ہوا کہ یہ سب تدبیریں بیکار ہیں اس پنجرے کا پنچھی اب آزاد ہو چکا ہے۔ اس کی آہٹ سے بھی جسم میں کوئی ہلکی سی جنبش نہ ہوئی ...... وہ اور نزدیک گئی۔ "گلوکوز" کا سلنڈر ٹھیک کیا۔ نبض دیکھی، اس کا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ زندگی کی ایک ہلکی سی رمق ابھی باقی تھی۔ نبض بہت ہلکی رفتار سے چل رہی تھی وہ اسے غور سے دیکھتی رہی...... اتنی نقاہت میں بھی چہرے کے خدوخال کھوتے ہوتے حسن کا پتہ دے رہے تھے۔ لمبی اور اونچی ناک جو چہرے پر نظر آ رہی تھی۔ لمبی کمانی دار بھویں جو ضعف کی وجہ سے نیچے کو ڈھلک گئی تھیں۔ لمبی لمبی گھنی پلکیں اور سیاہ لہریے دار بال جو اس کے زردی مائل سفید چہرے پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوتے بہت گستاخ معلوم ہو رہے تھے۔ گال بیماری نے پچکا دیئے تھے لیکن پھر بھی وہ بری معلوم نہیں ہو رہی تھی اور...... سسٹر سوچ رہی تھی نامعلوم وہ کیا وجوہات ہیں جن کے باعث اتنی چھوٹی سی عمر میں اس کی یہ حالت ہو گئی۔ نمعلوم کونسا صدمہ پہنچا ہے اسے...... گھر کی تو اچھی ہی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اتنی نازک حالت میں بھی گھر کا کوئی آدمی اس کے ہمراہ نہیں ہے شاید کوئی ہو ہی نہ، اکیلی ہی ہو! عجیب و غریب سوالات اس کے گرد منڈلا رہے تھے، اور وہ ان سب کا جواب لڑکی کے چہرے سے معلوم کرنا چاہتی تھی۔ ایک گھنٹہ...... دو گھنٹے! نہ جانے کتنی دیر وہ یونہی کھڑی رہی۔ سوچا، لیکن کوئی مکمل جواب نہ ڈھونڈھ سکی...... دور کہیں گرجا کے گھنٹے بجنے لگے۔ اس نے اپنی گھڑی پر نظر کی۔ دو بج رہے تھے۔ خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اس کے کان میں آواز گونجی "پانی"

"نمبر ۹" کی مریض پانی مانگ رہی تھی وہ جھٹ پٹی اور پانی پلانے لگی ...... ابھی تو تین گھنٹے باقی تھے ۔ صبح پانچ بجے تک اسے اسی وارڈ میں رہنا تھا ۔ پانی پلا کر وہ پھر لڑکی کے پاس موجود تھی ۔ بے جان جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور پھر ایک کراہ ، اور اس کے ساتھ ساتھ سسٹر شانتی بھی کراہ اٹھی ۔ وہ مریضہ پر جھک گئی ، نبض دیکھی ...... اس وقت قدرے تیز تھی ۔ وہ کسی اور تبدیلی کا انتظار کرتی رہی ، ایک انجکشن دیا لڑکی نے اچانک آنکھیں کھولیں اور ایک کراہ کے ساتھ بند کر لیں ۔ ایک دم ہی اس کے منہ سے نکلا " امی !! جینی !! منو !! .... کوئی نہیں بولتا ..... کتنے سنگدل ہو سب ...... کوئی نہیں آتا ...... منو تم بھی روٹھ گئے اپنی امی سے ... تمہارے ابا بھی روٹھ گئے .... اچھا جاؤ اب ہم بھی نہیں بولیں گے ..... اور نہ جانے وہ کیا کیا ہذیان کہہ رہی تھی ..... اور سسٹر ! وہ منو اور اس کے ابا کے خیالات میں بھٹک رہی تھی ۔ نہ معلوم یہ منو کون ہے ! شاید اس کا لڑکا .... اس کا شوہر کون ہوگا ۔ کتنا سنگ دل ہے وہ بھی ! اتنی حسین بیوی کی یہ حالت بنا دی ..... نہیں ! نہیں ! ہو سکتا ہے اس کی بیماری کی کوئی اور وجہ ہو ! ہو سکتا ہے اس کا شوہر مر چکا ہو ..... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ہو ہی نہ ! لیکن پھر وہ منو ...... ہاں وہ صرف اسی کا بیٹا ہو سکتا ہے ۔ لڑکی کی کراہ پھر سے سنائی دی ۔ اس نے کروٹ بدلی ۔ سسٹر کا تانا بانا ٹوٹ کر رہ گیا اور اسے ایک دم ہی مریض کی طرف پلٹ جانا پڑا ۔ سلنڈر کی نلکی نکل گئی تھی ، اسے ٹھیک کیا اور پھر تکیہ اٹھا کر دائیں طرف رکھا ۔ لڑکی قدرے پرسکون معلوم ہوتی تھی ۔ شاید زندگی کا آخری سنبھالا ہو ۔ شاید یہ سکون کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہو .... نہیں ! نہیں خدا کرے یہ سکون کوئی خوشخبری لاتے ۔ اس بیچاری میں اب کسی طوفان کے سہنے کی قوت کہاں ہے ......

ہائیں یہ کیا ! تکیہ اٹھاتے ہی اس کے منہ سے نکلا .... تکیہ کے نیچے ایک لفافہ پڑا تھا ۔ سسٹر شانتی ایک دم ٹھٹھکی ۔ لیکن پھر اشتیاق کے ساتھ لفافہ اٹھا لیا ۔ شاید یہ ہی کچھ اس کی شخصیت پر روشنی ڈال دے ۔ نہیں کسی کا خط پڑھنا جرم ہے ، لیکن اشتیاق بڑھا اور وہ اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی .... نہ جانے کیوں وہ لڑکی کے ساتھ اتنی ہمدردی محسوس کر رہی تھی ۔ وہ اس کے گذشتہ حالات جاننے کے لئے بیقرار تھی اس نے گھڑی پر نظر کی ، تین بج رہے تھے ، اوہ ابھی تو دو گھنٹے اور باقی ہیں ۔ یہ سوچ کر اس نے لفافہ کھولا اور خط پڑھنا شروع کیا لکھا

"راجی" مجھے معلوم ہے تم اس وقت کہاں ہو ۔ یقین جانو کن کن مصیبتوں کے بعد تمہارا پتہ معلوم کر سکا ہوں ۔ راجی ..... یہ تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے ۔ میں تمہاری زندگی کا ایک ایک ورق پڑھ چکا ہوں ، کس طرح اور کہاں سے ! یہ تمہیں آگے چل کر معلوم ہو جائے گا ۔ پیاری راجی شاید چھ سال پہلے کی وہ بہار تمہیں نہ بھولی ہوگی ۔ میں تمہارے ہاں بغرض تفریح گیا تھا ۔ مجھے افسانوں اور نظموں سے لگاؤ تھا ، اور تم تمہارا بھی تو یہی مشغلہ تھا ۔ تم اپنے ہلکے ہلکے افسانے جو تم نے سب سے چھپ کر اپنی ڈائری میں لکھ رکھے تھے مجھے اصلاح کی خاطر دیتیں اور میں بڑے شوق سے انہیں پڑھا کرتا تھا ..... لیکن تم اس کے ساتھ ساتھ مغرور بھی تھیں ۔ نہ جانے وہ غرور تھا یا حجاب تم نے کبھی میرے لکھے ہوئے افسانوں اور نظموں کی دل کھول کر داد نہ دی ۔ تمہارے باغ میں لگے ہوئے نرگس کے پھولوں پر ایک دفعہ لکھی ہوئی نظم جب سب کو سنائی تھی تو تمہارے والدین کی اتنی ساری تعریف کرنے کے باوجود بھی تم نے صرف یہ الفاظ ادا کئے تھے " اچھی ہے " اور اس سے میری تسلی نہ ہوئی ۔ میں نے غصہ میں وہ نظم پھاڑ کر پھینک دی تھی ۔ تم مجھے غور سے دیکھتی رہیں لیکن کچھ نہ بولیں ۔ شاید میرے پاگل پن پر دل ہی دل میں ہنس رہی ہوگی ۔ رات کو سب کے سونے کے بعد تم نے وہ ٹکڑے اٹھائے تھے اور لیمپ کی مدھم روشنی میں وہ نظم اپنی کاپی میں اتار لی تھی ۔ میں غصے میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا ۔ ہاں میں یہی سمجھا تھا کہ وہ نظم اب اپنے نام سے دوسروں کو دکھاؤ گی ۔ اس لئے صبح اٹھ کر کسی نہ کسی طرح تمہاری کاپی حاصل کر لی اور اس نظم کے علاوہ تمہارے تمام مضامین کے نیچے بھی اپنا نام لکھ دیا اور اسی بات پر تم مجھ سے ناراض ہوگئی تھیں ۔ میں کافی عرصہ تمہارے گھر رہا ، لیکن تمہاری ناراضگی زیادہ ہی بڑھتی گئی ۔ ہو سکتا ہے وہ صرف دکھاوے کی ہو ۔ لیکن میں یہ سوچنے پر مجبور ہو چکا تھا کہ تمہیں مجھ سے نفرت ہے اور اسی لئے میرا دل

اچاٹ ہوگیا۔ میں نے پھر کبھی تمہارے ہاں نہ آنے کا فیصلہ کر لیا اور پھر ایک دن میں چل پڑا۔ جاتے وقت جب میں تمہارے پاس پہنچا تمہاری آنکھوں میں آنسو تھے۔ لیکن تم پیٹھ موڑ کر چلی گئیں اور مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ میں چل پڑا لیکن تمہارے آنسو ...... وہ مجھے سارے راستے پریشان کرتے رہے۔ آخر یہ آنسو کس قسم کے تھے، میرے جانے کی خوشی کے یا ...... اور میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ مجھے آتے ہوئے کافی عرصہ گذر چکا تھا۔ خط وکتابت کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ تم مجھ سے ناراض تھیں۔ ایک دن اتفاق سے میری نظر ایک رسالے پر پڑ گئی اور میں ایک دم ہی چونک پڑا۔ "نرگس کے پھول" یہ تو میری ہی نظم تھی اور نیچے میرا اپنا نام۔ میں حیران رہ گیا کیونکہ یہ میں نے نہیں بھیجی تھی، پھر میرا دل چیخ اٹھا "راجی یہ تم ہی ہو سکتی ہو۔ تمہی نے میری نظم چرائی تھی"! اور پھر میں تمہارے اس عجیب وغریب مزاج کے سمجھانے میں کھو گیا۔

امی بہت دن سے بھائی جان کے لئے کوئی رشتہ تلاش کر رہی تھیں اور آخر ایک دن وہ بھی اپنے گھر میں بہو لے آئیں۔ کتنی خوشیاں تھیں اس دن ہمارے گھر میں سب انتہائی شوق سے دلہن کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ میں بھی دیکھنے لگا، لیکن ایک دم جیسے بجلی کوند گئی..... وہ تم تھیں..... بھائی جان کی دلہن...... اور میری بھابی ...... نہیں نہیں میری تو کچھ بھی نہیں۔ تمہیں تو شاید مجھ سے نفرت تھی..... اصلیت میں میں تمہارے اس پیچیدہ رویہ کو نہ سمجھ سکا تھا۔ نہ معلوم تمہیں واقعی نفرت تھی!!! یا پھر پسندیدگی کو چھپانے کا ایک ذریعہ۔ بہرحال گذشتہ واقعات کی بنا پر مجھے تمہارے سامنے رہنا نہ چاہیے تھا اس لئے کچھ عرصہ بعد چھٹی ختم ہونے سے پہلے ہی حیدرآباد ڈیوٹی پر آ گیا۔

ایک سال بعد منو اس دنیا میں تمہارے اور بھائی جان کے لئے خوشیاں لے کر آیا۔ کتنے اچھے تھے تمہارے وہ دن بھی۔ ہاں! لیکن زمانہ کو شاید یہ سکون یہ خوشی بھلی نہ لگی۔ تقسیم ہند کے باعث ہر جگہ کے قتل وغارت نے آخر تمہارے معصوم پرسکون گھر پر بھی ڈاکہ ڈالا۔ اف!!! وہ وقت بھی تم سے کس طرح دیکھا گیا ہوگا۔ جب معصوم منو اور بھائی جان شہید ہو کر جام کوثر پی رہے تھے۔ لیکن ٹھیک ہے اس میں غم اور خوف کی کیا بات ہے۔ شہادت تو ہر مسلمان کا انتہائی اوج ہے۔ منو اور بھائی جان کو وہ عزت مل گئی...... اور تم سکھوں کے نرغے میں پھنس گئیں وہی چرن سنگھ جو کبھی ہماری خوشامد کرتا نظر آتا تھا۔ اب تمہارے ساتھ زیادتی پر تلا ہوا تھا وہ تمہیں اپنے گھر لے گیا اور پھر تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک ہوا جو اور ہزاروں مسلمان شریف بہو بیٹیوں کے ساتھ روا رکھا گیا تھا تم وہاں کیسے اور کب تک رہیں افسوس مجھے معلوم نہیں۔ ہاں تمہارے اسکول ہی کی ہیڈ مسٹریس سے یہ معلوم ہو سکا کہ تم بھی لڑکیوں کے اس قافلے کے ساتھ پاکستان پہنچی تھیں جو پاکستانی فوج کے ذریعے ہندوؤں اور سکھوں کے چنگل سے چھڑا کر لائی گئی تھیں۔ پاکستان آکر تم نے اسکول میں نوکری کر لی، لیکن اتنے غموں اور تکلیفوں کے بعد تم میں تندرست رہنے کی صلاحیت نہ رہی تم ایک مہلک مرض میں مبتلا ہوگئیں اور اب تمہاری موجودہ حالت ...... یہ سب کچھ مجھے اس استانی سے معلوم ہو سکا ہے، جو یہاں حیدرآباد میں اتفاق سے مل گئی تھی۔ میں بہت جلد تم سے ملنے کی کوشش کروں گا، لیکن تم تو مجھ سے ناراض ہو۔ اچھا خدا حافظ

فقط! "جنید"

اس خط کے نیچے تحریر تھا "پیارے جینی میں تم سے ناراض نہیں، میں تو ہمیشہ سے تمہارا انتظار کرتی رہی ہوں اور میری آنکھیں تمہاری متلاشی، لیکن افسوس تم بہت دیر میں ملے۔ اب وقت ختم ہو چکا ہے۔ شاید موت تمہیں دیکھنے کی بھی مہلت نہ دے۔

فقط! "تمہاری راجی"

سسٹر شانتی کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے، نہ جانے کب تک روتی رہی، اس نے خط لپیٹا لفافہ میں رکھا اور لڑکی کے پاس پہنچی۔ مریضہ آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ بخار ایک سو پانچ سے تجاوز کر چکا تھا۔ اس نے لفافہ آہستہ سے تکیہ کے نیچے رکھا۔ حسرت بھری نگاہ ڈالی اور اس کی صحت کے لئے دعا کرتی ہوئی واپس میز پر آ گئی۔ پانچ بج رہے تھے۔ صبح کی ڈیوٹی والی نرس آئی اور وہ چارج

(باقی صفحہ پر)

عبداللطیف ۔ سال اول فنون

اور میں دیکھتا ہی رہ گیا....

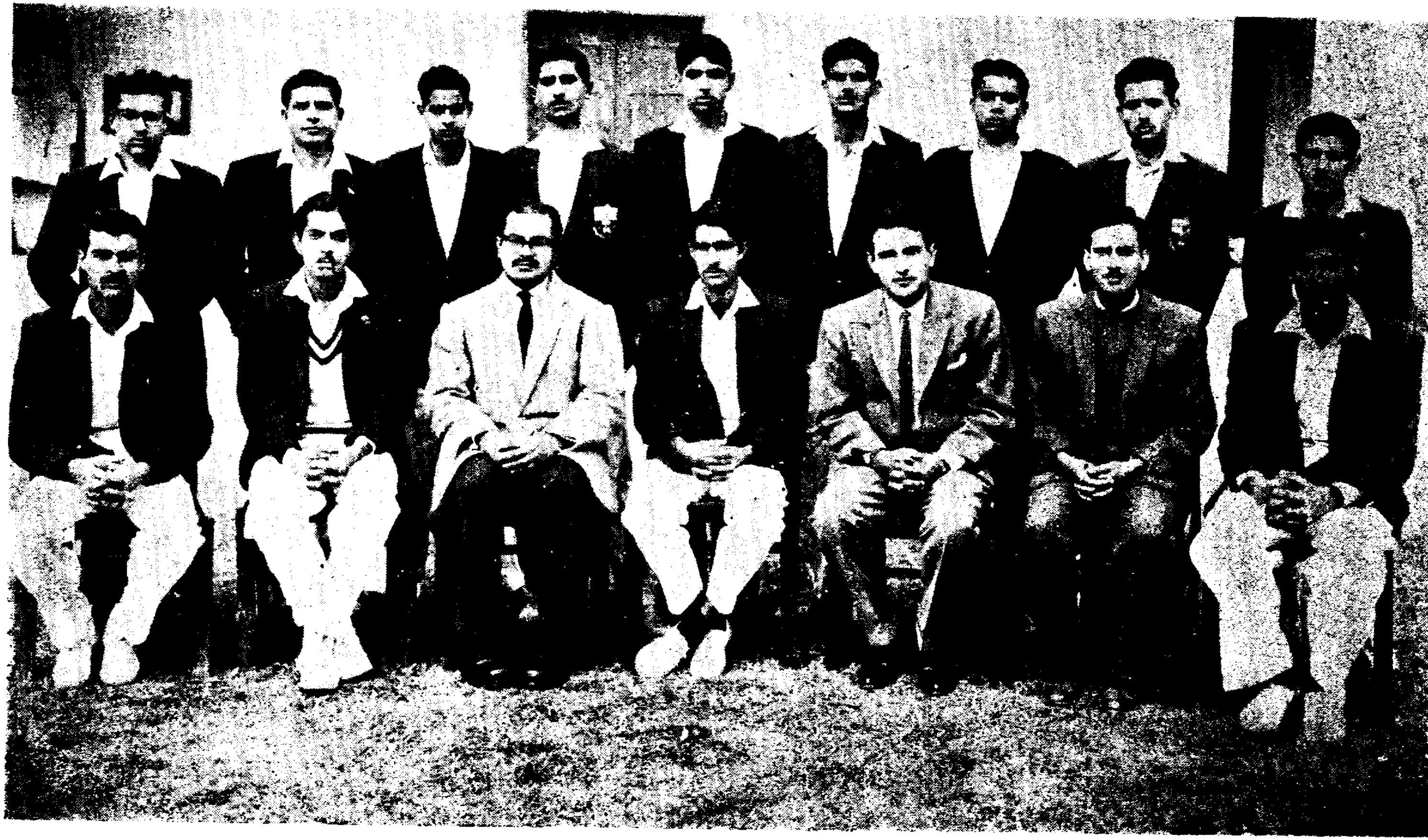
بابو جی : اللہ کے نام پر ......
میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک میلے کچیلے چیتھڑوں میں ملبوس گداگر سامنے کھڑا تھا ..... میں نے جیب سے دونی نکالی اور اس کی طرف بڑھا دی۔

بابو جی کیا میں اخبار پڑھ سکتا ہوں ؛ اس نے یہ کہتے ہوئے میز پر سے "پاکستان ٹائمز" اٹھا کر میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔
بڑے شوق سے ..... میں نے متحیر ہوتے ہوتے کہا اور پھر دل میں سوچنے لگا کہ یہ بھی عجیب قسم کا گداگر ہے، پیسہ پیسہ مانگتا ہے مگر انگریزی اخبار پڑھ لیتا ہے۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے اور میں واقعی اس کی "پراسرار" زندگی کے حالات جاننے کے لئے بیتاب ہو گیا۔

جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑے اطمینان سے اخبار کا مطالعہ کرنے میں مشغول تھا۔
کیا تم تعلیم یافتہ ہو ؛ میں نے آخر اس سے سوال کر ہی ڈالا۔
جی ہاں ...... ؛ اس نے مختصر سا جواب دیا۔
کہاں تک ؛ میں نے پھر سوال کیا۔
بی۔اے تک .... ؛ اتنا کہہ کر وہ پھر اخبار پڑھنے لگا۔
مجھے اس کی اس حرکت پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ کہ میں جو بھی سوال کرتا ہوں اس کا مختصر سا جواب دے کر وہ خاموش ہو جاتا ہے تھوڑی دیر تک اخبار کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے اخبار کو میز پر رکھ دیا اور جانے لگا۔
ذرا سنیئے ..... ؛ میں نے مؤدبانہ طور پر عرض کرتے ہوئے اسے اپنے قریب کرسی پر بٹھا لیا۔ دراصل اس وقت میں اس کی شخصیت سے کافی حد تک مرعوب ہو چکا تھا۔
کیا میں آپ کے متعلق معلومات حاصل کر سکتا ہوں ؛ میں نے سوال کرتے ہوتے اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا....
بابو جی کیا کرو گے میرے حالات جان کر.... ؛
بس یونہی .....
چھوڑو بابو جی آپ لوگوں کا مجھ سے واسطہ ہی کیا ؛
نہیں ..... آپ صرف یہ بتائیں کہ اگر آپ بی۔اے پاس ہیں تو کوئی نوکری کیوں نہیں کر لیتے۔
بابو جی ! اگر میں نوکری کروں تو مجھے زیادہ سے زیادہ تنخواہ تین سو روپے ہی ملے گی نا ! جبکہ صرف مارفیا کے انجکشن کیلئے پندرہ روپے روز مجھے درکار ہوتے ہیں، اور پھر میرا کھانا پینا بھی شامل کریں تو پچیس روپے روزانہ یعنی ساڑھے سات سو روپے

Runner-up Peshawar University Cricket Championship

Govt. College Peshawar Cricket Eleven 1962—63



Sitting:— L to R Zahid Hussain, Saleem Amjad, Prof. M. Ismail Sethi (Principal), Razaullah (Captain), Prof. Qaiser Aminuddin (I/c), Mr. Ataullah (D. P. E.), Rahman-ul-Haque.

Standing:— Riaz Ahmad, Ishfaq Raza, Iftekhar Hussain, Saiful Islam, Hamid Haroon, Yusuf, Matloob-ur-Rauf, Sabz Ali, Mudassir Ali

ماہوار ہو گئے ۔

اب آپ خود ہی بتائیں کہ آج کل بی۔ اے پاس کو کون ساڑھے سات سو روپے تنخواہ دیتا ہے ۔

تو کیا آپ پچیس روپے روزانہ پیدا کر لیتے ہیں ؟ یہ سن کر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔ بڑے بھولے ہیں آپ بھی اگر میرا گذارہ نہ ہوتا تو گداگری کی زندگی پانچ سال تک نہ گذار سکتا۔

اچھا یہ تو بتائیں کہ آپ مارفیا کے انجکشن کس لئے لگواتے ہیں ؟ میں نے پھر سوال کیا ۔

صرف ایک قسم کا نشہ پورا کرنے کے لئے ۔

اس نے بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ۔ کیا کہا ! صرف نشے کے لئے !!

جی ہاں یہ بہت ہی موذی قسم کا نشہ ہے ۔ میں اگر ایک انجکشن کم لگواؤں تو چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو کر رہ جاؤں ۔

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو اس نشے کی عادت کیونکر پڑی ؟

بابوجی ! اگر آپ واقعی حالات جاننا چاہتے ہیں تو لیجئے سنیئے ......

آج سے تقریباً بارہ سال پہلے میں بھی آپ کی طرح کالج کی روح پرور فضا میں کھیلا کرتا تھا کسی قسم کا فکر نہ تھا ۔ میرے والد صاحب ! متمول سوداگر تھے ۔ افغانستان سے میوے کے ٹرک آیا کرتے تھے اور وہ ہندوستان اور دیگر ممالک کو تا ئی کیا کرتے تھے ۔ مختصر یہ کہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد میں والد صاحب کے ساتھ تجارت میں مشغول ہو گیا ۔

کالج کی سوسائٹی میں چند ایک مجھے ایسے دوست ملے جنہوں نے سگریٹ ، شراب ، کلب اور ہوٹل وغیرہ سے روشناس کرایا لیکن میں ایک دوست نما دشمن کو تا عمر نہ بھولوں گا ، جس نے مجھے مارفیا جیسے موذی نشے کی عادت ڈالی ۔ کچھ عرصہ کے بعد والد صاحب کا انتقال ہو گیا ۔ مجھ پر جو چند ایک پابندیاں تھیں ، وہ بھی ختم ہو گئیں ۔ اب میں بالکل آزاد تھا اور روزانہ نئے نئے پروگرام بنتے ۔ میرے دوستوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا ۔ ادھر کاروبار کا نظام درہم برہم ہو گیا ۔ ہمارے ہی ملازموں نے لوٹ کھسوٹ شروع کر دی ۔ کچھ عرصہ کے بعد والدہ ماجدہ بھی انتقال کر گئیں ۔ اب میں گھر میں اکیلا رہ گیا تھا ۔ اس لئے عیاشیوں میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا ۔

لیکن بہار ہمیشہ بھی تو نہیں رہتی ہے جس گلشن نے بہار میں اپنی شان دکھائی ہو ۔ آخر اُس کو خزاں کا بھی مزا چکھنا پڑتا ہے اگلے سال منشی جی نے لاکھوں روپے کا نقصان دکھلا کر عدالت میں دیوالیہ ہونے کی اپیل کر دی ۔

پھر کیا تھا گھر سے بھی بیدخل کر دیا گیا ۔ صرف میرے کپڑے ہی میرا اثاثہ تھا جو میں نے اس وقت پہن رکھے تھے ۔ چند دن آوارہ پھرتا رہا ۔ بھوکا پیاسا کبھی ایک طرف جاتا کبھی دوسری طرف ۔ دوستوں کا کہیں نام ونشان بھی نہیں ملتا تھا اگر بھولے سے کوئی میری طرف دیکھ بھی پاتا تو جلد ہی نظریں پھیر لیتا ۔ مجھے اس وقت ماں باپ کی نصیحتیں یاد آتی تھیں ۔ جبکہ وہ کہا کرتے کہ " بیٹا یار دوست سب پیسے کے ہیں "

مگر میں ایک کان سے سنتا تھا اور دوسرے کان سے اڑا دیتا تھا ۔

خیر میں نے چند ایک ملازمتیں کیں مگر میرا گذارہ نہ ہو سکا ۔ آخر کار ایک بوڑھے سے ملاقات ہوئی جس نے " مجھے اس پیشے سے متعارف کرایا جس سے میں بہت خوش ہوں " اتنا کہا اور چل پڑا ۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ اگرچہ یہ شخص تعلیم یافتہ ہے لیکن اس کا ضمیر مردہ ہو چکا ہے اور پھر میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا ...

تصنیف۔ خوشحال خان خٹک
ترجمہ۔ پروفیسر بشر نعمانی

ثقافتی مدرسہ

وہ احمق ہے

کیا جب انسان کی عادتوں اور خصلتوں پہ بھی غور میں نے
تو میں یہ سمجھا
کہ ہے وہ احمق جو اپنے دشمن کی بات کا اعتبار کرے
اور ایسا انسان بھی ہے احمق
بغیر تلوار کے ہو جس کو سدا ہوس ملک گیریوں کی
ہے وہ بھی احمق جو فخر کرتا ہو اپنی پوشاکِ ظاہری پہ
اور اپنی ہر دم کرے بڑائی
جو مال و دولت نہ خرچ کرتا ہو اپنے گھر کی بھلائیوں پہ
ہے وہ بھی احمق۔
جو بے جگہ اور بے سبب اپنے گھوڑے دوڑا کے دل میں خوش ہو
اور اس کو بھی بے وقوف سمجھو
جو ایسی باتوں کو خان خوشحال کی ذرا اہمیت نہیں دے

ماجدؔ رحدی بی۔ اے (فائنل)

شہنشاہ اکبر

(وہ مسلمان تھا مگر "دیں کا خریدار" نہ تھا)

۱

سوچتا ہوں کہ میں اکبؔر کو کہوں کیوں کافر
جب کہ وہ آپ ہی کہتا ہے مسلمان ہوں میں
خود ہی آئینہ ہے ازبگ کا وہ خط دیکھئے تو
جس میں اکبؔر نے کہا صاحبِ ایمان ہوں میں

۲

یہ بھی تسلیم ہے کہ اس نے کیا دیں پیدا
اور یہ بھی ہے بجا رند تھا میخوار تھا وہ
یہ بھی مانا کہ وہ "کٹر سا مسلمان" نہ تھا
یہ بھی مانا کہ گنہ گار تھا بدکار تھا وہ

۳

آپ اتنا تو مگر سوچیئے نقاد حضرات
اس کی ٹھوکر پہ مچلتے ہوئے دیکھے سیماب
آپ کو مفلسی پینے نہیں دیتی پانی
ہاں مگر پینے کو پیتے ہیں کبھی غم کی شراب

۴

وہ شہنشاہ تھا حالات سمجھتا تھا سبھی
اس نے اک ڈھونگ رچایا تھا سیاست کیلئے
ہندوؤں سے رہے مل جل کے تقاضہ تھا یہی
اور وہ ان سے ملا صرف حکومت کے لئے

۵

آپ کی ایسی نمازوں کا بھلا فائدہ کیا
جن میں اک رنگِ نمائش کے سوا کچھ بھی نہیں
ڈالئے منہ تو ذرا اپنے گریبانوں میں
آپ کے دل میں نہیں خوفِ خدا کچھ بھی نہیں

۶

واعظِ دین ذرا عقل و خرد کام میں لا
مے کشی سے کوئی کافر تو نہیں ہو جاتا
کوئی گر تیری طرح روپ نہ ڈھالے بے شک
"ذاتِ اقدس" سے وہ منکر تو نہیں ہو جاتا

۷

واعظِ دین کی باتوں میں نہ آنا ہرگز!
واعظِ دین بھلا کس کو بھلا کہتا ہے
اپنی باتوں سے جگا دیتا ہے لاکھوں فتنے
باوجود اس کے بھی یہ واعظِ دیں رہتا ہے

۸

ایک روایت ہے ابھی آئینہ بردار ابھی
جو مسلماں کہے خود کو اسے کافر نہ کہو!
اس روایت کو تو کوئی نہیں جھٹلا سکتا
اب مناسب ہے کہ ہرگز اسے منکر نہ کہو

۹

آپ الجھتے ہیں خفی اور جلی میں لیکن
آپ کی طرح وہ جھگڑوں کا طلبگار نہ تھا
خود نمائی تو نہ تھا شیوۂ اکبر ماجد
وہ مسلماں تھا مگر "دیں کا خریدار" نہ تھا

پروفیسر نصر اللہ خان

سلطان محمد تغلق

تغلق آباد کے قریب افغان پورہ کے چوبی محل میں دعوت بمشکل ہی ختم ہوئی تھی کہ آسمان سے بجلی گری اور احمد ایاز میر عمارات کے تعمیر کردہ محل کو پیوند خاک کر گئی۔ اس حادثہ میں سلطان غیاث الدین تغلق اس کے چند اُمرا اور اس کا بیٹا محمود نذر اجل ہوئے۔ یہ واقعہ بمطابق تاریخ مبارک شاہی مصنفہ یحییٰ بن احمد سرہندی ربیع الاول ۷۲۵ھ بمطابق مارچ ۱۳۲۵ء میں پیش آیا۔

اس واقعہ کے متعلق مؤرخین میں اختلاف ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ یہ واقعہ اچانک پیش آیا اور محمد تغلق اپنے باپ کی موت کا ذمہ دار نہ تھا۔ بلکہ مشیت ایزدی ہی یہ تھی کہ بجلی گرے اور چوبی محل کو خس و خاشاک کر جائے اور اس طرح چند اموات واقع ہوں۔ لیکن برعکس اس کے دوسرا خیال یہ ہے کہ چوبی محل محمد تغلق کے اشارے پر میر عمارات نے اس طرح تیار کیا تھا کہ جونہی ہاتھی اس کے قریب آتے جاتیں یہ محل زمین پر آ رہے اور یہ سب کچھ بوڑھے سلطان کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے لئے تھا۔ ضیاء الدین برنی اس واقع کے متعلق صاف طور سے کچھ بھی بیان نہیں کرتا۔ ابن بطوطہ ابوالفضل، یحییٰ سرہندی اور نظام الدین احمد محمد تغلق کو مجرم قرار دیتے ہیں، لیکن فرشتہ بدر جہاں، سید معین الحق اور ڈاکٹر مہدی حسن محمد تغلق کو اس کے باپ کی ناگہانی موت کے لئے مورد الزام قرار نہیں دیتے بلکہ اُسے بری الذمہ ٹھہراتے ہیں۔ ان حالات میں ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی جانب دارانہ دوٹوک رائے کا قبول کرنا کہ "سلطان کی موت ایک سازش کا نتیجہ تھی اور اس سازش کا محرک محمد تغلق تھا۔" ناممکن ہے۔

محمد تغلق کی تخت نشینی کے بعد لوگوں کی وفاداری اور کسی مزاحمت اور بغاوت کا نہ ہونا اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ سلطان محمد تغلق اپنے والد کی موت کا ذمہ دار نہ تھا۔

سلطان محمد تغلق غیر معمولی ذہانت کا مالک اور تخلیقی قوتوں کا حامل تھا۔ ضیاء الدین برنی اور ابن بطوطہ نے اس شخص کے کردار و اطوار پر کافی روشنی ڈالی ہے اور دونوں ہی اس کی قابلیت کے معترف ہیں۔

سلطان نہایت ہی خوشرو، خوبصورت اور قوی الجسم تھا۔ پولو کا بہترین کھلاڑی ہونے کے علاوہ سلطان اعلیٰ درجہ کا نشانہ باز تیرانداز اور شہسواری میں یکتائے زمانہ اور اپنی نظیر آپ تھا۔ سلطان اپنی جرأت قوت اور بہادری میں بہت مشہور تھا وہ رزم و بزم دونوں کا سنگار خیال کیا جاتا تھا۔ مجالس میں اس کی حاضر جوابی اور شائستہ گفتگو اور میدان جنگ میں اس کی شجاعت اور مستقل مزاجی سے ہر شخص واقف تھا سخاوت میں وہ بے مدیل و بے مثل تھا۔ برنی، ابن بطوطہ اور مصنف مالک اس کی سخاوت، مہمان نوازی اور علما پروری کے بہت مداح ہیں۔ دوسرے ممالک سے آتے ہوتے علماء، فقہا، اُمرا اور سلاطین پر وہ خاص طور سے مہربان تھا برنی لکھتا ہے کہ ہر سال ہزاروں امرا دربار میں حاضر ہو کر سلطان کی سخاوت سے مالا مال ہو کر اپنے گھروں کو لوٹتے تھے۔ برنی ہی کا بیان ہے کہ یہ تحائف کے حاصل کرنے والے ان بیش بہا تحائف کے ملنے پر ششدر و حیران رہ جاتے تھے۔ پھر اس کے بعد برنی یہ لکھتا ہے کہ سلطان جود و سخا میں حاتم طائی سے بڑھ کر تھا جو حاتم طائی نے سالوں میں دیا۔ سلطان نے صرف ایک روز میں لٹا دیا۔ عالم

اور پارسا و متقی لوگوں کے لئے بارگاہِ سلطان ملجا و ماوئے تھی۔ ہر سال ہزاروں علماء، فقہا، خدا ترس، خداشناس اور صالح لوگ خراسان، عراق، ترکستان، خوارزم سیستان، مصر اور دمشق سے سلطان کی سیرت و عادت کی شہرت سن کر حاضر دربار ہوتے تھے۔ اور ان میں سے کوئی بھی دل شکستہ یا آزردہ نہیں لوٹتا تھا۔

اگرچہ جشن وغیرہ کے موقع پر سلطان شان و شوکت کا دلدادہ نظر آتا تھا مگر اس کی پرائیویٹ زندگی نہایت ہی سادہ اور پاکیزہ تھی۔ وہ شراب کے پاس تک نہ پھٹکتا تھا اور اسے ان لوگوں سے خاص نفرت تھی جو احکام شریعت کے پابند نہ تھے۔ سلطان کا دربار نہایت ہی دانشمندانہ، بارعب، مہذب اور شائستہ تھا۔ لیکن سلطان کی طبیعت نظم و ضبط کے سلسلہ میں نہایت ہی سخت تھی۔ سلطان کی عاجزی، خاکساری اور انکسار بے مثال تھا۔ سلطان کو اپنی والدہ مخدوم جہاں سے خاص عقیدت تھی۔ سلطان کا سلوک اپنے بھائیوں سے مشفقانہ اور اپنے اُستاد قتلغ خاں سے نہایت ہی مودّبانہ تھا۔ سلطان فقیہوں، عابدوں، نیک اور پارسا لوگوں کی صحبت کا نہایت ہی مشتاق تھا اور ان کے آرام کے سامان مہیا کرنے میں بے حد خوشی محسوس کرتا تھا۔

تمام سلاطین جو دہلی میں سریر آرائے سلطنت ہوئے سلطان ان میں سب سے زیادہ عالم اور باکمال تھا۔ قدرت نے اُسے بہترین حافظہ عطا کیا تھا۔ اس کی معاملہ فہمی۔ اس کی تہ کو پہنچنے والی زود فہم عقل، مختلف علوم کے حاصل کرنے کی استعداد اور غیر معمولی ذہانت ہر انسان کو حیران کر دیتی تھی۔ وہ فنون لطیفہ کا شیدائی، باکمال شاعر، منطقی، فلسفی، منجم، حساب دان اور علم طبعیات کا بہترین عالم تھا۔ اس زمانے کی بہترین علمی تصانیف، سکندر نامہ، تاریخ محمودی، شاہنامہ اور امیر حمزہ کی کہانیاں اس کو ازبر تھیں۔ کوئی شخص فن انشاپردازی میں سلطان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ زمانہ کے بہترین خطیب پرواز خیال، لطافت ذوق اور قدرت زبان میں اس کے سامنے ہیچ نظر آتے تھے۔ اس کا طرز کلام اور اندازِ استدلال نہایت ہی دلآویز تھا۔ وہ فلسفہ کا اس قدر ماہر تھا کہ فلسفی اور فقیہہ اس سے گفتگو کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے۔ مصنف مسالک لکھتا ہے "سلطان اعلیٰ درجہ کا عالم ہے، وہ قرآن اور حدیث کا حافظ ہے۔ اس نے فلسفہ اور منطق پر عبور حاصل کر رکھا ہے۔ وہ بہترین خوشنویس اور اعلیٰ پایہ کا شاعر اور داد شعر خوب دیتا ہے۔ سلطان کی صفات یہاں پر ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ سلطان ایک اعلیٰ پایہ کا طبیب بھی تھا۔ شمس سراج عفیف کے مطابق سلطانؒ ایک عظیم المرتبہ بادشاہ تھا جو ہر فن میں ماہر تھا۔" اس کے علاوہ اس کی خاص خوبی اس کا بے پایاں عدل تھا۔ اکثر مورخین نے اس بادشاہ کو (غلط طور سے) لامذہب، دیوانہ اور خونی بادشاہ کہا ہے اس کا عدل ہندوؤں سے رواداری اور اس کی جدت پسندی در اصل اس کا سب سے بڑا گناہ تھا۔ لوگ اسے سمجھ نہ سکے۔ وہ دراصل اپنے وقت کے لوگوں کی قابلیت سے بہت زیادہ تھا اور اسی وجہ سے اُسے اپنی اصلاحات اور دوسرے منصوبوں میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

پایہ تخت کی تبدیلی کے متعلق سلطان پر بے پایاں الزامات لگائے گئے ہیں حالانکہ حقیقت حال اس سے بالکل مختلف ہے جس کا ذکر ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ ابن بطوطہ اس معاملہ میں قابل یقین نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تبدیلی دارالسلطنت کے وقت وہ ہندوستان میں موجود نہ تھا اور اس کے علاوہ جو کچھ اس نے لکھا وہ محض سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے۔

علاؤ الدین خلجی کے وقت میں ملک کافور نے پہلی بار دکن کو فتح کر کے شمالی ہند کی اسلامی سلطنت میں شامل کیا اس وقت سلطان علاؤ الدین نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہاں کے ہندو حکمرانوں کو ان کے ملک سے محروم کیا جائے بلکہ صرف اس پر قناعت کی کہ ان علاقوں کے ہندو حکمران سلطان کو اپنا فرمانروا تسلیم کریں اور ہر سال خراج سلطان کو بھیجتے رہیں۔ مگر جب سلطنت دہلی کمزور ہوئی، ان راجہ مہاراجوں نے اطاعت سے منہ پھیرا۔ بغاوت کی، اور خراج دینا بند کر دیا۔ سلطان علاؤ الدین کی بیماری

قطب الدین مبارک اور خسرو ملک کی رنگ رلیاں سلطنت کے لئے زہر قاتل ثابت ہوئیں اور اس کے بعد جب سلطان محمد تغلق نے عنان سلطنت سنبھالی تو سلطنت کے جسم پر بغاوت کے ناسور موجود تھے اور ان راجے مہاراجوں کی قوت کا زور تھا اس کا علاج سلطان تغلق نے یہ تجویز کیا کہ راجہ مہاراجوں کو ان کی ریاستوں سے محروم کر دیا جائے اور ان کے علاقوں کو سلطنت دہلی میں شامل کر لیا جائے اور سلطان ان علاقوں پر گورنروں کے ذریعہ سے جو اس کے مقرر کردہ ہوں حکومت کرے مگر یہ اصلاح بھی کامیاب نہ ہوئی کیونکہ اب بغاوت و فساد کا سرچشمہ یہ گورنر تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دکن کا فاصلہ پایۂ تخت سے بہت زیادہ تھا، اور قرون وسطےٰ میں اتنے دور دراز علاقے سے تعلق رکھنا آسان نہ تھا۔ گرشاسپ کی بغاوت نے اس امر کو اور زیادہ تقویت پہنچائی، اس لئے سلطان نے یہ محسوس کیا کہ دارالخلافہ کے لئے کوئی ایسی جگہ چنی جائے جسے سلطنت میں مرکزی حیثیت حاصل ہو اور وہاں بیٹھ کر بادشاہ چاروں طرف آسانی سے توجہ کر سکے۔ سلطان کے اس ارادہ کو مزید تقویت مغلوں کے حملوں سے پہنچی۔ کیونکہ ان کے حملوں کے باعث دلی کو روز خطرہ رہتا تھا اور دلی کی حیثیت اس وقت قلب کی سی تھی۔ اسی وجہ سے سلطان نے دارالسلطنت کے تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے لئے دیوگری کا انتخاب کیا۔ یہ مقام مغلوں کے حملوں کی زد سے بہت دور تھا۔ اس کے علاوہ دیوگری کو سلطنت میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ نیز دکن کی شورشوں کے رفع کرنے کے لئے یہ مقام نہایت ہی موزوں تھا۔

سلطان نے یہ سب کچھ حالات کی ابتری کے باعث کیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ حالات جونہی روبہ اعتدال ہوگئے۔ اس کی ضرورت نہ رہے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور سلطان نے جب دیکھا کہ حالات سنور گئے ہیں۔ وہ واپس دہلی چلا آیا۔

وقائع نگاروں نے زیب داستان کے لئے طرح طرح کی حاشیہ آرائی سے کام لیا ہے اور سلطان پر جائز و ناجائز ہر طرح کے الزام لگائے ہیں اور یہ بیان کیا ہے کہ سلطان نے اہل شہر کو دلی سے دیوگری جانے کا حکم دیا اور دلی کو ویران و تباہ کر ڈالا۔ حالانکہ سلطان نے کبھی بھی ایسا کرنے کا حکم نہ دیا تھا اور دلی کا شہر اسی طرح قائم رہا تھا اس کا ثبوت [illegible] کر سکتے ہیں جو دلی کی ٹکسال سے جاری شدہ ہیں اور یہی سال انتقال دارالسلطنت کا ہے۔ اگر دلی کو مسمار و تباہ کر دیا گیا تھا۔ تب یہ سکے دارالضرب دہلی سے جاری کیسے ہوتے۔ اس واقعہ میں حقیقت صرف اس قدر ہے کہ سلطان اور عمائدین سلطنت کے چلے جانے کے بعد دہلی کی وہ رونق نہ رہی تھی جو کہ سلطان اور اہل دربار کی موجودگی کے وقت تھی اس کے علاوہ باقی سب یاوہ گوئی ہے۔

اسی طرح سلطان کی خارجہ پالیسی کے متعلق بھی طرح طرح کی بہتان تراشیاں کی گئی ہیں اور اس معاملہ میں بھی بعض مورخین نے اسے دیوانہ اور سنکی کہا ہے۔ اس کی وجہ فارسی تاریخوں کے غلط تراجم اور ان مقامات کے ناموں کے متعلق غلط فہمی ہے جن کا ذکر فارسی تاریخوں میں ہے یہاں اس پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اس کا ارادہ ایسے دور افتادہ ملکوں کی فتح کا تھا جیسے چین، تبت، ایران اور خراسان۔ اور یہ دیوانگی نہیں تو اور کیا تھی۔

حقیقت دراصل یہ تھی کہ شاہ مصر اور شاہ ہرات نے منگولوں کے خلاف سلطان سے مدد چاہی۔ سلطان اس امر پر راضی ہو گیا کہ وہ ان دونوں بادشاہوں کی مدد کے لئے فوج روانہ کرے اور تینوں مل کر اس وحشی قوم کو ایران و خراسان وغیرہ سے نکال دیں۔ سلطان اس قوم کے ہاتھوں خود بھی پریشان رہ چکا تھا۔ اس لئے حفظ ماتقدم کے تحت اس نے اس راستے پر اتفاق مناسب سمجھا لیکن جب شاہان مصر و ہرات نے اس مشترکہ سکیم پر عمل کرنے سے انکار کیا تو سلطان نے بھی اس فوج کو جو اس مقصد کے لئے اکٹھی کی گئی تھی منتشر کر دیا۔ مورخین نے اس واقعہ کو سلطان کی ہوس ملک گیری سے منسوب کیا ہے۔ حالانکہ یہ محض ایک بہتان ہے۔ اگر سلطان کا ارادہ ایران پر حملہ کرنے کا تھا تو کونسی چیز مانع تھی کہ وہ ایران پر حملہ نہ کرے۔

اس کے بعد سلطان پر تبت اور چین کے فتح کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ لیکن یہاں بھی برنی اور ابن بطوطہ کی تحریروں کا مطالعہ

کسلے سے یہ حقیقت صاف ہو جاتی ہے اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ چڑھائی کوہ ہمالیہ کے دامن کی ریاستوں پر تھی، جو کہ کانگڑہ کے قریب واقع تھیں۔ اس کے بعد مؤرخین نے سلطان کے سکوں پر ایک طوفان بے تمیزی برپا کیا ہے۔

سلطان کا تانبے کے سکے جاری کرنا لوگوں کی سہولت کے لئے تھا اور ان سکوں کی صورت بالکل آج کل کے نوٹوں کی سی تھی۔ مگر یہاں بھی سلطان کی روشنیٔ طبع اس کے لیئے مصیبت بن گئی۔ پھر بھی اس نے رعایا کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچنے دی اور تانبے کے سکے واپس لے کر ان کے بدلے چاندی اور سونے کے سکے دے دیئے۔

اکثر مؤرخین کا یہ نظریہ کہ سلطان نے مالی مشکلات کے باعث یہ تجربہ کیا تھا، بے حقیقت ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو سلطان پیتل اور تانبے کے سکوں کی بجائے سونا اور چاندی کیسے ادا کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس اصلاح کو سلطان کی دولت کی ہوس سے منسوب کرنا بھی صریحاً غلط ہے۔ اگر اسے سلطان کے معصوم ارادوں کا حسرت ناک انجام کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔

سلطان درحقیقت اس طرح دوآبے کے قحط زدہ لوگوں کی حالت سنوارنی چاہتا تھا اور اس کے علاوہ اس کی یہ خواہش تھی کہ تجارت کو فروغ حاصل ہو۔

دوآبہ کی بغاوت کا باعث بددیانت عمائدین سلطنت تھے۔ یہ صوبہ تمام صوبوں سے زیادہ زرخیز تھا اور یہاں پر لوگ آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر قحط کے ہونے کے باعث لوگوں کی مالی حالت اچھی نہ رہی تھی اور حکومت کے کارندوں نے رعایا کی تکالیف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مالیہ اکٹھا کرنے میں سختی برتی، جس کا نتیجہ بغاوت میں نمودار ہوا۔ سلطان نے اس بغاوت کو سختی سے فرو کر دیا، اور بعد ازاں جب اُسے لوگوں کی بری حالت اور قحط کے متعلق معلوم ہوا تو اس نے چھ ماہ تک لوگوں کو غذا مفت تقسیم کی اور زمینداروں اور کاشتکاروں کو قرضے دیئے تاکہ وہ زمین کاشت کر سکیں، مگر یہاں بھی بددیانت حکومت کے کارندوں نے سلطان کی نیک خواہشات کے پورا ہونے میں روڑے اٹکائے۔

اس بغاوت کے فرو کرنے میں سلطان پر سختی اور ظلم کا الزام لگایا گیا ہے اس کی وجہ فارسی تواریخ کا لفظی ترجمہ ہے۔

سلطان کا آخری زمانہ بغاوتوں سے پُر تھا۔ اس فساد کی بنا سلطان کا بے لوث عدل تھا ان بغاوتوں کی وجہ سلطان کے اپنے الفاظ میں یہ تھی "میں لوگوں کو سزا اس لئے دیتا ہوں کہ وہ حکومت کے دشمن اور نمک حرام ہیں حالانکہ میں نے روپیہ پانی کی طرح بہایا ہے لیکن پھر بھی میں اپنے چاروں طرف دشمنی اور ناشکرگزاری کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتا۔ میں ان لوگوں کو خوب پہچانتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ وہ سلطنت کے مخالف اور امن و امان کے دشمن ہیں" سلطان کو ان بغاوتوں سے بہت دکھ پہنچا تھا اور اس کیفیت کو سلطان نے برنی سے اس طرح بیان کیا ہے "میری سلطنت مریض ہے اور کسی علاج سے بھی صحت مند نہیں ہوتی۔ حکیم دردِ سر کا علاج کرتا ہے تو بخار آ جاتا ہے اور اگر بخار کو رفع کرتا ہے تو کوئی اور مرض آن لگتا ہے"

ان الفاظ پر غور کرنے سے سلطان پر خون آشامی اور ظلم کا الزام غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ دراصل سلطان باغیوں اور مفسدوں کو عبرت آموز سزا دینی چاہتا تھا۔ لیکن اس کا مدعا یہ کبھی نہ تھا کہ بے گناہ لوگوں کو کسی قسم کی تکلیف پہنچائی جائے۔ آخر سلطان یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ سلطنت ختم ہو جائے اور وہ بیٹھا ہوا جلال الدین خلجی کی طرح مجرموں کو سزا دینے کی بجائے شرعی احکام پہ پکڑ دیتا رہے۔ وہ حکمران تھا دَرویش نہ

آخر انہی بغاوتوں کو فرو کرتے کرتے سلطان ۲۰ مارچ ۱۳۵۱ء کو راہیٔ ملک عدم ہوا۔

یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ سلطان محمد تغلق ایک فرض شناس، دانشمند مدبر اور اولوالعزم حکمران تھا اس نے قرونِ وسطیٰ

(باقی صفحہ ۹۹ پر)

پروفیسر فقیر نیاز احمد

پُراسرار کرۂ ہوائی

موسم کی محبوب صفت تلون مزاجی سے کون واقف نہیں۔ انسان تو اس کی ان اداؤں کو ہزاروں سال سے برداشت کرتا چلا آرہا ہے۔ موسم مہربان ہوا تو ہم نے بارش کی چھم چھم اور نسیم سحری کے خوشگوار جھونکوں کا لطف اُٹھایا، جفا کاریوں پر اترا تو خوفناک طوفانوں اور خشک سالی نے قیامت برپا کر ڈالی۔ دراصل ان سب مظاہر کا سرچشمہ وہ پراسرار کرۂ ہوائی ہے جو زمین کے گرداگرد کئی میلوں تک خلا میں پھیلا ہوا ہے۔ ہوا ہمیں نظر نہیں آتی۔ لیکن ہم اس کو ہر دم محسوس کرتے ہیں۔ ہوا کا ہر سانس حیوانات اور نباتات کے لئے زندگی کا پیغام لاتا ہے، اس کے بغیر یہ دنیا محض ایک ویرانہ ہوتی۔ یہی نہیں، بلکہ ہماری خوراک اور ہمارے ملبوسات میں ہوا کے بیشتر عناصر شامل ہیں۔ ہوا بارش لاتی ہے، ہوا آگ جلاتی ہے اور کئی طرح پر یہ ہماری مفید خدمات سرانجام دیتی ہے۔ اس کے سہارے سمندروں میں بادبانی کشتیاں چلتی ہیں اور سینکڑوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوائی جہاز پرواز کرتے ہیں۔ غرضیکہ یہ سب ہوا کا اعجاز ہے، جو بے رنگ، بے بو اور غیر مرئی ہے۔

کرۂ ہوائی ۲۵۰۰ میل سے بھی پرے تک خلا میں پھیلا ہوا ہے۔ البتہ جوں جوں ہم اوپر جاتے ہیں ہوا لطیف سے لطیف تر ہوتی جاتی ہے۔ ۵ میل کی بلندی پر کل ہوا کا نصف حصہ نیچے رہ جاتا ہے اور ۵۰ میل کے بعد تو ہوا کا دباؤ بے معنی سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ویسے سطح سمندر پر ہوا کا دباؤ ۱۴٫۷ پونڈ فی مربع انچ ہوتا ہے۔

ہوا کئی عناصر کا آمیزہ ہے۔ سطح زمین کے قریب اس میں آبی بخارات اور خاکی ذرات شامل ہوتے ہیں جن کی مقدار موسمی حالات کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہے لیکن خشک ہوا میں مختلف گیسوں کا تناسب یکساں رہتا ہے۔ اس میں ۷۸ فیصد نائٹروجن، ۲۰ فیصد آکسیجن، ۱ فیصد آرگان اور ۰٫۰۴ فیصد کاربن ڈائی آکسائڈ گیس ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ بہت قلیل مقدار میں نی آن، ہیلیم، ہائیڈروجن اور اوزون گیسیں بھی پائی جاتی ہیں۔

ابھی تک بالعموم یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زمین سے چند میل کی بلندی کے بعد ہوا بتدریج لطیف اور ٹھنڈی ہو کر فضائے بسیط میں مدغم ہو جاتی ہے اور اس کے جملہ خواص میں سوائے اس بات کے کہ مختلف گیسوں کا تناسب کم و بیش ہو جاتا ہے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے سائنسی چھان بین نے ان نظریات میں انقلابی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اب یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ بالائی ہوا کی ساخت بے حد پیچیدہ ہے جس کی کئی منزلیں ہوں۔ واقعی کرۂ ہوائی مختلف تہوں میں بٹا ہوا ہے اور ہر ایک تہہ اپنی جداگانہ خصوصیات کی حامل ہے۔

کرۂ ہیجان (Troposphere) سطح زمین سے اوسطاً سات میل کی بلندی تک پھیلا ہوا ہے، اور اس میں ۷۵ فیصد ہوا بلحاظ کثافت موجود ہے۔ اس کرہ میں درجۂ حرارت ۳٫۶ درجہ فارن ہیٹ کے لحاظ سے ہر ہزار فٹ کی بلندی کے بعد کم ہو جاتا ہے۔ موسم کی تمام کرشمہ سازیاں اسی خطہ میں جنم پاتی ہیں۔ خواہ وہ بلاخیز طوفان ہوں یا گردباد، بارش ہو یا برفباری، دھند ہو یا کہر۔ اس کرہ کے بالائی حصوں میں درجہ حرارت ۶۷ – درجہ فارن ہیٹ ہوتا ہے۔

کرہ سکون (Stratosphere) ۷ میل سے ۵۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے جس میں غیر معمولی طور پر سکون رہتا ہے اور کسی قسم کی ہیجانی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔

کرہ سکون کی سب سے دلچسپ چیز اوزون گیس کی موجودگی ہے جو ۲۰ اور ۲۷ میل کے درمیانی طبقوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ گیس اس قدر لطیف ہے کہ اگر اس پر دباؤ ڈال کر اسے عام ہوا کی کثافت پر لایا جائے تو یہ تہہ صرف تین ملی میٹر یا ایک انچ کا آٹھواں حصہ ہوگی۔ اوزون گیس ایک فلٹر یا فلٹر کا کام دیتی ہے اور سورج کی بالا بنفشی شعاعوں کو جذب کر لیتی ہے۔ اوزون گیس کی عدم موجودگی میں بالا بنفشی شعاعیں ہماری جلد کو جھلسا کر بالآخر ہماری تباہی کا باعث بنتیں۔ اس کے برعکس اگر اوزون کی تہہ کچھ زیادہ دبیز ہوتی ہو تو ہم کئی عوارض میں مبتلا ہوتے۔ کیونکہ ان بالا بنفشی شعاعوں کا کچھ حصہ ہماری بقاء کے لئے بہت ضروری ہے۔

جب ہم آکسیجن کا ذکر کرتے ہیں تو ہم درحقیقت اس آکسیجن کا نام لیتے ہیں جس کا ایک سالمہ (Molecule) آکسیجن کے دو جوہروں سے مرکب ہے اوزون گیس کا ہر سالمہ آکسیجن کے تین جوہروں کا حامل ہوتا ہے۔ آئیے ذرا دیکھیں کہ قدرت کے کارخانہ میں اوزون گیس کس طرح ہر وقت بنتی اور بگڑتی رہتی ہے۔

۱۲ اور ۲۰ میل کی بلندی پر ہوا اس قدر لطیف ہو جاتی ہے کہ وہاں پہ آکسیجن کے سالمے ایک دوسرے سے کافی دور دور پائے جاتے ہیں۔ اور شمسی شعاعوں کی توانائی کے زیر اثر اپنی ہیئت بدلتے رہتے ہیں۔

آکسیجن + شمسی توانائی = جوہری آکسیجن + جوہری آکسیجن اب آکسیجن کا ایک جوہر جب عام آکسیجن کے سالمے سے ٹکراتا ہے تو اوزون معرض وجود میں آتی ہے۔

جوہری آکسیجن + عام آکسیجن = اوزون

اوزون گیس سورج کی روشنی میں بہت غیر مستحکم ہوتی ہے اور سورج کی بالا بنفشی شعاعوں کو جذب کر کے دوبارہ آکسیجن اور جوہری آکسیجن میں تبدیل ہو جاتی ہے، یا جوہری آکسیجن سے مل کر عام آکسیجن بن جاتی ہے۔

اوزون + جوہری آکسیجن = آکسیجن + آکسیجن

اس طرح پہ اوزون اور آکسیجن کے بناؤ بگاڑ کا سلسلہ ۲۰ اور ۴۵ میل کے درمیان ہر وقت جاری رہتا ہے اور اسی وجہ سے یہاں پہ درجہ حرارت ۱۵۰ درجے فارن ہیٹ پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شہاب ثاقب جب اوزون کے گرم خطہ سے ۹۰,۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گزرتے ہیں تو وہ اپنے سامنے کی ہوا کو اس درجہ دبا دیتے ہیں کہ درجہ حرارت کی شدت انہیں پگھلا کر بھسم کر دیتی ہے۔

کرۂ روانیت (LoNiSED LAYER) ۱۹۰۲ء میں دور فاصلے کے ریڈیائی پیغامات کی ترسیل کے وقت دریافت ہوا۔ ۵۰ میل سے زائد بلندی پہ ہوا بہت لطیف ہو جاتی ہے اور اشعاع شمسی کے زیر اثر اس کے جوہر جلد برق موصل بن جاتے ہیں جس کی وجہ سے روانیت کا عمل الیکٹرون کی بھاری مقدار جمع کر دیتا ہے۔ ان برقی جوہروں کی موجودگی میں مختلف طوالت کی ریڈیائی لہریں مختلف بلندیوں سے زمین کی طرف واپس مڑتی ہیں ۴۰ — ۳۷ میل کے درمیان کے علاقہ کو طبقہ (D-LAYER) کہتے ہیں جو ریڈیو کی لمبی لہروں کو آگے جانے سے روکتا ہے۔ یہاں پر درجہ حرارت ۷۰ درجے رہتا ہے۔ ۶۰ — ۸۰ میل پر طبقہ (E-LAYER) واقع ہے۔ جہاں ۳۰۰ درجہ کی حرارت پائی جاتی ہے۔ یہ طبقہ ۴۰ — ۳۰۰ میٹر کی ریڈیائی لہروں کو زمین کی طرف واپس موڑ دیتا ہے۔ ۹۰ — ۲۵۰ میل کی بلندی پر طبقہ (F-LAYER) پایا جاتا ہے۔ جو ریڈیو کی چھوٹی لہروں کو واپس کرتا ہے۔ اگر روانیت کی یہ تہیں موجود نہ ہوتیں تو دور فاصلہ کی ریڈیائی پیغام رسانی ناممکن ہوتی۔ طبقہ ف کی انتہائی بلندی پر درجہ حرارت ۲۰۰۰ درجہ فارن ہیٹ تک بڑھ جاتا ہے۔

سردار احمد بی۔ اے۔ سال دوم

مسلمان سائنس کے میدان میں

ساتویں صدی عیسوی سے لے کر گیارھویں صدی عیسوی تک کا زمانہ مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ جس میں مسلمان اوجِ ثریا پر گامزن تھے اور علمی اور عملی میدان میں دنیا کی تمام قوموں سے آگے تھے۔ تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، موسیقی اور علم الافلاک وغیرہ میں مسلمان کافی دسترس حاصل کر چکے تھے۔ تاریخ میں ابنِ بطوطہ، المسعودی، البیرونی، ابن الخطیب اور ابنِ خلدون کے نام قابلِ ذکر ہیں۔
اسی طرح جغرافیہ میں الخوارزمی، البیرونی، الادریسی اور قطب الدین وغیرہ ایسے نام ہیں کہ دوست سے لے کر دشمن تک سب ہی ان کی قابلیت کے گن گاتے ہیں۔

ریاضی تو گویا ہی مسلمانوں کی ایجاد، ابن ابراہیم، الخوارزمی، الجندی، ابن یونس، جابر اور عمر خیام ریاضی کے اولین عالم مانے جاتے ہیں تقریباً یہی حال علم الافلاک، موسیقی اور دوسرے علوم کا ہے۔ مختصر یہ کہ کوئی ایسا علم نہ تھا کہ جس میں مسلمانوں نے پہل نہ کی ہو۔ اگر تمام باتوں کو زیرِ بحث لایا جائے تو مضمون طویل ہو جائے گا۔ اب اصل مضمون کی طرف آتے ہیں۔ یعنی مسلمانوں نے سائنس میں کہاں تک ترقی کی۔

کیمسٹری میں سب سے پہلے الرازی کا نام آتا ہے کہ جس کا انتقال ۹۲۳ء میں ہوا۔ الرازی کی کتاب "کتاب الاسرار" کا آج بھی انگریزی اور لاطینی زبانوں میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب علم کیمیا کی بہترین تصنیفات میں سے ہے۔

الرازی کے بعد دوسرا نمبر الجابر کا ہے۔ اس نے علم کیمیا میں بہت سی نئی چیزوں کا اضافہ کیا۔ مثلاً عمل تبخیر، عمل تحلیل وغیرہ۔ اگرچہ الجابر نے اکسیر کیمیا کو عمل نہیں کیا تو تکمیل کے قریب ضرور پہنچا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جابر کے نظریات اور خیالات کو اٹھارویں صدی تک یورپ کے سائنس دانوں نے اپنایا تھا۔

مسلمانوں نے فزکس کی بھی بڑی خدمت کی ہے۔ نویں صدی میں ایک مسلمان سائنس دان نے فزکس پر بہترین کتابیں لکھی تھیں، جو نہ صرف مشرق میں بلکہ مغرب میں بھی بہت مقبول ہوئیں۔ ان کتابوں کے ترجمے انگریزی اور لاطینی زبانوں میں کیے گئے اور بڑی مدت تک درس گاہوں میں رائج رہیں۔ گیارھویں صدی میں ایک انگریز فزکس اور ریاضی کی تعلیم کے لیے سپین گیا اور جب واپس آیا تو اس نے انہی نظریات کا پرچار کیا جو اس نے سپین سے حاصل کیے تھے۔

علم نباتات یعنی باٹنی میں بھی مسلمان کچھ پیچھے نہیں تھے۔ انہوں نے قرطبہ اور قاہرہ میں مختلف پودوں کے ذخیرے جمع کیے تھے اور ان کے جنسی امتیازات معلوم کرنے کے لیے کافی تجربات کیے تھے۔

فنِ زراعت میں ابوزکریا یحییٰ کی کتاب "کتاب الفلاح" ازمنہ وسطیٰ کی بہترین تصنیفات میں سے ہے۔

اسلامی دنیا کا سب سے بڑا ماہر نباتات ابن البیطار تھا۔ اس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں گزارا تھا۔ انہی چیزوں کے متعلق بعد میں اس نے دو کتابیں بطور یادگار چھوڑیں۔ ان کتابوں میں اس نے ایسے ایسے پودوں کا ذکر کیا ہے کہ اس سے پہلے دنیا ان کے متعلق جانتی ہی نہیں تھی۔

عمومی طور پر عرب سائنس دانوں نے علم نباتات سے متعلق تقریباً دو ہزار ایسے نئے پودے دریافت کئے کہ جن کے متعلق یورپ ابھی پہلے کچھ نہیں جانتا تھا۔

علم حیوانات میں بھی مسلمانوں کا پلہ ہمیشہ بھاری رہا۔ اسلامی دنیا کا سب سے بڑا ماہر حیوانات الدمیری تھا جو مصر کا رہنے والا تھا اور جس نے ۱۴۰۵ء میں انتقال کیا۔ اس کی کتاب "حیات الحیوان" کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ مسلمانوں نے اپنے زمانے میں طب کی بڑی خدمت کی اور ان تمام علوم سے زیادہ کی جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی یورپ کے ڈاکٹر عربوں کے دیئے ہوئے پرانے اصولوں اور قاعدوں پر عمل پیرا ہیں۔

نویں صدی کے شروع میں خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں بغداد میں طب کا ایک بہت بڑا مکتب قائم تھا اور پھر تھوڑی ہی مدت بعد طب پر سینکڑوں ایسی کتابیں لکھی گئیں کہ جن کا بعد میں یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور اس طرح سے رفتہ رفتہ یہ علم جو مسلمانوں کی میراث تھا۔ یورپ میں منتقل ہوتا گیا۔ اسلامی طب کا عظیم ترین دور الرازی سے شروع ہوتا ہے۔ وہ ایک بہت بڑا فاضل طبیب تھا۔ اگرچہ وہ طب کے علاوہ دیگر علوم میں بھی ماہر تھا لیکن اس کی صرف طبی تصانیف کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔

ایڈورڈ براؤن لکھتا ہے "الرازی مسلمان طبیبوں میں بہت بڑی شخصیت کا مالک ہے اور اپنی تصنیفات کی بدولت مسلمانوں میں افضل مانا جاتا ہے"

ویسے تو مسلمانوں نے طب میں بہت زیادہ عالم پیدا کئے لیکن ان سب میں جس شخص کو کافی شہرت نصیب ہوئی وہ ابن سینا ہے کہ جس کا انتقال ۱۰۳۷ء میں ہوا۔ انسائیکلو پیڈیا کے مصنف نے ابن سینا کی بڑی تعریف کی ہے۔

ابن سینا کی ایک کتاب "قانونِ شیخ" طب کی ایسی مستند کتاب ہے کہ جو بارھویں صدی سے لے کر سترھویں صدی تک مغرب میں میڈیکل کے طالب علموں کو بطور نصاب کے پڑھائی جاتی تھی۔ یہ کتاب مغرب میں اتنی مقبول ہوئی کہ پندرھویں صدی کے آخر تک لاطینی زبان میں اس کے پندرہ ایڈیشن شائع ہوئے۔ اسی کتاب کے بعض حصوں کا ترجمہ لندن میں ابھی ابھی ۱۹۳۰ء میں چھپا تھا۔

ابن الخطیب ہی نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ بعض بیماریاں متعدی ہوتی ہیں۔ اس چیز کو ثابت کرنے کے لئے اس نے ایک مستقل کتاب لکھی۔

ایک مشہور مورخ اپنی کتاب "ترقیٔ انسانیت" میں لکھتا ہے "یورپ میں بیکن عملی سائنس کا بانی مانا جاتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت نہیں ہے کیونکہ اس نے سب کچھ عربوں سے حاصل کیا تھا۔ بیکن نے تو صرف مسلمانوں کے علوم کی اشاعت کی تھی نہ کہ وہ ان علوم کا بانی تھا۔ اس بات کا بیکن نے خود بھی کئی دفعہ اقرار کیا تھا کہ یورپ کی سائنس عربوں کی سائنس کی مرہونِ منت ہے۔

مختصر یہ کہ یورپ کی سائنس دراصل مسلمانوں ہی کی سائنس ہے۔ مسلمان جب کمزور ہوگئے تو یورپ نے ان سے وہ تمام چیزیں حاصل کر لیں کہ جن کی بدولت وہ دنیا میں چمکے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ سائنس مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیرس کی یونیورسٹی کے طب کے شعبے کے ایک بڑے ہال کی دیواروں پر آج بھی الرازی اور ابن سینا کی تصویریں لٹکی ہوتی ہیں۔ جو اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ الرازی اور ابن سینا علم طب کے اولین عالم تھے۔

صابر حسن خان۔ سال اول میڈیکل

قیامت (ایک سائنسدان کے خیال میں)

"ہر شئے کو تین مرحلوں یعنی (۱) وجود (۲) عروج اور (۳) زوال کو طے کرنا پڑتا ہے"۔ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جسے سائنس اور مذہب دونوں تسلیم کرتے ہیں۔ "اس ہر شئے" میں ہماری زمین بھی شامل ہے۔ جیسا کہ واضح ہے زمین پہلا مرحلہ عبور کر چکی ہے دوسرا مرحلہ یعنی "عروج" اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ تیسرا مرحلہ یعنی "زوال" نہ آجائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "زوال کب آئے گا؟" آئیے! دیکھتے ہیں سائنس اس بارے میں کیا کہتی ہے۔

قیامت آنے کی چند صورتیں ہو سکتی ہیں، ممکن ہے کسی زمانے میں کوئی مہلک بیماری وبا کی صورت اختیار کرے اور ہماری طبی سائنس اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ نتیجتاً تمام دنیا موت کی پیٹ میں آجاتے یا پھر کوئی ایسا حادثہ پیش آئے جس کے سبب یہ دنیا نیست و نابود ہو جائے۔ مثال کے طور پر آج سے کئی لاکھ سال پہلے زمین کی محوری گردش اتنی تیز تھی کہ اُسے اپنے محور کے گرد ایک چکر پورا کرنے میں صرف چار گھنٹے لگتے تھے۔ لیکن ذرا موجودہ مثال لیجئے۔ زمین کو محور کے گرد ایک چکر پورا کرنے میں چوبیس گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔ یعنی موجودہ دن گذشتہ دن سے نسبتاً چھ گنا بڑا ہے۔ یعنی زمین کی محوری گردش کے دوران رفتار گذشتہ رفتار کے مقابلے میں صرف $\frac{1}{6}$ رہ گئی ہے۔ اگر رفتار میں یہ کمی اسی طرح جاری رہی تو ہو سکتا ہے کہ کروڑہا سال بعد زمین اپنی رفتار بالکل کھودے جس کے سبب زمین کو سورج میں پیوست ہونے میں صرف آٹھ منٹ درکار رہیں گے اور اس کے بعد زمین جل بھن کر خاک ہو جائے گی۔ ہماری زمین کا تمام دار و مدار سورج کی حرارت اور روشنی پر ہے۔ سورج کی حرارت کا اندازہ لگانے کے لئے ہمیں زمین سے لے کر سورج تک برف کا ایک مینار جس کا قطر سوا دو میل ہو کھڑا کرنا پڑے گا اور جب یہ مینار تیار ہو جائے تو اسے سورج کی حرارت سے پانی بننے میں صرف ایک سیکنڈ اور بھاپ بننے پر آٹھ سیکنڈ درکار رہیں گے۔ ویسے سائنس کی اصطلاح میں سورج کے مرکز میں درجہ حرارت °F ۷......۰ سات کروڑ درجے فارن ہائیٹ (سترمین ڈگری فارن ہیٹ) ہے لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی حرارت سورج میں کس طرح پیدا ہو جاتی ہے۔

سورج میں جو عظیم مقدار ہائیڈروجن کی پائی جاتی ہے اس ہائیڈروجن کے ایٹم ٹوٹ پھوٹ کر ہیلیم گیس میں پیدا ہو رہے ہیں۔ اس تبدیلی سے وہ بے پناہ حرارت اور روشنی پیدا ہوتی ہے۔ جس سے کہ ہم مستفید ہو رہے ہیں۔ اور جب کبھی کروڑہا سالوں کے بعد ہائیڈروجن کی مقدار ختم ہو گئی تو یہ زمین بوڑھے آدمی کی طرح دم توڑ دے گی۔

ایک اندیشہ یہ بھی ہے کہ ہو سکتا ہے جیسا چاند کا حشر ہوا وہی ہمارا ہو، یعنی لاکھوں سال پہلے چاند میں ہوا کی کافی مقدار موجود تھی لیکن یہ ہوا آہستہ آہستہ بیرونی خلا میں شامل ہو گئی اور اس وقت وہاں کوئی ذی حیات نہیں۔ کوئی شک نہیں زمین بھی چاند والا سبق دوہرائے۔

زمین کے خاتمہ کے بارے میں ایک اور اندیشہ یہ بھی ہے کہ لاکھوں سالوں بعد یہ خشکی کٹ کٹ کر بہہ جائے اور موجودہ "خطہ زمین" خلا آپ بن جائے۔ اس بات کی چند بہت واضح مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً کافی عرصہ نہیں گذرا جب کہ افریقہ، ایشیا، امریکہ، یورپ، فرانس

اور برطانیہ آپس میں ملے ہوئے تھے۔

کسی زمانے میں جہاں آج کل اطلانٹک ٹھاٹھیں مار رہا ہے وہاں افریقہ کے جنگلات جیسے گھنے جنگلات پائے جاتے تھے، اس زمین پر ایسا دور بھی گزرا ہے جبکہ جنوبی افریقہ، جنوبی امریکہ اور آسٹریلیا آپس میں بالکل ملے ہوئے تھے۔ لیکن آج تو نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ خاتمہ زمین کے متعلق سب سے بڑا اندیشہ سائنسدانوں کی نظر میں یہ ہے کہ مبادا سردی کی زیادتی اس حیات کو ختم کر دے پچھلے چار لاکھ سال میں چار مرتبہ برفانی دور گذر چکا ہے۔ زمین کا دس فیصد اس وقت بھی برف کی تہوں کے نیچے دبا ہوا ہے۔ آئندہ برفانی دور کے متعلق پتہ چلتا ہے کہ تیس ہزار عیسوی میں خطِ استوا کے علاقوں میں ناقابل برداشت گرمی پڑے گی، اور اس گرمی کے سبب اس کرۂ ارض کی تمام برف بڑی تیزی سے پگھلنا شروع ہو جائے گی جس کے سبب سے دنیا میں پانی کی سطح میں سو فٹ کی زیادتی واقع ہو جائے گی اور پھر ۵۰۰۰۰ء اور ۹۰۰۰۰ء میں بالترتیب دو برفانی دوروں کا آغاز ہوگا جس کے سبب پانی جمنا شروع ہو جائے گا، اور شمالی دنیا ایک میل موٹی برف کی تہہ کے نیچے جم جائے گی، اور باقی دنیا میں قیامت خیز خنکی کی لہر اٹھے گی۔

ہو سکتا ہے کہ "تیسری جنگ عظیم" کے ذریعے اس زمین کا خاتمہ ہو جائے، لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ امریکہ کو دیکھئے اگر ایک طرف وہ کمیونسٹ بلاک کے خلاف راکٹ اور میزائل تیار کر رہا ہے تو دوسری طرف اپنی حفاظت کے سامان بھی کر رہا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس نے اب تک .... ۸ یعنی اسی ملین "زمین دوز ایٹمی پناہ گاہیں" بنائی ہیں جن میں کروڑوں انسان ایٹمی جنگ چھڑنے کے وقت بالکل محفوظ ہو کر رہ سکتے ہیں۔ کوئی بھی نظریہ لے لیجئے یہ طے ہے کہ زمین کو ابھی "بہت بڑے عرصے" تک کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ اور سائنس جس رفتار کے ساتھ ترقی کر رہی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صرف دس سال کے اندر اندر انسان کو کامیابی سے چاند پر اتار دے گی اور پھر اگر کوئی خطرہ لاحق ہوا تو انسان کسی سیارے کو پرواز کر جائیں گے۔

زمانہ کی یہ گردش جاودانہ
حقیقت ایک تو باقی فسانہ
کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا
فقط امروز ہے تیرا فسانہ

(اقبال)

پروفیسر شرر نعمانی

غزل

اے مرے بھولنے والے مجھے اتنا تو بتا ٭ کیا یہی ہے مری اک عُمر کی یادوں کا صلہ
تجھ سے مل کر یہی محسوس ہوا ہے جیسے ٭ تیرے ملنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا
محفلِ یار سے اٹھنے کو تو اٹھا لیکن ٭ کبھی درماندۂ منزل کی طرح بیٹھ گیا!
جانے کیوں دیر سے خاموش ہیں اربابِ جنوں ٭ نہ وہ آہوں کا دھواں ہے نہ سلاسل کی صدا
وہ تو سو طرح سے مائل بہ کرم ہیں لیکن ٭ دل ہی ان کے ستمِ خاص کے قابل نہ رہا
ہائے کس منہ سے کہوں ضبط کا یارا ہے مجھے ٭ آج بھیگی ہوئی پلکوں نے بھرم کھول دیا
عام تھی دعوتِ مینا و مے و جام مگر! ٭ ہم نے جب ہاتھ بڑھایا تو فلک ٹوٹ پڑا

ان کا دامن بھی ہے اب اشکِ وفا سے گُریز
اِس کو کہتے ہیں شررؔ جذبۂ تاثیرِ وفا

ماجد سرحدی - بی - اے سال دوم

غزل

میں نے تم سے پریم کیا تھا برسوں پہلے صدیوں پہلے
مول کوئی آزار لیا تھا برسوں پہلے صدیوں پہلے

○

آج بھی ان نازک ہاتھوں کی خوشبو گل سے آتی ہے
گل کا دامن کس نے سیا تھا برسوں پہلے صدیوں پہلے

○

آج بھی دل کی بستی میں ہاں! کیف و اثر کا عالم ہے
پینے کو اک جام پیا تھا برسوں پہلے صدیوں پہلے

○

اُس ہی کرن سے آج بھی راہی اپنی منزل پاتے ہیں
راہ گذر میں کوئی دیا تھا برسوں پہلے صدیوں پہلے

○

اپنی باتیں بھولنے والے شاید تجھ کو یاد نہیں
اُس پہ تیری کوئی جیا تھا برسوں پہلے صدیوں پہلے

○

آج بھی دیکھو عارضِ گل میں سرخی رقصاں ہے لیکن
ہم نے اپنا خون دیا تھا برسوں پہلے صدیوں پہلے

○

آج تلک ماجد سرحدی اس پر قائم ہے اے دوست
اس نے جو پیمان کیا تھا برسوں پہلے صدیوں پہلے

○

انورؔ فاروقی سال دوم فنون

غزل

میں ناراض ہوں تم سے جانِ تمنا مجھے تم منانے کی کوشش نہ کرنا
ہمیشہ مجھے تم نے دھوکا دیا ہے مگر اب بنانے کی کوشش نہ کرنا
ہم سے نہ جھوٹی محبت جتاؤ یہ باتیں کسی اور کو جا سناؤ!
چلے جاؤ ظالم بڑے سنگدل ہو مرے پاس آنے کی کوشش نہ کرنا
نہیں بولوں گا تم سے اب زندگی بھر نگاہِ کرم اب نہ ہو بندہ پرور
جلاتے رہے تم ہمیشہ مرا دل مگر اب جلانے کی کوشش نہ کرنا
محبت ہے کیسی مصیبت خدایا مجھے رات دن خوں کے آنسو رلایا
خدا کی قسم میں بہت رو چکا ہوں مجھے اب رلانے کی کوشش نہ کرنا
ہمیشہ تمہاری محبت میں تڑپا تمہارے لیے اپنا سب کچھ گنوایا
اگر بن پڑے تو میں جان بھی لٹا دوں مجھے آزمانے کی کوشش نہ کرنا

تمہیں اب تو کچھ ہوش آیا ہے انور بہت اس نے الفت میں تم کو رلایا
تمہیں اس نے دل سے بھلایا ہے لیکن اُسے تم بھلانے کی کوشش نہ کرنا

محمد خالد۔ سال دوم۔ فنون

غزل

حسن کے اے مغرور خداؤ
عشق ہے آتش بھول نہ جاؤ

صحرا صحرا ذرے روشن
گلشن گلشن دیپ جلاؤ!

من میں امنگیں جاگ اٹھی ہیں
روپ بدل کر اب نہ آؤ

دل لے کر کیوں توڑ نہ دو تم
ہاتھ لگا ہے سستے بھاؤ

جب کہ وفا کا نام ہے عنقا
اہل جفا کو دل میں بساؤ

غم سے ہے رونق بزم جہاں کی
خوشیوں کو تم آگ لگاؤ

خالد بزم سخن میں آ کر
اپنا سکہ کچھ تو جماؤ!

ابرار حسین خلیل بی اے سال اول

غزل

نہ ہو پاسِ چمن جس کو چمن کا پاسباں کیوں ہو
جو ہو ناواقفِ منزل امیرِ کارواں کیوں ہو

وفاداری ہے شرطِ اولیں آئینِ الفت میں
جو چاہے غیر کو پھر وہ ہمارا رازداں کیوں ہو

خلوص ہے ریا کو واسطہ کیا نام و شہرت سے
جو مٹ جائے وفا میں اس کا پھر نام و نشاں کیوں ہو

جہاں میں صرف میں ہی تو نہیں ہوں ایک بدقسمت
لٹا ہے راہ میں جو، وہ مرا ہی کارواں کیوں ہو

گراتی ہو جہاں بجلی جفا سے آسماں ہر شب
وہاں اس شاخ پہ آخر ہمارا آشیاں کیوں ہو

یہ پرسچ ہے داستانِ شوق سجدوں ہی سے بنتی ہے
مگر سجدوں کا مرکز اک اسی کا آستاں کیوں ہو

وہ روٹھے ہیں تو روٹھیں ہم زباں ہیں ہم بھی غالب کے
"بہک سر زن لگے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو"

حبیب اللہ صادق سال دوم سائنس

غزل

تصورات کی دنیا بساتے بیٹھا ہوں
خزینہ ہائے محبت لٹاتے بیٹھا ہوں

تصورات کی دنیا میں محو ہوں اتنا
کہ اپنے آپ کو دل سے بھلائے بیٹھا ہوں

کسی حسین کا چہرہ ہے سامنے میرے
اسی کو قبلہ و کعبہ بنائے بیٹھا ہوں

میں میکدے کی بہاروں کو دیکھ کر ساقی
تمہارے جام پہ نظریں جمائے بیٹھا ہوں

نہ جانے کیا ہے وفا ان کو کیا خبر اس کی
میں جن کی راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھا ہوں

سفینہ گرچہ تلاطم میں ہے مرا- لیکن
میں ناخدا سے امیدیں لگائے بیٹھا ہوں

پہنچ ہی جاؤں گا منزل پہ ایک دن صادق
اگرچہ راہ کے نقشے مٹائے بیٹھا ہوں

شبیر الحسن جمیل سال دوم فنون

غزل

کوئی ہنگامہ بھی برپا نہ ہوا میرے بعد
میکدے میں کوئی طوفان نہ اٹھا میرے بعد
تختۂ مشق نہ کوئی بھی بنا میرے بعد
وہ بھی اکثر رہے محروم حنا میرے بعد
حسن منت کشِ آدابِ جنوں رہتا ہے
ان کو احساس ہوا بھی تو ہوا میرے بعد
کون ہوگا متحمل شبِ غم کا آخر!
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد"
جب ساقی کی ہوس تشنۂ تکمیل رہی
سنگِ در کو نہ ملی کوئی جلا میرے بعد
کس کا دم خم ہے جو ہر چوٹ پہ خاموش رہے
ختم ہے شیوۂ تسلیم و رضا میرے بعد
میں ہی شبیر رہا واقفِ حصولِ منزل!
کوئی صحرا میں نہیں آبلہ پا میرے بعد

عطاء الرحمٰن عارف سال دوم سائنس

اللہ مالک ہے

دکھ سہتا جا خوش ہوتا جا انجام کا اللہ مالک ہے
ہر صبح کا اللہ مالک ہے، ہر شام کا اللہ مالک ہے
میخانہ کی قسمت جاگ اٹھے ساقی جو پلا دے نظروں سے
ہر رند کا اللہ مالک ہے، ہر جام کا اللہ مالک ہے
نظروں کو جما ہمت کو بڑھا قدموں کو نہ ہونے دے ڈگمگ
اے راہی منزل دور نہیں ہر گام کا اللہ مالک ہے
اے ذوقِ نظارہ ہوش رہے لے چشمِ تمنا وا رہنا
اب برقِ تجلے کوندیگی ہاں بام کا اللہ مالک ہے
آتی ہیں بہاریں آئیں گی عنوان گریباں کیا ہوگا
کچھ زور نہیں دیوانے کا ہر کام کا اللہ مالک ہے
گیت اسکی حمد کے اے عارف تو اپنی دھن میں گاتے جا
امید پہ دنیا قائم ہے، انعام کا اللہ مالک ہے

آغا کفیل صدیقی - بی اے - سال اول
نائب صدر بزم اُردو

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا!

انسانیت کا مطلب ہے انسان کی وہ خاص صفت جس کی وجہ سے وہ انسان کہلاتا ہے ویسے تو انسان حیوان ہے۔ اس کو حیوانِ ناطق بھی کہا جاتا ہے۔ انسان کا حیوانِ ناطق ہونا اس کے انسان ہونے کی دلالت نہیں کرتا۔ اس کا ناطق ہونا صرف اس کو حیوان سے الگ کرتا ہے مگر اس طرح اس میں انسانیت کی صفت شامل نہیں کی جاسکتی۔ دراصل انسانیت کا مطلب اس سے کتی گنا بلند ہے جس کو آسانی سے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ انسانیت ایک خاص صفت ہے جو ہر ایک انسان میں نہیں ہوتی ہے، اس کو ہم ایک جذبہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ انسانیت انسان سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ انسانیت سے انسان بنتا ہے اس طرح ہر ایک انسان "انسان" نہیں ہوسکتا۔ انسانیت کو ہم دوسرے لفظوں میں ضمیر بھی کہہ سکتے ہیں جو ہر ایک انسان میں ہوتا ہے خواہ اس کا اثر انسان کے اوپر بہت زیادہ ہو یا بالکل ہی مدہم ہو۔ موخرالذکر صورت میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا ضمیر مردہ ہے دراصل ضمیر مردہ نہیں بلکہ خفتہ ہوتا ہے اور یہ انسان کی پستی کو روکنے کے لئے عین وقت پر شدت سے نمودار ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسے انسان بھی ہوتے ہیں جن میں انسانیت نام کو بھی نہیں ہوتی، وہ انسان کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ ایک شخص ڈاکے ڈالتا ہے قتل کرتا ہے ہم اس کو انسان نہیں کہتے کیونکہ وہ بنی نوعِ انسان کا دشمن ہے۔ انسانیت ہی وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات کا لقب عطا فرمایا۔ انسانیت انسان کی روح کی بلندی کا دوسرا نام ہے ہم اس شخص کو انسان ماننے پر تیار ہو سکتے ہیں، جو دوسرے انسانوں کو اپنے جیسا انسان سمجھتا ہو۔ ان کے دکھ درد سے آگاہ ہو ان کے لئے اپنے دل میں ہمدردی اور درد رکھتا ہو۔ جو ایک ننگے کو دیکھ کر اس کی مدد کر سکے، بھوکے کو کھلا سکے، یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ سکے، مصیبت زدہ کی حالت پر جس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہوں۔ کیا وہ شخص انسان کہلانے کا مستحق ہے جس کی لاکھوں کی کپڑے کی دکان کے سامنے ایک شخص سردی سے اکڑ کر مر جاتا ہے۔ کیا وہ شخص انسان ہے جو اپنے عیش و آرام کی خاطر اناج کی ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کرے اور لوگ فاقے کر کرکے مریں۔ کیا وہ شخص بھی انسان ہوگا جس کی کار کے نیچے مزدور آجاتے اور وہ اس کو چھوڑ کر اس لئے بھاگ جاتے کہ اس کی چالیس ہزار کی گاڑی خراب ہو جائے گی۔ کیا ایک "انسان" ایک انسان کو اپنے سامنے مرتے دیکھ سکتا ہے ہرگز نہیں، وہ انسان نہیں بلکہ جانور سے بھی بدتر ہے۔ اگر آپ کسی کوے کو مار دیجئے کچھ ہی دیر میں بیسیوں کوے فریاد کرتے ہوئے جمع ہو جائیں گے اس لئے کہ وہ "جانور" ہیں۔ اور آپ اس لئے "انسان" ہیں کہ آپ ایک معمولی جنگ میں ہزاروں کا خون بہا دیتے ہیں اس لئے اشرف المخلوقات ہیں کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے اور خون پیتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی کسی درندہ کو اپنی نوع کے دوسرے درندہ کو ہلاک کرتے دیکھا ہے؟ نہیں حالانکہ وہ حیوان کہلاتے ہیں ان میں عقل کا شائبہ تک موجود نہیں اور اس کے علاوہ انمیں حیوانیت پائی جاتی ہے۔ کیا اپنے تاج کو برقرار رکھنے کے لئے ہزاروں لوگوں کو مروا دینے والا بادشاہ حیوانیت کے درجے سے بلند ہو سکتا ہے! انسانیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے فرائض مکمل طور پر انجام دے اور بنی نوعِ انسان کی خدمت کرتا رہے۔ خدا نے جب انسان کو اشرف المخلوقات بنایا تو اس کو کئی فرائض بھی سپرد کئے خدا نے خود فرمایا ہے کہ مجھے ان سے پیار ہے جو میرے بندوں سے پیار کرتے ہیں۔

چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق — آدمی کا آدمی دشمن، خدا کی شان ہے

آجکل کی دنیا میں انسان انسانیت سے کوسوں دور ہے۔ وہ اپنے فرائض سے غفلت برت رہا ہے جو بحیثیت ایک انسان کے اس پہ عائد ہوتے ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم میں جاپان پر جو ایٹم بم گرائے گئے ان سے لاکھوں آدمی ہلاک ہوئے، کیا یہ بنی انسان کی خدمت ہو سکتی ہے۔ آجکل کے دور میں انسان قوموں مذہبوں اور حلقوں میں اس طرح منتشر ہو کر رہ گیا ہے کہ وہ اپنی اصلیت کھو بیٹھا ہے وہ اپنی انسانیت گنوا بیٹھا ہے۔ وہ اب انسان نہیں۔ وہ بلکہ انگریز، امریکی، روسی، پاکستانی بن گیا ہے۔ اب وہ انسان نہیں بلکہ ہندو سکھ عیسائی مسلمان بن کر رہ گیا ہے۔ کہیں گورے کالے کا نسلی تعصب ہے تو کہیں مذہبی، اور تو اور ایک ہی ملک میں لوگ صوبائی اور ضلعی امتیاز برتتے ہیں۔ شہری اور غیر شہری کا سوال اٹھایا جاتا ہے۔ مذہبوں میں ہزاروں فرقے پیدا ہو گئے ہیں۔ لوگ تمام امتیازات سے الگ ہو کر انسان کی خدمت نہیں کر سکتے، حالانکہ انسانیت سب سے بڑی عبادت ہے۔ کیا ایک شخص جو ایک ماں کی فریاد پر چلتے ہوئے مکان سے اس کے بچے کو بچا لاتا ہے اس شخص سے جو کہ اپنے ہم وطن اور ہم مذہب بھائی کو بھوکوں مرتے دیکھ کر منہ موڑ لیتا ہے۔ زیادہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے کیا امن کے نام پر ایٹمی اسلحہ کی موجودہ دوڑ میں حصہ لینے والے انسان کہلا سکتے ہیں، کیا یہ انسانیت کے دوست ہیں کیا ایک دوسرے کی دشمنی اور اپنے وقار کی خاطر ایٹمی جنگ کی تیاریاں کر کے اس کو امن کا نام دینے والے ممالک انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔ کیا وہ انسان ایسے ہی تھے جنہوں نے میدان جنگ میں مرتے ہوئے پانی سے اپنے ہونٹ تر کر لینے کی بجائے اپنے ساتھیوں کو یکے بعد دیگرے پانی بھجوایا اور جب آخری سپاہی کے انکار پر پانی پھر ان کو پیش کیا گیا تو وہ اس عالم فانی کو چھوڑ چکے تھے مگر انسان بننا بھی آسان کام نہیں ہے صرف وہی انسان صحیح انسان ہے جو تمام امتیازات سے بالاتر ہو کر انسانیت کی خدمت کرے اور جس کا ضمیر مکمل طور پر زندہ ہو بقول حالی

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا — مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے اور اپنی اصلیت کی طرف واپس لوٹ جائے۔ اپنے فرائض صحیح طور پر سرانجام دے۔ موجودہ زمانے کی ایٹمی دوڑ امن عالم کے لئے کئی سال سے خطرہ بنی ہوئی ہے اور کوئی ملک بھی اپنی طرف سے تخفیفِ اسلحہ کے لئے تیار نہیں ہے۔ مشہور زمانہ برطانوی فلاسفر برٹنڈرسل اس جنگ کو روکنے کے لئے کوئی بھی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، اس کی طرف سے دنیا بھر میں بڑی طاقتوں کے خلاف مظاہرے ہو چکے ہیں مگر فریاد انسان سے کی جاتی ہے حیوان سے نہیں۔ نام نہاد امن کی سلامتی کے لئے اس معتبر فلاسفر کو پچھلے دنوں سزائے قید بھی مل چکی ہے مگر انسانیت کے وفاداروں کے لئے یہ سختیاں جھیلنا تو معمولی بات ہے۔ برٹنڈرسل کہتا کہ بڑی طاقتیں مجھ کو یقین دلا دیں کہ ایٹمی جنگ اب نہیں ہوگی اور میں چین سے مر جاؤں گا انسان اپنی نیکی اور پارسائی کی وجہ سے فرشتہ بھی ہو سکتا ہے بقول شاعر

جانور آدمی فرشتہ خدا — آدمی کی ہیں سینکڑوں قسمیں!

لیکن وہ شخص انسان نہیں کہلا سکتا کیونکہ اس کے دل میں انسانی ہمدردی نہیں ہے

ہو فرشتہ بھی تو نہیں انسان — درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں

صلاح الدین ایوبی انور۔ سال دوم فنون

طلبائے کے فرائض

انسان کی زندگی میں جو مختلف ادوار آتے ہیں ان میں سے پہلے اٹھارہ بیس سال فارغ البالی کے ہوتے ہیں۔ دانشمندوں نے بچپن کے زمانے کو بے فکری کا زمانہ کہا ہے جو انسان کی زندگی کا سب سے اچھا زمانہ خیال کیا جاتا ہے۔ بچپن اور نوعمری کے زمانے میں ایک نوعمر کو جتنے بھی مسائل پیش آتے ہیں ان کے حل کے متعلق اسے ایک لمحہ بھی سوچنا نہیں پڑتا کیونکہ ان مسائل کا ان کے والدین کو اچھی طرح علم ہوتا ہے اور وہ لڑکے کو مطلع کئے بغیر حل کر دیتے ہیں۔ لڑکے کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنے والدین کو اس امر سے آگاہ کر دے کہ اسے کن چیزوں کی ضرورت ہے

موجودہ ترقی یافتہ دور ہی میں نہیں بلکہ ہر زمانے میں حصول علم کو انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ اہم مقام حاصل رہا ہے، یہ اور بات ہے زمانہ قدیم میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت تھوڑی رہی ہے یا صرف متمول اور خوشحال طبقہ یا جسے بادشاہ وقت کی قربت حاصل ہوتی تھی وہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان ادوار میں غریب اور نیچی نظر سے دیکھے جانے والے لوگوں کو اگرچہ تعلیم سے قریبی تعلق نہ رہا، لیکن ان خاندانوں میں بھی ایسے ایسے افراد پیدا ہوتے ہیں جو تعلیم حاصل کرنے کے بعد بڑے بڑے مفکر اور فلسفی بنے۔ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ علم حاصل کرو چاہے تمہیں اس کے لئے اپنے ملک سے انتہائی دور ملک میں علم کے لئے کیوں نہ جانا پڑے۔

جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا دنیا کے ہر خطے میں تعلیم پھیلتی گئی۔ ہر طبقہ یہی چاہتا تھا کہ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جائے۔ کیونکہ یہی ایک ایسی دولت ہے جو ہمیشہ انسان کے پاس رہتی ہے اور کبھی رائیگاں نہیں ہوتی۔

پاکستان جیسے ملک میں جو تعلیم کے میدان میں یورپ اور امریکہ سے بہ لحاظ تناسب بہت پیچھے ہے۔ حصول تعلیم کو زیادہ مقدم سمجھا گیا، اور اس کے لئے یہ کوشش کی جانے لگی کہ زیادہ سے زیادہ بچے سکول میں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے جائیں۔ اس طرح لوگ اپنے بچوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اسکولوں اور کالجوں میں تعلیمی غرض سے بھیجنے لگے جس سے حکومت نے نئے نئے تعلیمی ادارے قائم کئے۔ تعلیمی اخراجات میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا اور معاشرے کے ہر طبقہ کے افراد کو اس سلسلہ میں ساری سہولتیں حاصل ہونے لگیں۔ لیکن ان سہولتوں کا خاطر خواہ فائدہ اسی وقت اٹھایا جا سکتا ہے جب طلباء اپنی ذمہ داریوں کو اور فرائض کو محسوس کریں اور اپنے اندر ایک ایسا جذبہ پیدا کریں جس کا مقصد صحیح معنوں میں تعلیم حاصل کرنا ہو۔ مناسب ہوگا اگر اس موقعہ پر ہم ان ذمہ داریوں اور فرائض کا جائزہ لیں جو طلباء پر عائد ہوتی ہیں اور جن سے عہدہ برآ ہو کر وہ ملک کے مفید شہری بن سکتے ہیں۔ سب سے پہلی ذمہ داری طلباء کی یہ ہونی چاہئیے کہ وہ اپنا تمام تر دھیان تعلیم حاصل کرنے پر دیں اور دوسرے امور سے جو ان کو حصول تعلیم میں مدد نہیں دیتے یا جن کا تعلق تعلیم سے نہیں ہے ایک بڑی حد تک لاتعلق ہو جائیں، طلبا کو جتنا وقت ملتا ہے وہ مطالعہ میں صرف کریں۔ ظاہر ہے اس میں ہر وہ مطالعہ شامل ہے جو نصاب سے تعلق رکھتا ہے یا جو طلبا کی ذہنی قابلیت اور معلومات کے لئے ضروری ہے، یا جس سے طلبا کو اپنی تعلیمی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس مطالعہ میں سب سے مقدم ان کتابوں کا مطالعہ ہے جو اس کی جماعت کے لئے مقرر کی گئی ہیں، یا جس سے اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، یا ہو سکتا ہے ان کتابوں کا مطالعہ سطحی نہیں ہونا چاہئیے یا صرف انہیں ازبر کر لینا ہی طالب علم کا مقصد نہیں ہونا چاہئیے بلکہ طالب علم کو اس کی کوشش کرنی

چاہیئے کہ وہ اس سبق کو ذہن نشین کرے جو ان کتابوں کے ذریعے اسے ملتا ہے اور اس پیغام کو اچھی طرح سمجھے جو ان کتابوں کے ذریعہ اُسے دیا گیا ہے۔ تعلیم کے حصول کا انداز یہ ہونا چاہیئے کہ اس سے طالب علم میں سوچنے کا مادہ پیدا ہو۔ اس کی تعمیری اور تنقیدی قوتیں ابھریں جو آگے چل کر تحقیق اور ریسرچ کی صورت میں ظاہر ہوں، کتابوں کے مضامین یاد کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اس کے مطلب اور مقصد کو بھی یاد کرنا بیحد ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ صحیح معنوں میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔

طالب علم کو آگے چل کر قوم اور ملک کے معمار کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنا پڑتا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ طالب علمی کے زمانے ہی سے اس میں اپنے فرائض کا احساس پیدا ہو اور وہ ان فرائض کو بجا لانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کا کردار ایک مثالی کردار ہونا چاہیئے تاکہ اس کے گردوپیش کے لوگ بھی اسی کردار کو اپنا سکیں۔ اس میں ایک طرف محبت، ہمدردی اور خدمت کا جذبہ ہونا چاہیئے اور دوسری طرف ارادے کی بلندی اور زمانے کے نشیب و فراز کا سختی سے مقابلہ کرنے کا عزم ہونا چاہیئے۔ اس کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ اقبال کے "مردِ مومن" کا صحیح پیکر بنے۔ ان ذمہ داریوں اور فرائض کو بجالائے جو قوم اور ملک کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ طالب علم معاشرہ کی جان ہوتا ہے۔ اسی کے کردار سے معاشرہ کی حالت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ دوسرے معنوں میں وہ ملک اور قوم کے کردار کا آئینہ ہوتا ہے اور اس کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ یہ آئینہ زنگ آلود نہ ہونے پائے۔ ایک طالب علم کا یہ فرض ہے کہ وہ فرصت کے اوقات میں لوگوں کی خدمت کرے اگر اس کے پاس وقت ہے تو وہ نادار اور غریب بچوں کو پڑھانے کے لئے اپنے محلے میں اپنی خدمات پیش کر سکتا ہے۔ گرمیوں کی تعطیل میں بعض کالجوں کے طلبا رضاکارانہ طور پر ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کرتے ہیں۔ ملیریا اور دوسرے امراض کی روک تھام میں حکام کا ہاتھ بٹاتے ہیں جو قابلِ قدر اور قابلِ تحسین ہے۔ سیلاب کے دنوں میں بھی طلبا سیلاب زدہ لوگوں کی امداد کر سکتے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ لوگوں کو متاثرہ مقامات سے محفوظ مقامات تک پہنچائے، ان کے لئے طبی امداد کا انتظام کرے اور انہیں دیگر امداد پہنچانے کے سلسلے میں اپنی رضاکارانہ خدمات پیش کریں۔ یہی نہیں بلکہ اس طرح کے دوسرے رفاہی کاموں میں طلبا بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکتے ہیں۔

"اتحاد" "یقینِ محکم" اور "تنظیم" کا جو زرین درس قائداعظم نے دیا ہے۔ وہ طلبا کے لئے کسی طرح بھی مشعلِ ہدایت سے کم نہیں ہے اور اسے اپنا کر طلبا اپنی صحیح منزل تک پہنچ سکتے ہیں، جو طالب علم محض اس لالچ کی غرض سے تعلیم حاصل کرتے ہیں کہ وہ ڈگریاں اور ڈپلومے حاصل کر کے کسی بڑے سرکاری عہدے پر فائز ہو کر عوام پر حکمرانی کریں۔ تعلیم کے اصلی مقصد سے روگردانی کرتے ہیں۔ کیونکہ تعلیم کا مفہوم محض درسی تعلیم نہیں بلکہ اس کی اہم اور فوری ضرورت یہ ہے کہ تعلیم کے ذریعے ملک میں ایسے نوجوان پیدا ہوں جو نسلوں کے کردار کی تعمیر کریں، اور آئندہ نسلوں کو تعلیم کی روشنی میں بڑے بھلے کی تمیز سکھائیں ان میں عزتِ نفس، دیانت، وفاداری اور قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

بہادر خان چترالی۔ سال اول فنون

امانت

ایک طرف تو امانت کے معنی امن ہے لیکن جب قرآنِ کریم کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں یہ صاف اور سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کا مفہوم اعتبار ہے۔ کسی کے پاس رکھی ہوئی چیز ٹھیک ٹھاک واپس کرنا اور وہ چیز جو کسی دوسرے آدمی کے پاس اس غرض سے رکھی جائے کہ بوقت ضرورت صحیح سلامت واپس ہو جائے امانت کہلاتی ہے۔ ایمان اور امانت کا رشتہ بہت گہرا ہے، کیونکہ رسول خدا صلعم نے خود فرمایا ہے کہ جو لوگ امانت میں خیانت کرتے ہیں وہ ایمان والوں میں نہیں اور دوسری جگہ پر رسولِ خدا نے ارشاد فرمایا ہے کہ۔

یعنی ایمان امانت ہے۔

امانت اسلام کا ایک رکن ہے اور اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ جس میں اللہ نے ہر طرح کی ہدایتیں صاف اور واضح طور پر قرآن کریم کے ذریعے بیان کی ہے۔

چنانچہ اللہ تعالے نے قرآن کریم میں سورۃ احزاب میں صاف اور واضح طور پر بیان کیا ہے کہ جب میں نے دنیا کو پیدا کیا تو سب سے پہلے میں نے زمین اور آسمان کے سامنے اپنی امانت پیش کی تو ان میں سے نہ زمین نے یہ جرأت کی کہ اس کو اٹھائے اور نہ آسمان نے۔ بلکہ یہ حضرت انسان ہی تھا جس نے نہایت ہی ہمت اور مردانگی سے اس کو قبول کر لیا۔

اس امانت کے بارے میں علمائے کرام میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ امانت جس کو خداوند تعالیٰ نے زمین اور آسمان کے سامنے سب سے پہلے پیش کیا تھا فرائض ہیں۔ لیکن بعض علماء کہتے ہیں کہ نہیں اس امانت سے مراد قوتِ اختیاری ہی ہو سکتی ہے، جو کبھی کبھی اطاعت اور کبھی کبھی گناہ کی طرف ایک انسان کو مائل کر دیتی ہے۔

اگر ایک انسان ان دو معنوں میں سے کسی پر بھی عمل پیرا ہو جائے تو یہ مسئلہ خود بخود صاف اور واضح ہو جاتا ہے کہ دراصل امانت کو صحیح طور پر ادا کرنے کا نام ایمان ہے۔ رسولِ خدا نے فرمایا کہ ایمان اور امانت ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں کیونکہ جس انسان سے امانت چلی گئی ہے تو وہ یوں سمجھے کہ اس انسان سے ایمان بھی چلا گیا ہے۔

اور ساتھ ہی رسولِ خدا نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ جب قیامت نزدیک آئے گی تو مختلف نشانیاں نمودار ہو جائیں گی جن میں ایک نشانی امانت ہے یعنی جب لوگ امانت میں خیانت کرنے لگیں تو سمجھ لو کہ قیامت نزدیک آنے والی ہے۔

ایک دفعہ رسولِ خدا سے اس موضوع پر سوال کیا گیا کہ مومن کون ہے تو رسولِ خدا نے جواب دیا کہ

"وہی شخص مومن ہے جس کے دستِ امانت میں لوگ اپنی تمام زندگی اور اثاثہ بطورِ امانت حوالے کر دیں۔"

لیکن اس کے مقابلے میں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ اپنے دلوں میں امانت جیسی صفت کے لئے جگہ نہیں دیتے تو ان لوگوں میں منافقت کا بدترین عیب پایا جاتا ہے۔

ہماری مجلسوں تک کا دارومدار امانتوں پر ہے۔ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"لا امانت یا المجالس" مجلسوں کا دارو مدار امانت پر ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک انسان ایک مجلس میں بیٹھ جائے اور اس مجلس کی تمام باتوں کو خوب ذہن نشین کر لے تو اس کو چاہیے کہ وہ ان باتوں کو کسی دوسری جگہ جا کر نہ بیان کرے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ان باتوں سے دو فرقوں میں ناراضگی پیدا ہو جائے۔

میاں بیوی کے درمیان جو باتیں ہوتی ہیں وہ اسلامی نقطۂ نظر سے امانت میں شمار ہوتی ہے۔ علماء کرام سے سنا ہے کہ "فی المشورہ برکۃ"۔ مشورے میں برکت ہے جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے مشورہ کے لئے آجائے تو دوسرے شخص کو چاہیے کہ وہ اس کو درست مشورہ دے تاکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔ ورنہ اس نے اسلام کے ایک اصول امانت سے روگردانی کی۔ رسولِ خدا نے امانت کی بڑی تاکید کی ہے یہاں تک کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ جب تمہارا دشمن ایک ایسا راستہ اختیار کرے کہ جس سے منافقت اور دورخی کی بو آتی ہو تو تمہیں چاہیے کہ اس کی پیروی نہ کرو بلکہ حتی الوسع امانت دار بننے کی کوشش کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ امانت دار کو بہت پسند کرتا ہے۔

امانت کی اہمیت کی سب سے بڑی مثال حضور کی اپنی زندگی ہے۔ آپ نے امانت کے مفہوم کو عملی جامہ پہنا کر اپنی امت کے لئے ایک بڑی مثال قائم کر دی اور امانت اس قدر ڈٹے رہے کہ دوست (مسلمان) تو درکنار دشمن (کفار) بھی آپ کو امین جانتے تھے بلکہ کے باوجود بھی کفار اپنی امانتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رکھتے تھے اور رسولِ خدا ان کی حفاظت اپنا فرضِ اولین سمجھتے تھے یہاں تک کہ اس وقت بھی جبکہ کفار نے آپ کے مکان کو گھیر لیا۔ آپ کو لوگوں کی امانتوں کا فکر تھا۔ آپؐ نے اپنے چچا زاد بھائی حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر لٹا کر ان کو ہدایت کی کہ لوگوں کی امانتیں ٹھیک ٹھاک ان کو واپس کرنا اور خود مدینہ ہجرت فرما گئے۔ حضرت علیؓ نے ان لوگوں کی امانتیں صحیح سلامت واپس کر دیں اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ چلے گئے۔

رسولِ خدا کی سب سے بڑی امانت اسلام کی تبلیغ تھی۔ جب مکہ فتح ہوا تو حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اے مسلمانو! اگر خدا قیامت کے دن تم سے میرے متعلق تبلیغِ حق کے سلسلے میں پوچھے تو تمہارا کیا جواب ہوگا سب نے بلند اور ایک آواز سے جواب دیا کہ ہم کہہ دیں گے کہ رسولِ خدا نے ہمیں آپ کے احکام پورے پورے پہنچائے، اس وقت آپ نے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا۔

"انت شاہد" "انت شاہد" "انت شاہد"

اے اللہ تو گواہ ہے۔ اے اللہ تو گواہ ہے۔ اے اللہ تو گواہ ہے۔

غرض مندرجہ بالا احادیث اور قرآنی آیات سے یہ صاف معلوم ہو گیا کہ خداوند تعالیٰ نے امانت کا بہت بڑا مرتبہ رکھا ہے۔ خداوند تعالیٰ ہر مسلمان کو امانت دار، دیانت دار، ایماندار اور پرہیزگار بننے کی توفیق عطا فرمائے۔

سجاد میرزا۔ سال دوم فنون

بزم اُردو گورنمنٹ کالج پشاور

بزم اردو گورنمنٹ کالج پشاور کا ۶۳-۱۹۶۲ء کے لئے عہدہ داروں اور نمائندوں کا انتخاب زیر نگرانی سید اسلم کاظمی اور شرر نعمانی عمل میں لایا گیا اور مندرجہ ذیل حضرات کامیاب ہوئے۔

عہدہ دار۔ ماجد سرحدی (صدر) آغا کفیل صدیقی (نائب صدر) شبیر الحسن جمیل (معتمد) محمد یونس قیاسی (نائب معتمد)

نمائندے۔ صفدر خان (سال چہارم فنون) اعجاز الٰہی (سال سوئم فنون) عطاء الرحمان عارف (سالِ دوئم سائنس) عبد الحمید اصغر (سال دوئم فنون) مختار احمد (سال اول فنون) محمد نعیم (سال اول سائنس) محمد سعید (سال اول سائنس)

بزم اردو نے اپنی دیرینہ روایات کو قائم رکھا اور ادبی خدمات کے سلسلے میں مختلف اقدامات اٹھائے۔

قمر جلالوی کے اعزاز میں مشاعرہ۔ بزم اردو گورنمنٹ کالج پشاور کے زیرِ اہتمام ۸ نومبر ۱۹۶۲ء کو کالج ہال میں کراچی کے مہمان شاعر استاد قمر جلالوی کے اعزاز میں ایک شاندار مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں مقامی و بیرونی شعراء معزز مہمانوں اور کالج کے طلباء نے شرکت کی۔ اسی تقریب میں بزم اردو کے اراکین نے حلفِ وفاداری اٹھایا۔ رسم افتتاح اور مشاعرہ کی صدارت کے فرائض مہمانِ خصوصی استاد قمر جلالوی نے سرانجام دیئے۔ مشاعرہ شروع ہونے کے تھوڑی دیر بعد استاد قمر جلالوی نے طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے "کل پاکستان اردو لٹریری سوسائٹی" مرکزی دفتر پشاور کے صدر افسر الشعراء آغا برق کوہاٹی سے صدارت کے فرائض سرانجام دینے کی استدعا کی۔ مشاعرہ میں لاتعداد ممتاز شعراء نے شرکت کی۔ وقت کی کمی کی وجہ سے بعض شعراء کو کلام سنانے کا موقع بھی نہ مل سکا اور سامعین تشنہ لب رہ گئے۔ اس محفل میں جن قابلِ ذکر شعراء نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔ استاد قمر جلالوی افسر الشعراء آغا برق کوہاٹی۔ ملک الشعراء ملک ناصر علی خان ناصر خاقانی سرحد جگر کاظمی، اکبر سرحد میرزا محمود سرحدی، پروفیسر شرر نعمانی، کلیم حیدری، صبا داتی، اذفر زیدی، جی۔ ایچ۔ اثر رسا شیردی، ماجد سرحدی۔ انصر لدھیانوی، قمر عثمان آبادی، سبط علی صبا، سرور سلیمانی، ذکی مراد آبادی۔ ایس۔ ندا کلکتوی، محمد علی حیرت، میاں سید رسول رسا، احمد فراز، محسن احسان، شمیم بھیروی، عاصی رضوی، نبی بخش گوہر، بہادر شاہ ظاہر، کوثر حیات، ممتاز ناصر، علاؤالدین ارشد، نکہت رامپوری، مبارک احمد، اشرف سوز، آتش سہارنپوری، خواجہ یعقوب اختر، حیرت جعفری، فقیر حسین ساحر وغیرہ۔

علاوہ ازیں کالج کے طلباء نے بھی کلام سنایا جن میں عطاء الرحمان عارف، ظہیر احمد رشید، مسلم حمید اصغر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ مشاعرہ کے اختتام پر بزم اردو کی طرف سے پرتکلف چائے دی گئی۔ یہ مشاعرہ "یادگار مشاعرہ" کہلانے کا مستحق ہے۔

شبستانِ غزل۔ بزم اردو گورنمنٹ کالج پشاور اور کل پاکستان رائٹرز گلڈ اردو شاخ پشاور کے اشتراک سے ۱۲ جنوری ۱۹۶۳ء بروز ہفتہ چار بجے شام کالج ہال میں "شبستانِ غزل" منعقد ہوئی۔ مشاعرہ کی صدارت حسب اعلان جناب سید ... کمشنر

پشاور تشریف لانی تھی لیکن وہ بعض اہم مصروفیات کی بنا پر کچھ دیر سے تشریف لاتے اس لئے صدارت کے فرائض عبدالقیوم خان (ائم ٹیکس انسپکٹر) نے سرانجام دیئے ۔

صدر بزم اردو ماجد سرحدی نے مہمان خصوصی مسعود نبی نور ڈپٹی کمشنر پشاور، جناب مسعود انور شفقی معتمد رائٹرز گلڈ اردو شاخ پشاور، اراکین "آل پاکستان اردو لٹریری سوسائٹی" مرکزی دفتر پشاور جناب اسماعیل سیٹھی پرنسپل گورنمنٹ کالج پشاور، جناب اسلم کاظمی (نگران) اور جناب شر نعمانی کا ان کی ہر ممکن معاونت کے لئے شکریہ ادا کیا۔ اس مشاعرہ میں مندرجہ ذیل ممتاز شعرا نے شرکت کی۔

ملک الشعرا ملک ناصر علی خان ناصر، آغا برق کوہاٹی، مسعود انور شفقی، شمیم بھیروی، رسا شیردی، ماجد سرحدی، اذفر زیدی، حافظ انصر لدھیانوی، آصف طرب لکھنوی، ماہر نجیب، کوثر حیات، حیرت جعفری، سجاد میرزا۔ الیسر ندا کلکتوی (معتمد بزم امین پشاور) وغیرہ نے شرکت کی۔

مشاعرہ کے اختتام پر مہمان خواتین وحضرات کے اعزاز میں "بزم اردو" کی طرف سے پرتکلف چائے دی گئی۔

یوم رومی ۔ ۲۳ جنوری ۱۹۶۳ء کو کالج ہال میں "یوم رومی" منایا گیا۔ اس تقریب میں اراکین بزم اردو نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا معتمد کے فرائض جناب شر نعمانی نے سرانجام دیتے۔ بزم اردو کے صدر ماجد سرحدی نے نعت پیش کی۔

جناب ڈاکٹر مظہر علی خان، طاہر فاروقی، جناب اسماعیل سیٹھی نے رومی سے متعلق تقاریر کیں۔ بعد ازاں محفل سماع منعقد ہوئی اور مہمانوں کے اعزاز میں پرتکلف چائے دی گئی۔

بزم اردو کے ہنگامی اجلاس ۔ بزم اردو کے کئی ہنگامی اجلاس زیر صدارت ماجد سرحدی منعقد ہوتے جن میں مختلف امور کے فیصلے کئے گئے اور پروگرام مرتب کئے گئے ایک ہنگامی اجلاس میں محمد علی بوگرا کی وفات پر اظہار تعزیت کیا گیا اور طلبا نے تقاریر کیں۔

کل پاکستان مشاعرہ ۔ بزم اردو گورنمنٹ کالج پشاور کے زیر اہتمام (مارچ، اپریل) میں کل پاکستان مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ اس مشاعرہ میں پاکستان کے ممتاز شعرا کو شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے۔

انعام اور میرٹ سرٹیفکیٹ ۔ بزم اردو نے کل پاکستان مشاعرہ ایبٹ آباد میں تیسری امتیازی حیثیت اور میرٹ سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ اس ٹیم کی قیادت ماجد سرحدی اور شبیر الحسن نے کی۔ مضمون کی طوالت کو مدنظر رکھتے ہوئے مشاعروں کی کارروائی درج نہیں کی جا رہی ہے۔ البتہ بزم اردو کے معاونین اور اراکین کا مختصراً تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

جناب اسماعیل سیٹھی ۔ آپ گورنمنٹ کالج پشاور کے پرنسپل اور "بزم اردو" کے سرپرست ہیں۔ ایک اچھے ادیب منتظم اور خوش اخلاق انسان ہیں آپ نے "رومی" پر ایک بہترین مقالہ پڑھا تھا۔ جو شریک اشاعت ہے۔

جناب اسلم کاظمی ۔ آپ اردو کے لیکچرر ہیں اور بزم اردو کے نگران بھی، ادیب بھی ہیں اور شاعر بھی۔

ماجد سرحدی ۔ آپ "بزم اردو" گورنمنٹ کالج پشاور کے صدر ہیں۔ آپ مشہور جوان سال شاعر ہیں اور آپ کا کلام ہندو پاک کے اکثر اخبار ورسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ یونائیٹڈ آرٹ سوسائٹی پشاور نے آپ کو بہترین گیت لکھنے پر تمغہ و عزت کا خطاب دیا۔ زیر طبع مجموعۂ کلام "چٹکتی کلیاں" ہے۔ کل پاکستان اردو لٹریری سوسائٹی کے معتمد اعلٰے اور دیگر کئی انجمنوں کے رکن ہیں۔ صدر مملکت نے نظم "آئین نو" پر شکریہ کا خط بھیجا

کفیل صدیقی ۔ آپ بزم اردو، فلاسفی سوسائٹی کے نائب صدر ہیں، مضامین لکھتے ہیں۔
شبیر الحسن جمیل ۔ آپ بزم اردو کے معتمد اور انتہائی سرگرم رکن ہیں۔ اشعار بھی کہتے ہیں اور جمیل تخلص کرتے ہیں۔ ہاکی کے اچھے کھلاڑی ہیں۔ کل پاکستان طرحی مشاعرہ ایبٹ آباد میں شرکت کی۔
یونس قیاسی ۔ بزم اردو کے نائب معتمد ہیں۔ بچوں کے لئے ڈرامے اور نظمیں لکھتے ہیں۔ کبھی کبھار غزل بھی کہتے ہیں۔
عطاالرحمان عارف ۔ بزم اردو کے نمائندے ہیں۔ ابھرتے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ اشعار بھی کہتے ہیں۔ آپ سے ایک تابناک مستقبل کی امید وابستہ کی جاسکتی ہے۔ علاوہ ازیں صفدر خان، اعجاز الٰہی، عبدالحمید اصغر، مختار احمد، محمد نعیم محمد سعید، بزم اردو کے نمائندے اور سرگرم رکن ہیں۔ ادبی ذوق رکھتے ہیں اور ادب کی خدمت کے لئے کوشاں ہیں۔
سجاد میرزا بزم اردو کے منتظمین میں سے ہیں۔ شاعر بھی ہیں۔

زندگی کو بے نیاز آرزو کرنا پڑا
آہ کن آنکھوں سے انجام تمنا دیکھتے
(ساحر لدھیانوی)

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
(غالب)

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا
(مصحفی)

هوالمعین

د گورنمنټ کالج پېښور میګزین

۱۹۵۶-۶۳ء

د پښتو برخه

کندهارا

ورمبۍ ګڼه جولائی ۱۹۶۳ء

☆ نګران:-

پروفیسر عُبید الرحمٰن افغانی۔ ایم اے

☆ مدیر:-

خان بهادر خټک څلورم کال

بربنا

لیت اولار

... اماؤ رومیٔ گنړه ستاسو په خدمت کښې پیش کیږی۔

دَ رسالې تو خلاف داخل دَ نظم لږ او دَ نثر گنړ مضمونونه دی۔ دا سے معلومیږی چه دَ
روزمره اکتشافاتو (DISCOVERIES) په وجه عام رجحان دَ نظم طرفته کمیږی۔ شاید چه دنیا ټول
باد افلاطون دَ "ریاست" په رنگ شاعری دَ ادب نه اوباسی۔ ولے دَ شاعرئ تنه بُوده ډیره سخته ده
ے دَ افلاطون دَ زمانے نه واخله تر ننه پورے خپل وجود هم هغسے قائم ساتلے دے۔ بلکه په
ں سائنسی دور کښې هم په یورپ او امریکه کښې شاعرئ ډیره دَ عزّت ځائے موندلے دے۔ شاعرئ
شاعری هم په دے وجه ویښلے شوی دی۔ چه دے دَ بعض قومونو قسمت بدل کړے دے۔ دَ
بو دَ شاعرانو دَ کلام دَ تاثیر نه څوک انکار کولے شی۔ البته هغه شاعری چه په کومه کښې څه
پیغام (MESSAGE) نوی هغه لمحے تک بندی دَه۔

په هره رساله کښې دَ ډرامو نیشت کے گنړلے شی۔ دا په تعداد کښې خو گنړے وے۔ ولے میدٔ
وے۔ دَ بعضے ډرامونه داسے څرگندیده۔ چه دَ ادب او دَ ښوند هر وخت ترون نشته۔

هر ترقی یافته ادب کښې ترجمو نه ډیره اهمیّت حاصل وی۔ په ادب کښې ای توالے او آفاقیّت
هم دے ترجمو نه پیدا کیږی۔ په دے گنړه کښې به هم تاسو بعضے ترجمے تر نظره راځی۔

خدایه څه شو هغه ښکلی ښکلی خلق ؟

دَ گورنمنټ کالج پیښور دَ بنا کیدو دَ پنځو کالونه زیات اوشو۔ ولے رساله په پروجیکټ ..
چاپ کیږی۔ دَ تیرو شوؤ پنځو کالونو راسے به هم داسے طالب علمانو نه مضمونو نه اخستے شوی
رساله به نه چاپ کیده۔ مونږ په دے ورومیٔ گنړه کښې دَ بعضے بنو نیکونکو تیرو شوو طالبانو
مضمونو نه هم شامل کړی۔ دَ دے دَ پاره چه دَ هغوی حق هم ادا نه ده ملے شی۔ دَ پښتو ښے دَ لوے
شاعر او ادیب او محقق لږ۔ محترم استاذ صاحبزاده حبیب الرحمٰن صاحب قتیل مومند دَ انگریزی سابق پروفیسر
... او تعلیم هم شاملیږی۔ کوم وخت چه دوئ په دے کالج کښې وو۔ نو دَ پښتو حصے دَ نگران په

حیثیت دَ دوئ نوم منتخب شوے دَے۔

زه دَ هغو ئیکو نکو شکریه ادا کوم۔ دَ چا چه نظم او نثر په دے حصه کښ شامل دے۔ دَ کومو طالب علمانو مضمو نو نه چه په دے وجه شائع نشو چه هغه معیاری نه وو۔ هغوی ته مشوره ده چه چه بنه په محنت ئیکل شروع کړی۔ دَ داستو نکے رسالے صفحے دَ هغوی دَ پاره حاضرے دی۔

دَ دے خبرے کوشش شوے دے چه په دے محدودو صفحو کښ دَ نظم او نثر دَ اصنافو پوره نمائندگی اوشی۔

په آخیر کښ زه دَ محترم پرنسپل ښاغلی محمد اسمٰعیل سیتهی صاحب شکریه ادا کوم۔ دَ چا په دور کښ چه رساله په دوهم ځل شائع شوه۔ هم دغه رنګ زه دَ محترم نګران ښاغلی عبید الرحمٰن افغانی صاحب هم ممنون یم۔ دَ چا په تعاون او نګرانئ کښ چه دا کار سرته اورسیدو ۔

بخان بهادر ختهک (ځلورم کال)

پروفیسر عبیدالرحمٰن افغانی ایم اے

په یورپ د مُسلمانانو احسانونه

دَ تیرو شوو سلوکالو راسے یورپ دَ ملکی او سائنسی فتوحاتو په وجه مُسلمانان ذهنی لحاظ سره دومره متاثره کړل - چه هغوئ دَ خپلو مشرانو میراث دَ یورپ ملکیت اوګڼلو - بل خوا دَ یورپ خلقو په ډیرے هوښیارئ هغه عربي ذخیرے، دَ کومو نه چه هغوئ را استفاده کړے وه حذف کړے او علوم او فنون ئے د خپلو مشرانو میراث اوګرځولو

نن هر نوی ایجاد او اکتشاف یورپ سره منسوب کیږی - ولے داټے شمیره ایجادونه او اکتشافات هغه وخت مسلمانانو کړی دُو - کله چه دَ یورپ خلقو نیم وحشیانه ژوند تیرولو

مونږ څومره ئ دوستو ویلو چه دَ یوؤرخلق چه کوم وخت نیم وحشی او غیر مهذب به دُو. په ایشیا، افریقه او اُندلس کښ مُسلمانان په علوم او فنون کښ څومره وړاندے تلی دُو - او دَ کوم تهذیب او تمدن مالکان وُو - په دے لړکښ به مونږ اُندلس ادو مرو دَ نظر لاندے ساتو - ولے چه په سپین (SPAIN) کښ عربي تمدن په قرونِ وسطیٰ کښ د عالمګیرے رڼا مینار وُو - یورپ هغه وخت دَ جهالت په تیارو کښ پروت دُو - او دَ قرطبه مکتبونو د شمال او مغرب تو لړے لړے کوتونو یورپ خپلے رڼا رسوله -

دَ یورپ دَ جهالت دَ ذکر کولو په لړکښ ډریپر (JOHN WILLIAM DRAPER) لیکی. جهالت او لاعلمی هر طرف ته خوره وه - په یورپ کښ د شرم ناکو معجزو او کرامتونو کثرت دُو - دَ یوپ پ عقل عام عقیده داده، چه که هغه وعواړی نو هر چا ته دَ جنت ټکټونه ورکولے شی - او څوک چه عواړی په دوزخ کښ ئے غورځولے شی - د طب فن بالکل ختم دُو - دَ مرضونو دَ علاج دَ پاره په خلق دَ تبرکاتو او تعویذونو په اسره پاتے شو - او که څوک به طبیب لټوله - نو هغه مُلحد ګڼړلے شو - فلسفه، حکمت او منطق نو ستل ورته لویه ګناه ګڼلے شوه - دَ مسیحیت دَ بنګاره کیدو نه د یوآکاهو علم او حکمت ډیره ترقی کړے وه - دَ مسلمانانو عقیدے دَ لرونکو په نزد دَ ارشمیدس ایجادونه، دَ ارسطو فلسفه، دَ ...

ARISTOTLE ARCHIMEDES

جغرافیه، دَ اقلیدس (EUCLID) جیومټري دَ دې تولو حیثیت دَ شیطاني علمونو وُو. تولې لوئې لوئې کتب خانې دَ مسیحي بادشاهانو په حکم او سوزولې شوې.

دَ براعظم یورپ ډیره لویه حِصّه دَ ګڼو ځنګلونو نه ډکه وه. په دغو ځنګلونو کښې بوختې وې. چه تر میلونو پورې سیدې تللې وې. دَ کوم نه چه به بُخارات (بړاس) او چیتدل او تورې لوړې به پیدا کېدې او خلکو باکانې خوړلې. دَ رومته الکبرئ په زمانه کښې چه کوم سړکونه جوړ شوي وُو. هغه اوس اکثر وران او بیکاره شوي وُو. او دَ کال په اکثره حصّه کښې به بند وُو. هرځائې ډاکوان او شوکماران وُو. یو ائځ سفر کول دَ خطرې نه خالي نه وُو.

دَ پیرس او لندن مکانونه دَ لرګو وُو. چه په دروازونو کښې به ئې ختهٔ تختې شوې وه چتونه ئې دَ پلالې وو. په مکانونو کښې روشندانونه او کړکئ نه وې. دَ آرې دَ مشین تر ایجاده پورې دا ښه مکانونه ډیر کم وُو. چه فرش به ئې ډلرګي وو. قالین او دری ئې څوچا پیژندلې هم نه. په مکانونو کښې نالئ نه وې. دَ صفائئ هیڅ انتظام نه وُو. دَ ګندګئ ډیر به دروازې سره ټکیدلي وُو. بنځې سړي ماشومان ترډې چه څاروي به هم تول په یوکوټه کښې اوسیدل. دَ خلقو لباس به دَ څرمنې وُو. چه تر ډیرې مودې پورې به په کارېدلو. په دې کښې به دَ بدن خیرې جمع کېدې. کوم سړي به چه په هفته کښې یوځل غوښه خوړه هغه به ډیر دولتمند ګڼړلې شو. په کوڅو کښې نالئ نه وې. او نه په سړکونو دَ رڼا انتظام وُو. چه باران به اوشو. نو چا به دَ کور نه دَ وتلو زړهٔ هم نه کولو. او که څوک به مجبوراً دَ کورنه دَ وتو نو ترکیڅو به په ختو کښې بوختیدو.

دَ یورپ دَ بادشاهانو حالت هم څه ښهٔ نهٔ وو. دَ هغوکورونه به دَ اصطبل نه هم خراب وُو. دا امیرانو په محلونو کښې به په زمکه دَ پوزې فرش وو. لویو لویو امیرانو به دَ څرمنې جامې اغُستلې. لمبل ډیر لوئې عیب ګڼړلې شو. دَ حکومت دَ لویو لویو خلقو او دَ پادریانو په جامو کښې به سپږې وې.

ایئنس سِلویئس (AENEAS SILVIUS) چه وروستو بیا دَ پایئس ثاني (PIUS II) په نوم دَ پاپائیت په تخت کیناست. دهٔ دَ برطانیې سفر په ۱۴۳۰ عیسوي کښې اوکړو. هغه لیکي:-

"دَ ډیرو انسانانو کورونه دَ کاڼو وُو. چه چونه به پکښې نه وه. چتونه به ئې دَ واښو وُو. او دَ غوایانو څرمنې به دَ دروازو کار ورکولو. هغوئ به ساګ او مټې وغیره دَ خوراک

په طور استعمالول. تردې چه دَ دَوَی پوستکی به ئې هم خوړل - دَ بعض ځایونو خلق دَ دودی دَ نوم نه هم واقف نهٔ وو."

دَ اینګلوسیکسن (ANGLO SAXON) قوم دَ ذکر په لړکښې یو بل مصنف بیکی "دَ دې قوم امیران کینه ور او عیاش وو - عام خلق دَ طاقتورو امیرانو دَ ظلم په پنجه کښې انښتی وو - دَ هغوئ جائید اد ونه به ئې اخستل - او هغوئ به ئې جبراً لړے ملکونو ته استول - دَ هغوئ لونړه به ئې و پنځې کولے او خرڅولے به ئې. دَ جاګیرداراتو قلعه ګانې دَ بداکوانو کورونه شوی وو - مذهبی مشرانو دَ تمام دَ اخلاقی او روحانی حقوقو پالنه پریښې ده."

د ۱۳۵۳ عیسوی نه آګاهو دَ یورپ په طرزِ معاشرت کښې دَ زنانو حال د رحم قابل وو. نه دوئ د ورثې دعویٰ کولے شوه - او نه ورته دَ څه څیز دَ خرڅولو یا اخستلو اجازت وو - نه ئې څه قانونی معاهده کولے شوه - په یونان کښې دَ سولن (SOLON) دَ قانون په رُوسره پلار ته دا اختیار وو - چه که لور دَ هغه دَ مرضئ خلاف واده اوکړی - نو هغه دِ فوراً قتل کړے شی.

په روم کښې مالک ته دَ قانون په رُوسره دَ خپل غلام پخقله دَ هر قسمه اختیارات حاصل وُ. غلام دَ خپل ځان دَ پاره دولت نشو ګټلے - او فوجی عهده به ئې هم نشوه قبلولے. تردې چه مالک به غلام قتل کولے هم شو.

دَ پورتنو اقتباساتو نه ښکاره ده - چه دَ یورپ خلق دَ تهذیب و تمدن خوشه څه کوے چه ئې لا نیم وحشیانه ژوند تیرَولو - دَ هغوئ ترپادریانو پورې د یک لوست نه نابلده وو - هرطرف ته جهالت او ګمراهی خوره وه -

بل خوا دَ مُسلمانانو دا حال وو چه دَ آنحضرت صلی الله علیه وسلم دَ وفات (۶۳۲ عیسوی) نه پسته پوره سل کاله هم لا نهٔ وو تیر شوی - چه دَ یونان دَ مشهورو حکماوُ دَ تصانیفو ترجمه په عربئ ژبه کښې اوشوه - عمرو بن العاص مصر فتح کړو - (۶۴۱ عیسوی) دَ یونان دَ علم دَ خاوندانو چه دَ پادریانو دَ ویرې به ئې دَ فلسفې نوم قدرله هم نهٔ اخستو - داد ګیرنه دکړه شوه - دَ امیر معاویه (۶۶۱-۸۰) په زمانه کښې دَ یونانی طبیبانو دَ بعضې کتابونو ترجمه په عربئ کښې اوشوه دمروان بن الحکم (۶۸۴-۸۵) په زمانه کښې یو یهودی طبیب دَ قرابادین ترجمه د سُریانئ نه په عربئ کښې اوکړه - دَ عمر بن عبدالعزیز (۷۱۷-۲۰) په زمانه کښې دمصری، یونانی، فارسئ وغیره ژبو نه دَ هیئت، نجوم، فلسفې وغیره بے شمیره کتابونه ترجمه شوه او هر طرف ته خوارهٔ شوُ

دهارون الرشید په زمانه کښې د روم نه د پېردنو او کتابونو نسخې بغداد ته راوړلے شوې او ترجمه شوې۔ بیت الحکمة (۸۰۰ء/ ۸۳۰ء) بنا کړے شو۔ چه د یعقوب الکندی، حنین، قسطا بن لوقا، سهیل بن هارون سعید بن هارون۔ حجاج ابن مطر وغیره د کمال خاوندان پکښې نوکران وو۔ د هندوستان د کمال خاوندانو هم د بغداد رُخ اوکړو۔ او د سنسکرت کتابونه په عربۍ کښې منتقل شو۔ په دے کتابونو کښې د یونان فلسفه، هیت۔ جبر و مقابله، حساب، جغرافیه، هندسه، منطق، موسیقی وغیره شامل دی۔ د کلدانۍ، سریانۍ، عبرانۍ او قبطۍ ژبو د علم چه کومه پانګه لاس ته راغلے شوه۔ هغه هم د عربۍ په قالب کښې واچولے شوه۔ او مُسلمانانو عالمانو هم په دے شرحے اولیکلے۔ په دے خلقو کښې البیرونی، ابن سینا۔ فارابی، رازی، غزالی او ابن رشد شامل دی۔ د چا په علم او حکمت چه یورپ د خپل علم بنیاد کیښنو۔

څه وخت چه په یورپ د تیارے وریځے خورے شوے وے۔ نو بغداد، دمشق، قرطبه قیروان، سکندریه، انطاکیه، موصل۔ اشبیلیه او غرناطه لوئے لوئے علمی او تمدنی مرکزونه وُو۔ په لیدو به ئے د یورپ نیم وحشی خلق حیرانیدل۔

مسلمانان صرف جهان ګیرے مرنی نه وُو۔ بلکه د قلم خاوندان هم وُو۔ هغوئ چه کوم علم اخستے دے نو کمال ته ئے رسولے دے۔ بے شمیره علمونو کښې د څنو بیان مونږ په اختصار سره کوُو۔

دجهازرانۍ فن۔

څه وخت چه مسلمانان په بحر روم باندے قابض شو۔ نو هغوئ په شمالی افریقه، سپین او سسلی کښې د جهازونو لوئے لوئے کارخانے قائم کړے۔ مشهور عرب مؤرخ ابن خلدون لیکی۔ په دے زمانه کښې یورپی قومونو څخلے سمندری بیړے شمال مشرق طرفته اوړے وے۔ د بحر روم په دواړو ساحلونو باندے د عربو تګ راتګ وو۔ لائټ هاؤس او د قطب نما (COMPASS) استعمال هم د دوی نه آګاه عربو کړے وو۔

ګستاو لی بان (GUSTAVE LE BON) لیکی ــــــــــ د یورپ خلقو د څوارلسمے صدئ عیسوی نه آګاه هو د قطب نما استعمال نه وُو کړے۔ حالانکه عرب جغرافیه دان ادریسی د دولسمے صدئ عیسوی په مینځ کښې لیکی چه په عربو کښې د دے استعمال عام وُو۔ واسکوډی ګاما (VASCO DA GAMA) ته د هندوستان بحری لاره یو عرب احمد بن ماجد ښودلے وه۔

دَ هیئت علم (ASTRONOMY)

دَ مسیحي دین دَ بزرګانو اجتهاد دَ مشاهدے، تجربے او علمي اکتشافاتو دا سے لاره ور نیوه - چه عیسائیت دَ خپلو تخلسو سوو کالو (۱۵۰۰) په عمر کښي یو هیئت دان هم او نه ځیږ ولو - مسلمانانو دَ علوم او فنون پر ده کړه کوو نکو ته ملحد او نه وئیل بلکه چه کوم ځائے او په کومه ډه کښي به دَ علوم او فنون کتابونه موندے شول - دوئ به دَ عربئ په قالب کښي اچول. خلیفه مامون (۸۱۳ - ۸۳۳ عیسوی) ته چه دَ بطلیموس دَ مشهور تصنیف سنتکس چه هغه دَ سیارو (PLANETS) او ثوابتو (STARS) په مهندسانه ساخت لیکلے دے - یو نسخه دَ قسطنطینه دَ کتب خانے نه پلاس ورغله نو خلیفه دَ هغے ترجمه په عربئ کښي (المجسطی) اوکړه - هم دغه رنګ په لږه موده کښي دَ بے شمیره کتابونو ترجمے اوشوے - او دَ خپل علمي ذوق په سبب مسلمانان نه صرف دَ دے حکماؤ دَ تصانیفو نه واقف شو - بلکه په هغو ئے تنقید وئه کول هم شروع کړه -

الفزاری دَ نمر او ستورو دَ بلندئ معلومولو دَ پاره اصطرلاب ایجاد کړو - دَ زمکے جسامت معلوم کړے شو - دَ هوا دَ کرے او چتوالے (بلندی) هیچ کړے شو - رومبی رصد ګاه (OBSERVATORY) قائمه شوه - او ډیرے مسئلے حل کړے شوے - دَ ګریګوری دَ تقویم (GREGORIAN CALENDAR) په وجود کښي دَ راتلو نه تقریباً پنځه سوه کاله رومبے دَ ملک شاه سلجوقي (۱۰۷۲ - ۱۰۹۲ عیسوی) په زمانه کښي عمر خیام او نورو علماؤ التاریخ الجلالی نوم یو تقویم تیار کړے وو - ثابت ابن قره، حنین ابن اسحاق، الفرغانی او خیام مشهور هیئت دانان وو -

دَ جغرافئے علم :-

دا حقیقت دَ ټولو نه رومبے مسلمانانو دریافت کړے وو - چه هر سمندر دَ بل نه جدا او مستقل نوی - بلکه ټول سمندرونه په خپلو کښي مشترک یوه بحری دنیا ده - چه هند چین، فارس، روم او شام ئے په یو بے لوئے دائره کښي راینولی دی - دا هم عرب وو - چا چه په رومبے ځل دَ سمندر صحیح پیمائش اوکړو - دَ فرانس مشهور مصنف ګستاولی بان (GUSTAVE LE BON) لیکلی دی - دَ عربو پیمائش دَ بطلیموس نه څه ډیر درست او صحیح دَ او دَ دے پیمائش نتیجے دَ موجوده زمانے دَ تحقیق او څیړنے ته ډیرے نزدے دی. عربو دَ زمکے جسامت معلوم کړو - او البیرونی ۱۰۳۰ عیسوی کښي دَ دنیا دَ لویو لویو مقامونو

HE MATHEMATIKE SYNTAXIS

طول بلد او عرض بلد معلوم کړو.

جغرافیه داسې علم دے چه بنیاد ئې هم عربو ایښے دے. په قدیمو ملکونو مصر یونان او روما کښې دَ جغرافیې پهقله ډیر کم لیکل شوی دی. صرف دَ بطلیموس کتاب الجغرافیه عربوته راوسیدلے ده. چه ترجمه ئې په ۲۴۷ هر کښې او شوه. دَ دے نه اګاهو په عربو کښې دَ جغرافیې دَ علم فاضلان پیدا شوی وُو. مثلاً ابو سعید اصمعي، سعدان ابنِ مبارک ابن هشام الکلبی وغیره وے ابنِ حوقل، ابن فقیہ همدانی الاصطخری، الادریسی او یاقوت حموی دَ جغرافیې داسے عالمان وُو چه جواب ئے تر نن پورے یورپ سره هم نشته.

دَ تاریخ علم:-

دَ جغرافیې سره سره په علمِ تاریخ کښې هم مسلمانانو ته یو امتیازی خصوصیت حاصل دے دَ عربو بچی بچی به ترلس دولسو پیړو پورے دَ خپلو مشرانو کارنامے زبانی یاد وے. دَ عربو قدیم مؤرخ ابن هشام الکلبی دے. دے په ۸۱۹ عیسوی کښې مړ شو. ترڅلورمے صدئ هجری پورے مسلمانانو سره دَ تاریخ یوه قیمتی سرمایه جمع شوے وه. ابو القاسم قرطبی دَ اندلس تاریخ په څو جلدونو کښې اولیکلو. په لسمے صدئ هجری کښې تاریخ دومره شهرت او موندلو چه مسعودی طبری او حمزه اصفهانی دَ دنیا دَ تاریخ لیکلو اراده اوکړه.

دَ تاریخ دَ فلسفے ایجاد علامه ابنِ خلدون اوکړو. اسلام بے شماره لوئے مؤرخین پیدا کړه. په دوئ کښې دَ بعضے نومونه دادی. احمد ابنِ یعقوب. احمد بنِ یحیٰ بلاذری، مسعودی، طبری، حمزه اصفهانی، سیوطی، ابن الاثیر. ابنِ خلکان، ابن قتیبه، ابن مسکویه دَ تاریخ عروج پهقله دومره لیکل کافی دی. دَ شپږ سوَو کالو په موده کښې مُسلمانانو دَ ډیر شمیره تاریخی کتابونو دَ لیکلو نه علاوه شپږ لکه سوانح عمرئ هم لیکلے وے.

دَ ریاضئ علم:-

محمد بن موسیٰ الخوارزمی دَ دنیا بهترین ریاضی دان وو. په ۸۳۰ عیسوی کښې دَ الجبرالمقابله په دَ دنیا مشهور کتاب دے اولیکلو. چه دَ ریاضئ یو شعبے ته ئې دَ الجبرے نوم ورکړو. رابرٹ آف چسټر په ۱۱۴۵ عیسوی کښې دَ دے کتاب په لاطینئ ژبه کښې ترجمه اوکړه. البتانی په علم مثلث (TRIGONOMETRY) کښې سائن ټینجنټ (SINE TANGENT) او کوسائن ټینجنټ (CO SINE TANGENT) دَ اصطلاحاتو استعمال شروع کړو. او دَ دے علم ئے ډیر خد

اوکړو.

دَطب او جراحت علم:-

ذکریا الرازی او بوعلی سینا په مسلمانانو کښې دَ طب امامان ګڼړلے شي. الرازی ډیر طبع زاد کتابونه په علم ادویه، علمِ طب، په حقونو اوشری باندے اولیکل. په لویه تبه کښې دَ یخوا اُبو استعمال اودَ ویښتو په ذریعه زخم ګنډل هم دَ لاخو دلی ؤو. دَالرازی او بوعلی سینا اِبن اسحاق او ابن ماسوډ کتابونو ترجمې پهٔ لاطینئ کښې اوشوے. دَالرازی کتابونه تر اوسه صدئ عیسوی پورے دَ یورپ په طبی مکتبو نوکښې لوستے شول. په ۱۳۰۰ عیسوی کښې ابن الخطیب متوطن غرناطه په طاعون یوه رساله اولیکله. ابن رشد په طب ډیرے شمیره رسالے اولیکلے. ابو القاسم دَجراحئ ډیرے شمیره اٰلات ایجاد کړی ؤو. دَ هغه کتابونه په ۱۴۹۷ عیسوی کښې په لاطینئ ژبه کښې چاپ شو.

دَ طبیعیاتو علم :- (PHYSICS)

ابن الهیثم چه په یورپ کښې دالحسن په نوم مشهور دے. دَ طبیعیاتو ډیر لوئے عالم ؤو دَهغه ینځوس طبعزاد کتابونه ؤو. دا ډومبے سړے دے. چا چه دَ دے امر انکشاف اوکړو چه دَ سترګو نه کومه رڼا په څه شیز نه پریوځی بلکه دَ دے شکل په سترګوکښې راځی. اودَ سترګو دَ شفافے پردے (LENS) په ذریعه هغه شکل وړاندے منتقل شی.

دَ دے نه علاوه البیرونی د ډیکے، او سپینے، بتیم او دَپلو دَ مخصوص وزن (SPECIFIC GRAVITY) معلوم کړو چه موجوده اندازونه ډیر قریب دی.

الخازن دَ تولونه ډومبے داخبره ثابته کړه. چه یخې اُوبه اوګرمے اُوبه دَ عامو اُوبو نه څه قدرے سپکے دی.

دَ کیمیا علم:- (CHEMISTRY)

دَعربو دَ ټولو نه لوئے دَ کیمیا عالِم جابر ابنِ حیّان وو. دے دَ هارون الرشید په زمانه کښې تیر شوے دے. دهٔ دَارسطو (ARISTOTLE) دَ فلزاتو نظریئ* تردید اوکړو. فولادئ تیار کړه. دَ شورے (NITRIC ACID) تیزاب ئے معلوم کړه. دَ ابو موسیٰ کوفی په زیار او محنت کیمیا ډیره ترقی اوکړه. دَ سپین کیمیادانو دَ عرق ویستو مشین جوړ کړو. او دَ زهرونه ئے دَ صحت دَ تندرستئ داروګان تیار کړه.

* THEORY OF THE CONSTITUENTS OF METAL

فلسفه:-

فارابی او بوعلی سینا هم ګڼ د فلسفې لوی او مشهورې هستئ دی. د ارسطو نه پس د فارابی نه لوئ فلسفی هم په دنیا کښې پیدا شوې نه دې. لارډ بیکن د جدیدې فلسفې بانی ګڼړلے شی. لارډ بیکن نه تقریبًا سل کاله آګاهو امام غزالیؒ وفات شوې وو. او د هغه د تصانیفو ترجمې په لاطینئ کښې شوې وې. لامحاله بیکن د دې ژبې نه واقف وُو.

د حقو ننکو د خالونو ایجاد ډاکټر جینر (DOCTOR JENNER) نه دے کړے. بلکه په مشرق کښې د حقو ننکو د خالونو لګولو رواج د ډیرو زمانو نه راتلو. خو د خالونو لګولو طریقه مختلفه وه. د اتلسمې صدئ عیسوی په آغاز کښې دا تهیکه د ترکو نه په انګلستان کښې رائج کړې شوه. ډاکټر جینر تجربې اوکړې او په ۱۷۹۶ عیسوی کښې ئې خپلې نتیجې شائع کړې.

د دوربین موجد ګلیلیو (GALILEO GALILEI) نه وُو بلکه ابوالحسن وُو. د وړومبۍ انسائیکلو پیډیا د دائرة المعارف په نوم محمد ابوعبدالله مرتبه کړه. د شاعرئ علم ادب د تعبیراتو او د نورو علومو او فنونو ذکر د او په دوالی په خیال پرېښودې شو.

یورپ چه څه وخت په تیاره او ګمراهئ کښې ډوب وو. نو هم د یورپ په یو ګوټ کښې د اسلام د رڼا په وجه اندلس په علوم او فنون کښې بے حده ترقی کوله.

یو انګریز محقق د سپین د اسلامی فاتحینو متعلق لیکی. چه" د سپین په جزیره نما کښې اسلامی فتوحات ډیر په تُندئ جاری وُو. او د مُسلمانانو د رحمدلئ او مهربانئ په وجه هرڅوک د دوی ملګرے کیدو. او چونکه دوئ به هر یو سره یو والے او برابری ساتله. په دے وجه د سپین خلق مسلمانان شو."

د سپین خلق چه اکثر د ګاث (GOTH) قوم سره تړون لرو. د خپلې بد ذوقئ په بنا د فنونِ لطیفه نه بالکل ناآشنا وُو. ولے د عربو خلقو په دوئ کښې دا شے ذوق او شوق راولاړ کړو. چه دوئ ډیر د نابلدو کاروبو سره نه صرف بلد شو. بلکه د غه کاروبو ئې تکمیل ته هم ورسول. عبدالرحمن د سپین فاتح په قرطبه کښې یو بنائسته محل جوړ کړو. د دې یاب په غاړه ئې یو باغ جوړ کړو. او د سیوو او ګلونو پړ دا شے ونې او لګولے چه د سپین په زمکه کښې هیچرې نه وې زرغونې شوې.

قصرالزهره او الحمراء د هغې زمانې د صناعئ بهترین مثالونه دی. په ۸۵۲ عیسوی

کښې دَ ټول سپین سړکونه پاخه کړے شو۔ په سړکونو باندے دَ رڼا انتظام او شو۔ دَ دریاب په غاړه دَ عوامو دَ تفریح دَ پاره دَ سیل ځایونه جوړ شو۔ شفاخانے او حمامونه جوړ کړے شو فنونِ لطیفه ډیره ترقی او مونده۔ دَ ټولو نه روميے ستار د عرب نه سپین ته راغلو۔ په قرطبه کښې علی زریاب دَ موسیقیٔ دَ فن یوه مدرسه جاری کړه۔ او هم دَ دے ځایه یورپ دَ موسیقیٔ دَ فن نه آشنا شو۔

دَ نقاشیٔ او دَ خوشنویسیٔ په فن کښې ښځو هم کمال حاصل کړو۔ دَ علم او فضل داسے نو بت غړید و چه ښځو په سړو دَ برَی موندلو کوشِش کولو۔ چنانچه دَ رضیه سلطانه بنت الحکم تاریخ او جغرافیے سره دومره شوق وُو۔ چه هغے دَ داسے کتابونو یوه ډیره لویه کتب خانه جوړه کړے وه۔ مریم بنتِ یعقوب دَ زنانو دَ پاره یو مدرسه جاری کړے وه۔ چه په زرګونو جونو تړِ فیض حاصلَو لو۔

دَ قرطبه په محلونو کښې علمی مجلسونه او غونډے قائمے شوے۔ چه دَ مابنام په وخت کښې به دَ هرے فرقے او قوم خلق پکښے جمع کیدل۔ واړهٔ ماشومان به دَ لرے لرے ملکونو نه سپین ته دَ علم حاصلو لو دَ پاره راتلل۔ دَ دے ځائے په مدرسو کښې به فقه، شاعریٔ، هیئت، علم هندسه او طب ښودلے کیدو۔ دَ دے مدرسو دَ اخراجاتو دَ پوره کولو دَ پاره به په اوقاف مقرر کیدل۔ په اندلس کښې دَ علمی ترقیٔ اندازه دَ دے خبرے نه لګیدے شی۔ چه دَ اندلس دَ خلفاؤ په کتب خانو کښې شپږ لکه کتابونه جمع وُو۔

مونږ ته په دے زمانه دَ یورپ بعضے اهمے ښتے داسے ښکاری چه دَ اسلام او مسلمانانو نه متاثره وے۔ دَ قسطنطین جانشین مائیکل هم دَ مسلمانانو په رنګ دَ استوګنے طریقے اختیار کړے وے۔ هم دغه رنګ فریډرک دویم (FREDERICK II) د جرمنی په بادشاه هم او د سسلی راجه دوئم هم دَ مسلمانانو قدردان وو۔ اسلامی تمدن په یورپ ژَر اثر غوړول شروع کړے وو۔ او هغه په قرطبے او غرناطه ته راروان وو خاص طور دَ فرانس او دَ جرمن دَ مسیحی پادریانو یو لوئے تعداد دَ هسپانوی یونیورسټیو استفاده کوله۔ دَ یونانیانو قدیم علمونه دَ عربیٔ په ذریعه دَ یورپ ژبو ته اوړیدے۔ دغه رنګ څه وخت چه دَ پیرس یونیورسټی قائمه شوه نو دَ استاذانو اکثریت دَ داسے خلقو وو چا چه دَ عربیٔ په واسطه علمونه حاصل کړی وو۔ کومو انګریزان عالمان چه دَ ټولو نه روميے دَ سپین مدرسو ته راغلی وو۔ دَ دے مشهور او اهم سړی دادی:۔

MICHAEL ... ROGER II

۱) دباث ایډ لارډ (ADELARD OF BATH)

۲) د چسټر رابرټ (ROBERT OF CHESTER)

۳) مائیکل سکاټ (MICHAEL SCOT)

دے رومبنی ذکر شوی بناغلی په لاطینئ کښ دَ عربئ ډیر کتابونه ترجمه کړل۔ او دے اخیری دَ ارسطو دَ عربئ ترجمونه دَ انګریزی ترجمے اوکړے۔ دَ دے نه علاوه روجر بیکن (ROGER BACON) او چاسر (GEOFFREY CHAUCER) هم دَ عربی علمونو نه متاثره وُو۔

ذکه په آخیر کښ دَ بعضے هغه غیرمتعصبه یورپینو علماؤ حوالے ورکوم چه په ارت زړهٔ ئے دَ عربو دَ علم او فضل داد ورکړے دے۔

دَ ایډ لارډ آف باث قول دے چه "ما علم دَ خپلو عربو استاذانو نه زده کړو"۔

سټینلے لین پول (STANELEY LANE-POOIE) لیکی"۔ هغه وخت چه په علم او فن کښ کومه ترقی دَ سپین مسلمانانو اوکړه دَ بل قوم نصیب نشوه۔

دَ انګلینډ فرانس او جرمنی طلباء به دَ هغه چینے نه سیرابه کیدل چه دَ سپین په ښارونو کښ به بهیدله"

سد یو ځرانسوی لیکی" څونړ دَ ټولو دَ علم او فضل سرچینه دَ عربو قوم دے۔ دَ چا کمالات چه مونږ په غلطئ سره خپل طرف ته منسوب کړیدی۔ دَ عربی کتابونو دَ لوستو نه داسے معلومیږی چه دَ دے کمالاتو اصلی ایجادکونکی عرب وُو۔

جارج هنری لو یس (GEORGE HENRY LEWES) لیکی "۔ داخبره منلے شویده۔ چه عربو دَ یونان دَ فلسفے تول تحریرونه دَ تباهئ نه بچ اوساتل۔ او یورپ ته فلسفه هم دَ دوئ په برکت اورسیده۔ دَ دے نه علاوه دَ علم هیئت، هندسه، طب او کیمیا نه چه یورپ آشنا شو۔ هغه هم دَ اسلام برکت وو۔

محمد شعیب دویم کال

دَ قرآن مجید ترتیب او خوَرولو کښې

دحضرت عمر رضی الله عنه کوشش

دَ حضرت ابوبکر رضی الله عنه دَ خلافت په زمانه کښې چه دَ مسیلمه کذّاب سره دَ مسلمانانو جنګ وشهٔ. نو هغې کښې په سوؤنو داسې اصحاب کرام شهیدان شول چه هغوئ دَ قرآن حافظان وو. حضرت عمر رضی الله عنه حضرت ابوبکر رضی الله عنه ته دې خبرې اوورې ته توجه ورکړه چه که دغسې دَ قرآن حافظان دنیا نه ځی نو قرآن مجید به دَ ډیرې ځلې دَ لحاظ نه غیب شی. نو دَ اوس نه ئې را جمع کول او ترتیب ورکول پکار دی. حضرت ابوبکرؓ او فرمائیل چه کوم کار رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم نه دے کړے نو زه ئې څنګه اوکړم. بیا چه حضرت عمرؓ ورته مصلحت او ضرورت بیان کړو نو حضرت ابوبکرؓ راضی شه. تر دے وخت دَ قرآن مجید ترتیب نه وُو شوے. کثرو اصحابو څخه بیلې بیلې حصې وے هغه هم څه په هډوکو څه دَ کجورو په پاڼو او څه دَ کاڼو په تختیو لیکلې شوې وو. حضرت عمرؓ اعلان وکړو چه چا رسول الله صلی الله علیه وسلم نه څومره قرآن شریف زده کړے وے هغه دِ ماته راوړی. په اصحابو کښې دَ وحی لیکلو کار دَ ټولو نه زیات زید بن ثابتؓ کړے وُو. هغه ئې را وغوښت او په دے خدمت ئې مقرر کړو چه هر چرته دَ قرآن سورتونه یا آیتونه پیده شی هغه دِ جمع کړی. غرض دا چه په دے طریقه ټول سورتونه جمع شول. او یو څو کسان مقرر شول چه دَ هغوی په نګرانئ کښې دِ ټول قرآن مجید راغونډ او ولیکلې شی. سعید بن العاصؓ به ورته ښودل او زید بن ثابتؓ به لیکل کول. هغه وخت دَ قرآن مجید حفاظت او صحت دَ پاره یو څو خبرے ډیرے ضروری وے. اوّل دا چه ډیر لږے پوړے دِ دَ دے تعلیم خوری شی. او په زرګونو خلق حافظان شی. دَ دے دَ پاره چه پکښې دَ ادل بدل کولو او تغیر راوستو ډیره ورکه شی. بله دا چه دَ زور زیر او الفاظو صحت په ډیر اهتمام سره محفوظ شی. دریمه دا خبره چه دَ قرآن مجید نقلونه ډیر زو شی او ملک کښې ډیر زیات خوارهٔ شی. حضرت عمرؓ دا ټولے خبرے په ډیر کمال سره سرته ورسولے.

په نصف ټولو ملکونو کښې چه مسلمانانو فتح کړی وو. دَ قرآن شریف درسونه جاری کړل.

معلمان او قاریان ئے مقرر کړل او دَ هغوی ئے تنخواګانے و ټاکلے. تنخواه ګانے دَ هغه وخت سره کے نه وے. مثلاً خاص مدینه منوره کښ چه دَ دوه دوه ماشومانو دَ تعلیم دَ پاره کومے مدرسے وے دَ هغو دَ معلمانو تنخواګانے پخلس پخلس درهم دَ میاشتے وے. دکوره په سربیره او نوماړ دَ قرآن مجید تعلیم لازمی کړے شوه. لکه چه ابو سفیانؓ نوم یو معلم په دے کار باندِ مقرر شو چه قبائیلو کښ ګرځی او دَ هر سړی نه امتحان اخلی او دَ چا چه قرآن شریف کښ څه یاد نه وی هغه ته سزا ورکړی.

په مکتبونو کښ دَ بیکلو کار هم بښودلے شه عام طور باندِ ټولو خلقو ته حکمونه لیږلی شوی وو. چه هلکانو ته شهسواری او دَ کتابت تعلیم ورکړے شی.

په اصحابو کرامو کښ پنځه کسان داسے وو چه دَ حضرت صلی الله علیه واٰله وسلم په ژوند کښ ئے پوره قرآن شریف یاد کړے وو. معاذ بن جبلؓ، عباده بن صامتؓ، ابی ابن کعبؓ او ابو الدرداءؓ او په تیره تیره ابی بن کعبؓ دے دَ قاریانو سردار وو. په ځان حضرت صلی الله علیه واٰله وسلم په دے باب کښ دَ هغه صفت کړے وو.

حضرت عمر رضی الله عنه دا ټول را وغوښتل او ورته ئے اووے چه دَ شام مسلمانانو ته دَ دے ضرورت دے چه دَ قرآن مجید تعلیم ورکړے شی. نو تاسو لاړ شئ او خلقو ته تعلیم ورکړئ. ابو ایوب ضعیف وو. او اُبیّ بن کعب ناروغ وو. نو ځکه لاړ نشول. او باقی درے کسانو په ډیره خوشحالئ سره غاړه کیښوده. دَ حضرت عمرؓ دَ وینا مطابق درے حمص ته لاړل. چه هلته په ښه شان بندوبست وشه نو عباده بن صامتؓ هلته پاتے شو. او ابو درداؓ دمشق ته او معاذ بن جبلؓ فلسطین ته روان شول.

حضرت عمر رضی الله عنهٔ قرآن مجید زیات خورو لو دَ پاره دے بند و بستو نو سره سره نورے هم لارے چارے اختیار کړے. دَ ډیرو سورتونو یعنی بقره، نساء، مائده، حج او نور په باب ئے حکم ورکړه چه ټول خلق دِ دغه صوره قرآن شریف ضرور زده کړی. ځکه چه په دے کښ احکام او فرائض داخل دی. فوځی خلقو ته ئے چه ضروری هدایات لیږل نو هغو کښ به داخبره هم وه چه قرآن شریف ضرور زده کړی. وخت په وخت به ئے حاکمانو نه دَ قرآن خوانانو د جسټرونه راغوښتل دَ دے تدبیرونو نتیجه دا وه چه بے شماره خلقو قرآن مجید ولوست. په ناظره دَ قرآن لوستونکو خو شمیر نه وو. یکن حافظانو شمیر هم زرګونو ته ورسید. فوځی افسرانو ته ئے چه دَ دے

مضمون خط و نیکلو چه دَ قرآن حافظان ما ته راو لیږیٔ چه زۀ ئے دَ قرآن تعلیم دَ پاره یو ځائے بل ځائے ته و لیږم نو سعد بن وقاص ورته په جواب کښې ولیکل چه صرف ځما په فوځ کښې درے سوه حافظان موجود دی۔

دریم کار چه په دے باب کښې حضرت عمر وکړه هغه دَ اعراب (زیر، زبر، پیښ، شد، تنوین) صحیح کول او دَ الفاظو ویئا صحیح کول وو۔ او دَ دے خبرے انتظام اصل کښې تر ټولو نه ډیر مهم وه۔ دَ قرآن مجید ترتیب اوس اعلیٰ نه وی چه شوی وو نو اعراب سره نه وو شوی۔ نو ځکه که دَ الفاظو صحیح کولو کار نه وے شوے نو دَ قرآن مجید ځې ریدل څه فائده من نه وو۔

تر ټولو خبرو نه اول ئے هر ځائے ته په تاکید سره داحکم نه و لیږلو چه دَ قرآن مجید زده کړے سره دَ الفاظو او اعراب تعلیم دِ هم ورکړے شی۔ بله دا چه دَ قرآن تعلیم سره دَ ادب او دَ عربیت تعلیم هم لازمی کړه۔ د دے دَ پاره چه خلق پخپله دَ ناوړه نورو صحیح او غلط کښې بیلتون وکړے شی دریم ئے داحکم ورکړه چه کوم سړے دَ لغت عالم نه وی نو قرآن مجید دِ نه لولی۔

خواجه محمد تاجک خلورم کال
۶۱-۱۹۶۰ع

خوشحال خان خټک ــــــ د هغه ژوند او شاعري

د هر شاعر یا مفکر ژوند د هغه د ادبي پېژندنې د پاره ډېر ضروري دی. په دې نه د هغه ژوند هېڅ لورېیا نه لري. که د هغه ادبي پېژندنې یو طرفته کېنوې شي. او د هغه ژوند بل طرفته. نو ژوند به ئې بې ډټې ناتش توښ نبکاره شي. اوس چه د کوم شاعر یا مفکر ژوند را اخلې، نو دا به پکښې آدو مرو دېنه. که اقبال دے که سعدي. که شکسپیر دے که ملټن. د دې نه علاوه په دے کښ اکثر دا سے شاعران او مفکران هم تېر شوي دي. چه د چا د ژوند په حقله دومره معلومات هم نشته چه هغه څوک دے او د کوم ځائے او سېدونکے دے.

څمونږ د دے دومره وینا لنډ مطلب او مُدعا دا ده. چه د خوشحال خان خټک ژوند د هغه د شاعري نه هم زیات ضروري دے. څوک چه په خوشحال خان خټک څېړنه د RESEARCH وي. نو هغه به د بابا د ده ابخونه تر نظره ساتي. یو دا چه د هغه ژوند د جوانمردي او بهادري د کیسو نه ډک دے. او د بشر انسانیت. چوپړ نښتے موندے دے. د هغه د ننګ او غیرت پر قید ونکے توره. د هغه د پښتو او پښتونولۍ تېره نېزه، د هغه د بهادرۍ او جوانمردۍ زغره. د هغه د استقلال او رجولي جال دا واړه دا سے څېړونه دي. چه د هغه ژوند سره کلک تړلي دي. او د هغه ژوند تر روغ دے. او د پښتو د هر طالب علم او عالم د پاره د څېړنې او پام ازړدي

خوشحال خان خټک د پښتو ژبے پلار او د پښتنو بابا دے. د پښتو ژبے پلار په دے چه تر دنه وخته پورے دے ژبے د سرکاري طرفته د چا پام نه وو. لکه څنګه چه د بابا وو. لکه چه بابا پخپله هم وائی.

بندوبست مے د پښتو ژبے پیدا کړو ∴ کتے شعر د پښتو وو غیر سال
نه ئے بحر نه تقطیع نه ئے عروض وو ∴ دوه مصرعے د خفیف بحر دوه تطال

هم دغه ننګ د پښتو بابا په دے چه د پښتو نولۍ په نمرے د مغلیا کورے دیے د هغه ترے کړے دے د پښتون د عظمت د پاره ئے ملا تړلے وه. لکه چه وائی

د افغان په ننګ مے اوتړله توره ∴ ننګیالے د زمانے خوشحال خټک یم
د پښتون د پاره ئے ډېر جنګونه کړي دي. او د هر جنګ پخپله سرلښکر وو.

دا دومره لوئے بحث د بابا د ژوند په حقله څه قدرے پېژندګلو وه. بکار ده چه اوس د بابا د ژوند په ژور نظر مطالعه او کړو. او د بابا د ژوند د اهمیت سره بلد شو. دا خبره د چا نه پټه نه ده. چه بابا د مغلو

په شمېره څګونه کړې دي. د دې وجه څه وه ؟ يا دا چه خوشحال خان خټک د شاه جهان په وخت کښې د مغلو وفادا
وو. او د اورنګ زيب په وخت کښې د مغلو برخلاف. هر څوک دا يو اوږد بحث دے. ولې باندې چه مونږ په دلته په نظر
راناو شو. دا خبره هرچا ته څرګنده ده. چه د خوشحال خان نيکونو د مغلو بادشاهانو په خدمت کښې شپې ورځې تېرې
کړې دي. خوشحال خان په داسې ماحول کښې اوچيز يدو. چه د شروع نه ئې د بادشاه وخت سره تړون شو. ترڅو
چه د شاه جهان بادشاه بادشاهي وه. نو مغل د پښتنو مخالف نه وو. بابا هم د دوئ د ښېګړو اوپېرزوينو نه
ځ نه اړولو. او بار بار به ئې د هغې يادګيرنه په ځپلو شعرونو کښې کوله. ولې څه وخت چه د اورنګ زيب بادشاهي شو
د اورنګ زيب شاه جهان په بند بندي کړو. او په خوشحال خان باندې ئې هم د ظلم وستم غرد اکوزه کړو. د دې
دپاره چه خوشحال خان د شاه جهان وفادار وو. اورنګ زيب بريد و چه هسې نا چه خوشحال خان څما برخلاف
څه سازش اوکړي. د دې وېرې په بنا هغه بابا په مختلفو ځايونو کښې ترڅه وخته بلاوجه قيد اوساتلو. په دې
وخت کښې مغلو به د پښتنو ډېر مخالفت کولو. په دوئ به ئې هيڅ بې ځنځه ظلمونه کول. د دوئ جائيداد ونه ئې ترلاسه
کړې وې. وغيره -

څه وخت چه بابا د بند نه خلاص شو. نو هغه د مغلو په نيت پوه شو. بابا د دوئ برخلاف پښتنو کښې د ننګ
غيرت او پښتو جذبه راپورته کول شروع کړل -

د بابا د ژوند د دې سر سري پېژند د بنودلو نه پسته پکار ده چه اوس د هغه شاعري باندې هم څه
قدرې رڼا اوکړو. لکه څرنګ چه هغه د جنګ د ميدان سړے وو. هم دغه رنګ د شاعرۍ په ډګر کښې ئې هم سيال
نه لرلو. د هغه د شاعرۍ زياته برخه د ژوند کش مکش او شواخوږونو سره تړون لري. د تورې، زغرې، نېزې
تيرونو او کمانونو يا د ښکيالي، شاه خلي، بريالي او ترپالي وغيره لفظونه په کښې زيات ليدے شي. غزلے ئې هم اکثره
د دې قسم تورونو نه ډکې دي. دې تورو په بابا دومره اثر کړے دے. چه د ځپلې محبوبا باڼو له هم د نېزو سره
تشبيه ورکوي لکه چه وائي ـــ

لکه پټ سوارۍ د جنګ نيزې په غاړه دا اوږده باڼې پرې پورے ستر ګے ستا

بابا په هر موضوع شاعري کړې ده. که دلته مونږ د هغه مختلف موضوعات راواخلو. او په يو يو ليکل اوکړو. نو
ډېر وخت به ونيسي. نو د دې د پاره پکار ده چه د بابا د شاعرۍ سرسري جائزه واخلو. او ځان د هغه د شاعرۍ سره بلد کړو
د بابا نه وړاندې ځپاد پښتو شاعري دا سې په مکمل شکل او ډول نه وه پيش کړې. لکه چه بابا پيش کړه. د دې نه
علاوه بابا په دې کښې د خيال او فکر په لحاظ وسعت پيدا کړو. هغه د راتلونکې کول د پاره د شاعرۍ زمکه نرخېزه
کړه. د بابا نه اګاهو کښې چه شاعرۍ کښې په تصوف د نو عشق به ځکښ نه وو. که د چا شاعري به د سياسي ژوند

هنداره وه. نو دَ مینې او محبت رومانې داستانونه په پښتو له سره نه وُو. لنډه دا چه که یو خیال به پښتو جوت وَو بل به نه وُو. دا صرف دَ بابا شاعري وه. چه دومره وسعت ئې لرلو. بابا په اخلاقي، اجتماعي، عشقیه، رزمیه، بزمیه، طربیه، مزاحیه، فلسفیانه، صوفیانه، سیاسي منظومه او تاریخ هر څه باندئ اولیکل. دَ کلام یو صنف تر هم دا نه دے پاتے چه په هغې به بابا خپله طبع آزمائي نه وي کړې. لکه حمد، نعت، منقبت، غزل، مثنوي، قصیده، رباعي، قطعه، فرد، مربع، مخمس، مسدس، معشر، ترکیب بند، ذوالقافیتین، ترجیع بند، غزلِ مسلسل، معمه، هجو، هزل وغیره. هم دغه رنګ په صنائعو او بدائعو کښې تر یو صنف هم دا سے نه دے پاتے چه هغه به بابا په خپل کلام کښې په ښه توګه نه دي راوستي. لکه تجنیس، حسن تعلیل، ابهام، تلمیح، عکس، لف و نشر مرتب وغیر مرتب، تضاد، تسجیع، قلب، تکرار الفاظ ذوالفقتین، ذوالقافیتین، منقوط، بے نقط وغیره.

دَ بابا دَ شاعری په حقله دَ پوره تنې بحث نه یسته موږ لاندے هغه شعرونه ورکوو. کوم چه دَ بابا دَ ذوق نه مختلفو ګوښو سره تړون لري.

(۱) عقل سل دَ مصلحت بند و نه جوړ کا — چه دَ عشق سیلاب پرې راشي واړه نوړ کا
(۲) کفرستان دَ شاه دَ نوره نه لګوکوړ — په څړنګه تا وېروی وا ایمان ته
(۳) نوره چه تیرېږي څوک داره لره کښه — زلفې چه ولول شي څو خپل یار لره ګنه
(۴) یا دَ باز یا دَ طاؤس یا دَ شاهین دی — یا دَ نوره هوسۍ که ګورے سترګے ستا
(۵) مبتلا بلبله سرو ګل په ښنو بږ دی — لکه برهمن دَ بت، بت پرستي کا
(۶) تورے سترګے ئې نوره باز باڼه ئې نوکے — چه ښکار خاطر ئې یوړو به نوکا دو
(۷) په هر مخ کښې ننداره دَ هغې مخ کرم — چه دَ دیرے پیدائي نه تاپید دے
(۸) هر تشنه چه دَ وحدت په سیند سیراب شي — نو همه جهان ورته وته سراب شي
(۹) دَ بهلول او دَ شیرشاه خبرے اورم — چه په هند کښې پښتانه دوَ بادشاهان
یا هغه پښتانه نوره وَو دا څه نوره شول — یا دَ خدائے دے او س دا هسے شان فرمان
(۱۰) د هرچا نه چه يې طمع د وفا وی — هم هغه درته نکاره شي بے وفا
(۱۱) معدن به په هیڅ رنګ بدل نه شي — هر سرې لره ورځي غیره مقسومه
(۱۲) څوک به بد ذات ته علم و هنر ورکا — څوک رهزن ته توره خنجر ورکا؛
دَ ځان غیم به دَ ګرګ بچړے ساتي — خپل به ئې نه شی که خپل خیګړ ورکا؛
داشه بښکره دَ و ئے څکوره — خپل ځان په شرکا بل کا تر سیوره
په سنګ ئے وده میوه دردا چوی — خصلت له دَ ئي واخله اسے ورورۍ
تعلیم دَ زاغ او زغن که ډیر ورکړ — ښکار به په کله دَ باز به څېر وکړ
دَ ټوټو آچنے توره کره سازه؛ — غزا به کله په هغه ششمیر وکړ

باور خان داؤد دوېم کال

۱۹۵۸-۵۹ء

دَ معزالله خان مُهمند شاعري

حُمایه نظر کښې

دَ معز الله خان مهمند دَ شاعرئ په حقله دَ څه ویلو نه آګاهو پکار ده چه دَ شعر و شاعرئ پلوهم لږ کاڼه اوکړو۔ او ځان په دې پوه کړو۔ چه شعر څه ته وائي او شاعري څه وي؟ دَ انسان ژوند دَ احساساتو او جذباتو یو نه ختمیدونکے سلسله ده۔ دا جذبات او احساسات دَ انسان دَ ژوند سره دومره کلک تړلي شوي دي۔ او دَ دوئ په شاوند کښې دومره اهم کردار ادا کوي۔ چه دَ شاوند ویرے کشالے، مصیبتونه او تکیے یو خوا ته کړي۔ او دَ آرام او سکون پلو لاس اوکړي۔ اوس دلته دا سوال را ولاړیږي چه دا جذبات او دا احساسات به څرنګ څرګندیږي؟ نو دَ دې دَ څرګندولو رنګ رنګ طریقے دي۔ او دَ دغو طریقو نه ده کړه فطرت په مختلفو کړو ویش کړې ده۔ بعضې دَ ګړي دې دَ څرګندولو یوه طریقه غوره کړي۔ او بعضې بله۔ څوک دَ خپل نړه جذبات او احساسات دَ یو قدرتي منظر په ننداره دا ښکون کښې درګډ کړي۔ او دَ هغې یو عکس دَ کاغذ په پاڼه جوړه کړي۔ او دَ خپل عقل او فهم مطابق د زړه دردل ښوول ښکونه وړکړي۔ دَ چیاڼ ړه دَ یوے جینے دَ پیغلتوب په نشو کښې دا بیے ومړک شي۔ چه سمدستي دَ جذبات او احساسات را اولړزي او انسان په دې مجبوره کړي چه دَ حسن رنګینئ دَ خپلو خیالاتو او تصوراتو په مرسته دَ الفاظو په ډول څرګندے کړي۔ دَ انسان دے قسم جذباتو او احساساتو سره چه کوم قسم خیالات او تصورات تړلي وي هغې ته دَ مناسبو لفظو نو جامه دراغوندلو ته شعر وائي۔ دغه هله پسته چه دا جذبات او احساسات ژور، باریک او نازک وي۔ او شاعري دَ شعر هغې ته اکلے شوے طریقو او قاعدو ته وائي کومے چه دَ ادب پوهانو دَ دے دَ ښادۀ کړے دَ پاره مقررے کړي دي۔ نو دَ دے نه دا څرګنده شوه۔ چه شاعري دَ شعر دَ فن نوم دے او چا چه دَ دے فن ښادۀ کړه کړي دي هغه په شاعر یادے شي۔

دَ شعر تل ته رسیدل څه آسانه خبره نه ده۔ ځکه چه مو وړاندے اوویل چه شعر دَ ژوند باریکو او نازکو احساساتو او جذباتو نه ډک وي۔ نو دے باریکو او ژورو ته کوزیدل څه معمولي

نو حلے دَخاوند کار نہ دے۔ دَ دے دَ پارہ لویہ حوصلہ او لویہ همّت پکار دے۔ او دا حوصلہ
داهمّت بے دَ علم او زیاتہ کړے نہ ناممکن دے۔ دَ یو شاعر دَ جذباتو او احساساتو رُخ معلوم
دیرہ گرانہ دہ۔ کوم تاثیر چہ دَ هغہ پہ شعرونو خوروی۔ هغہ دَ هغۂ دَ طبیعت دَ رجحان او کیفیت
پیدا کیږوی۔ او دَ دے راز نہ پہ مونږ هلہ خبر شو۔ څہ وخت چہ مونږ دَ دہ دَ ژوند حالات
پہ داسے طریقہ او لولو چہ دَ هغہ دَ ژوند یوہ داسے نقشہ څمونږ ترنظرہ راشی۔ چہ دَ هغہ
کړہ وړہ او ناستہ پاستہ را تہ پہ کوتہ کړی۔ او دَ دے سرہ سرہ دَ هغہ دَ زړۂ او ذهن دَ خیالاتو
تجزیہ پہ داسے ډول او کړی چہ مونږ تہ دَ هغہ دَ طبیعت دَ رجحان پہ صحیح طریقے سرہ اندازہ
نو هلہ پستہ بہ مونږ دَ دے جوګہ شو چہ دَ هغہ پہ وینا پوہ شو۔ او دَ هغہ دَ مقصدیت مازہ
څمونږ پہ پوهید لو کښی پہ ښہ شان سرہ رهنمائی اوکړی۔
دَ شعر و شاعری پہ حقلہ دَ دے دومرہ پوهیدو نہ پس پکار دہ چہ اوس دَ معزاللّٰه خان
دَ شاعری پہ حقلہ څہ وینا اوکړو۔ دَ معزاللّٰه خان دَ شاعری ژبہ سادہ روانہ او سپیڅلے دہ۔ دَ معمولی
نہ معمولی دَ پوهے خاوند پرهم پہ ښہ شان سرہ رسیدے شی۔ وَلے دَ دے سرہ سرہ کوم
خیالات چہ دہ پہ خپلو شعرونو کښی څرګند کړی دی۔ هغہ ژوروَردی۔ چہ هم پکښی علمیت شتہ او
هم مقصدیت، هم دَ موضوع لوړوالے لری او هم دَ مفهوم اوچتوالے۔ کہ یو بے علمہ سړے
هغہ شعرونہ دَ زړۂ خوشحالی دَ پارہ پہ خوږ او اوچت آواز وائی نو یو عالم بۂ دَ خپل علمیت
پہ تلہ تلی او دَ زړۂ پہ تاوده کښی ورتہ ډیر پہ قدر او احترام ځائے ورکوی۔
دَ معزاللّٰه خان دَ شاعری زیاتہ برخہ عشق و محبّت سرہ تړون لری۔ کہ رحمان بابا عشق دَ دنیا
دَ پیدا و ښت سبب ګڼړی۔ او ورتہ دَ ټولو مخلوقاتو پلار وائی۔ نو معزاللّٰه خان هم دَ دنیا پہ ټولو
حکمتو نو کښی دَ عاشق انتخاب غورہ ګڼړی۔ لکہ چہ پخپلہ وائی سہ

پہ دنیا کښی حکمتونہ نورهم ډیر دی
عاشق دہ دَ همہ وُ انتخاب،

او څہ وخت نے چہ عشق دَ زړۂ دَ جذباتو او احساساتو دَ څرګندونو دَ پارہ غورہ
او ونو کہ هغہ دَ یار دَ وصال پہ اُمید دَ ډیرہ تاوَہ نہ سوزی نو هیڅ پرواہ نے نکوی۔ وَلے
ټپہ همیشہ پہ سکوو تو باندے سوزی۔ دا خیال نے پہ دے لاندینی شعر کښی څرګندہ پہ ښہ
طریقے سرہ څرګند کړے دے سہ

که په وصل کښې ئې سوځم عجب نه دے
پُښه سوزی دَ سکروټو له قربتَ

دَ هغه عشق و محبّت دَ حُسن دُښا نُست نه راو لاړ شوے دے . او دا حُسن و ښا نُست دَ هغهٔ دَ معشوقې دیدارد ے . او دا دیدار به دَ هغه هله نصیب شی . چه لکه دَ یعقوبؑ پرنګے دَ یوسفؑ دیدار پسے دواړه سترګے ړند ے کړی . لکه چه د ے شعر کښې وائیٔ ؎

دَ یعقوبؑ غوندې ړند ے کړه سترګے دواړه
بیا هاله دَ یوسفؑ مخې دیدار غواړه

څه وخت چه یو عاشق دعشق په رنځ بیمار پریوځی . نو که دَ جهان ټول طبیبان دَ هغه دَ علاج په غرض راشی . نو ناکامیا به بیرته لاړ شی . دَ دے رنځ علاج دَ معزالله خان په خیال لقمانِ حکیم سره هم نشته . سیوائے دَ خپلے محبوبے نه . دا نظریه دا رنګ ښکاره کړے د ه . ؎

یو نفس به ئے راستون له مرګه نه که
که را ټول کړے طبیبان دَ جهان واړه

لکه څرنګ چه دَ رحمان بابا خوشحال خان خټک او حمید بابا په دیوانو کښې دَ ځم کنج سره دَ زلفو دَ ښامار سره تشبیهه ورکړے شوے د ه . هم دغه رنګ معزالله خان هم دغه تشبیهه ځائے په ځائے په مختلفو نظمونو کښې په داسے دول اداکړے د ه . چه دَ شعر ښکلا سره سره دَ مفهوم لوړوالے ترِ هم څرګند د ے . لکه دَ مثال په طورئے په دے حقله دا یو شعر وائی ؎

ځ دِ کنج د ے ټوپے زلفے دِ ښامار دی
لاس دَ ویرے وروړے نشم اوږدولے

دَ معزالله خان دَ عشق و محبّت په حقله دَ دے دومره ویلو نه پس پکار د ه چه او س دَ هغه دَ شاعری نورا ړخونه اوګتو . وے چه یوا ځے حُسن و عشق دَ هغه دَ شعرونو موضوع نه د ه . لکه دَ رحمان بابا هغه هم ځان له دَ تصوف لار خوښه کړے د ه . او په د ے لار ه دَ تګ دَ پاره هغه کوم ے و سیپے غوره کړی دَ هغے اظهار ئے په خپل کلام کښې کړے د ے . هم دغه وجه ده چه هغه خپل اولس ته رنګ په رنګ وعظونه او نصیحتونه کوی . دَ نیکو کارو نو دی ملګری او دَ بدو نه ئے په امان ساتی . او په د ے دول هغوی دَ خپل عمر عبث تیرولو نه ساتی او دا وائی چه ؎

ـــ هره نوے میاشت دغه اشارت کاندی
چه شیرین عمر دِ ے پائے به رکاب

دَ قناعت تعلیم خپل اولس ته داسے ور کوی ۔

برګ و بر پیدا که هرچه خاک نشین شی
بل مَسند بهتره نشته له ترابه

که څرنګ چه علی خان دَ کینه سړی نه په دے شعر کښ سر ټکوی چه ـــ

کمینی که کینه غلیم ته ښه وے،
مړهٔ به خلاص وے علما نه له کور کینه

هم دغه رنګ معزالله خان ترِ هم ن رهٔ چو دے دے ۔ اووائی چه

ـــ له سفله سړی نه ښله آس زوغواړے
او به نه دی چا موندلی له ترابه

غرض دا چه دَ معزالله خان په شاعرئ کښ عشق هم شته او محبت هم ۔ و عظ پکښ هم شته او نصیحت پکښ هم ، حُسن پکښ هم شته او بنا ست هم ، علم پکښ هم شته او دراس پکښ هم اخلاقیات پکښ هم شته او مذهبیات پکښ هم ، اودا واړه موضوعات ئے پخپلو ښاو دو او نازکو خیالاتو کښ داسے ورګډ کړی چه دَ ډیر غور نه پس ئے سړے په اصلی مفهوم او معنیٰ رسی ۔ دَ هغه تشبیهات ، استعارات او صنائع او بدائع دَ ستائنے وړ دی ۔ په دے حقله دا شعر ئے اوګورئ ۔

ـــ چه ئے قتل که په تیغ دَ مستو سترګو
بیا لبانو ئے شفا دَ مسیحا ن دهٔ

دَ معزالله خان دَ شاعرئ ترون رحمان بابا سره ډیر جو ښت دے ۔ تر دے چه دَ دوئ په شاعرئ کښ توارد هم را غلے دے ۔ اودا توارد په یو ځائے دوه کښ نه دے بلکه ټول دیوان کښ ئے موندے شی ۔ توارد دَ شاعرئ په اصطلاح کښ هغه ته وائی کوم وخت چه دَ یو دوه شاعرانو خیالات یا الفاظ یو بل سره ټکر او خوری ۔ او اتفاقاً سره سمون او خوری ۔ نو پکار دهٔ چه د معزالله خان او رحمان بابا هغه شعرونه او لیکلے شی په کوموکښ چه توارد را غلے دے ۔ نو دا خبره به په مونږ په ښه شان سره ښکاره شی ۔

معزالله خان دَ خپل محبوبِ حقیقی دَ قد په حقله داسے وائی ۔

- بې رسوله معراج نه دې چا مونده
څه په رسم ستا د قد و بالائی ته

او رحمان بابا دا مفهوم په دې طريقه ادا کړې دے۔

- قد ته دِ څوک نشی رسیدے له بلنده
دے چه معراج وته بنا نه د پیغمبر دی

د معزالله خان د شاعرئ د مطالعے کولو نه پس مونږ په دے نتیجه رسو۔ چه کوم سادګی او روانی، د تخیل الوت او د تشبیهاتو او استعاراتو ښکلا چه مونږ د ده په شاعرئ کښی وینو نو ځونږ مینه پرې د رحمان بابا ماتیږی۔ دے دلته سمدستی ځونږ په ذهن یو شک شانے پیدا شی چه معزالله خان د رحمان بابا د دول شاعری څنګه اختیار کړه۔ او دومره ډیر توارد د دے نو په شاعرئ کښی څنګه راغلو۔ د دے شک د لرے کولو د پاره مونږ سره سیوا د څیړو اندازو او قیاساتو نه بل هیڅ نشته۔ او دا اندازے او قیاسات یه مونږ په منطقی دول د دے شک د لرے کولو د پاره کیږ نه کتړو۔ د معزالله خان په شعرونو د رحمان بابا د شاعرئ رنګ خوږ ردے نو د دے نه مونږ دا اندازه لګولے شو چه معزالله خان د رحمان بابا مریدی اختیار کړے ده۔ او د ده د شعرونو په ویناے پوره پوره عمل کړے دے۔ او د ده د شاعرئ د نور روانی مننه ئے هم کړے ده۔

- د تمامے پښتو نخوا له شاعرانو
معزالله عبد الرحمٰن دے منتخب

او په بل ځائے کښ د رحمان بابا شعرونه کرامت کنړی۔

- که د شعر کرامت د چا نه څواړے
معزالله د رحمان شعر کرامت دے

دلته معزالله خان د رحمٰن بابا سره د عقیدت منتۍ حد ته رسیدلے دے۔

د یو سړی د کردار اثر د بل سړی په ذهن کیږی۔ د ده دا ذهن د هغه د کردار پوره پوره عکاسی کوی۔ څه چه هغه ویئلی وی، دے ئے هم وائی او څه چه هغه کړی وی دے ئے هم کوی۔ نتیجه ئے دا شی چه د هغه د مرګ نه پس د ده ټول ژوند هم د هغه په رنګ شی۔ دلته پیری او مریدی مداخله اوډ سی۔ هم دغه حال د رحمان بابا او معزالله خان هم دے۔ معزالله خان د رحمان بابا

دَ کردار نه دومره متأثر کیږی اوُد هغه وینا دَ دهٔ په زړهٔ دومره اثر کوی چه سمدستی په جوش کښ راځی قلم را اخلی او چه څه لیکی نو لوستونکی ئې دَ ده او دَ رحمان بابا دَ شاعرئ په فرق نه پوهیږی ولے څه وخت چه مونږ دَ دے دواړو شاعری په غور و فکر او ژور نظر کورو نو په بعضے شعرونو کښ د دواړو خیالات یو رنګ ښکاره شی. او کله کله خو ئې لفظونه هم یو رنګ اوخیژی. نو مونږ دے ته هیڅوک نشو بیولے. ولے چه دا توارد یوازے په پښتو ژبه کښ ندے بلکه په اُردو، فارسئ او نورو ژبو کښ هم موندے شی.

دا نه چه لږ یوازے دَ معز الله خان او رحمان بابا په شاعرئ کښ توارد راغلے دے. دمعز الله خان دَ خوشحال خان، حمید بابا او علی خان سره هم توارد راغلے دے. او دَ دے خبرے دَ ثبوت دپاره دا لاندینی پرله پسے شعرونه دی.

دَ خودئ په حقله چه خوشحال خان ختهک خپله نظریه چه څنګه څرګنده کړے ده. چه:-

ــه　دَ منت دارو که مرم پکار م ندی ⁂ که علاج لره م راشی مسیحا هم

نو معز الله خان هم دَ هغے تعریف قائل دے او وائی چه

وږے کیږه دَ منت ترخوراک ښه دے ⁂ دَ منت ترشاله ښه ده شړئ شاره

دَ حمید بابا دَ معشوقے خوله تنګه وه. او ما دَ حُسن نخښه ګڼلے شی. غنچه هم دَ دے حُسن نه متأثره شوه. په دے کښ شک نشته چه دَ غنچے خوله دَ رومبے نه تنګه وه. خو چه څه وخت دَ معشوقے دَ خولے دَ حُسن غم ورسره شو نو نوره هم دغسے پاتے نشوه. زړهٔ ئے راټک شو. او اوسپر د شوه. دا خیال حمید بابا داسے څرګند وی ــه

ــه　چه ئے ستا دَ تنګے خولے تصوُر واخست ⁂ په دے فکر کښ غنچه شوه په زړه تنګه

معز الله خان هم دغه خیال داسے بیانوی ــه

ــه　ستا دَ تنګے خولے لهٔ رشکه له حسده ⁂ کیروان شیرے کا غنچے باد صبا ته

علی خان دَ زلفو دَ مار سره او دَ خط دَ میږیتون سره تشبیه داسے ورکوی.

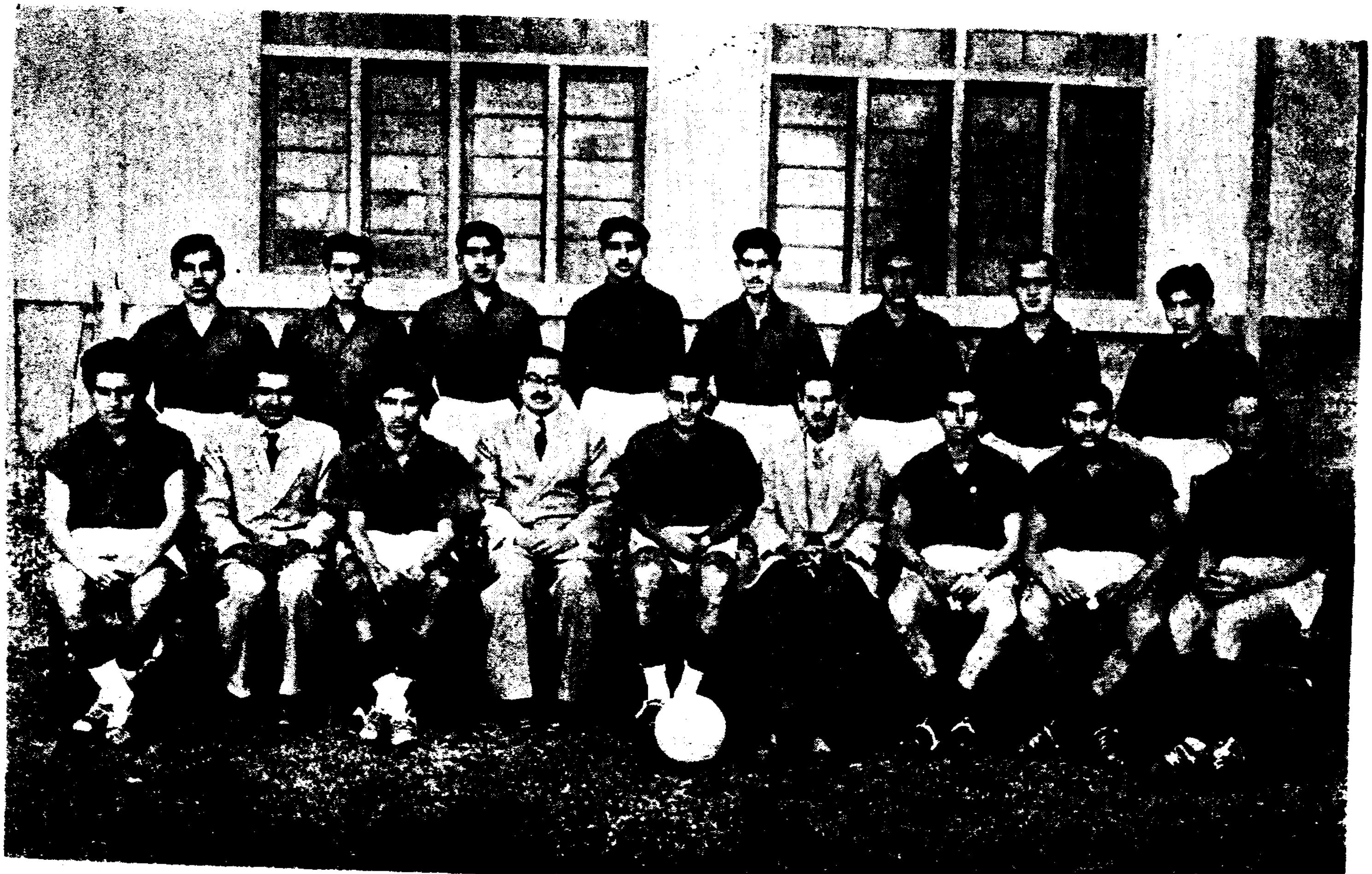
ــه　خط ئے وار دَ زلفو تیر کړ و علیخانه ⁂ کله مار دَ میږیتون سره چلیږی

معز الله خان هم دغه تشبیهات په دے شعر کښ داسے ښکاره کوی.

ــه　معز الله خط ئے بازار دَ زلفو تیر کړو ⁂ دَ میږو دَ لاسه مار خوږ ګډ شی.

Inter Football Team Runners up in the Board Tournament

Govt. College Peshawar 1962—63



***Chairs*:—** (L to R) Javed Mohammad, Mohammad Nazar (DPE), Nawaz Mohammad (Vice Captain), Prof. Mohd Ismail Sethi (Principal), Yar Mohammad (Captain), Prof. Qazi Mohammad Aslam (I/c), Mohabat Khan (Secretary), Daud Khan, Nazir Ahmad

***Standing*:—** Kh. M. A. Qureshi, Abdur Rashid, Noor Mohammad, Atta Mohammad, M. Tahir, Sardar Mohammad, Mohammad Rafiq, Mohammad Ibrahim.

رحمن حسین (دی ډیکال)

د تصویر دوه اړخه

دا دنیا د هر انسان د پاره جنت هم دے او دوزخ هم. لو دا د هر یو انسان په خپلو اعمالو منحصره ده. که یو ښه انسان نیک او ښه اعمال اختیار کړی. او په هغو ټینګ شی او عمل پرې شروع کړی. نو هغه دا دنیا خپل ځان له جنت جوړولے شی. او په ډیر عزت او خوشحالئ یا خپل نه مړه ضمیر په اطمینان به خپل ژوند تیره ولے شی. او د غسے به ځان له په آخرت هم ابدی ژوند او جنت د خدائے پاک په فضل و کرم وګټی. او د دے انسان دا اعمال د دے اتلونکے نسل د پاره د لارے مشعل جوړیدے شی. او خپل راتلونکی نسلونه به ئے په ډیر عزت او احترام سره یاده وی. او همیش له به ئے ښه وائی. او دا سے به تل ترتله په دے دنیا د هغه نوم ژوندے وی. او که یو انسان بد اعمال را واخلی او بدکاری شروع کړی. نو دا دنیا به پرې تنګه شی. او کنی آخرت خو به ئے خراب شی او د خلقو د غندنے وړ به شی. خدائے په خپل قرآن مجید کښې فرمائیلی دی. چه انسان ما په ډیر ښه او اعلیٰ حالت کښې پیدا کړو. او بیا مې ډیر ښکته ځائے ته وی ګذار کړو. ملو د هغو خلقو نه چه ایمان ئے داوړ او ښه اعمال ئے اختیار کړه. هغوی سره نه ختمیدونکے اجر دے د دے آیت مبارک او تجربے او مشاهدے نه هم ښکاره ده چه اخلاقی کمال او زوال. صلاحیت او قوت په انسان کښې یو شان اېښودے شوے دے. او د دوی په پالنه او ترقئ کښې علاوه د نورو څیزونو نه د ښه او بد صحبت ډیر دخل دے. مثلاً که یو سړے په ښه صحبت کښې داخل شو نو ضروری امر دے چه هغه به ښه کارونه کوی. یعنی چه هغه صحبت کښې نور خلق څه کوی نو هغه سړے به هم هغه کارونه کوی. او که یو سړے په بد صحبت کښې داخل شو. نو په بد کارونو به سر وی.

ځ به د دے خبرو د وضاحت د پاره یوه واقعه بیان کړم. په تیره زمانه کښې یو مصور دیو په ښار کښې اوسیدو. چه هغه په خپل فن کښې ډیر ماهر وو. هغه یوه ورځ خیال وکړو. چه حضرت عیسیٰ علیه السلام یو داسے تصویر جوړ کړی. چه هغه نه د هغه مبارک ، پاکیزګی او معصوم

ښکاری. دَ دې غرض دَ پاره هغه ته دَ یو ماډل ضرورت راپیښ شو. دَ څه وخت نه پس ئې هم دغه ښار کښې چه دا مصوّر پکښې اوسیدو. یو داسې هلک ومونده. چه په شکل ډیر ښائسته او معصوم وو. مخه مصوّر هغه وړوکے هلک راوستو او دَ هغه دَ وړکی ماشوم په نمونه ئې دَ حضرت عیسیٰ علیه السلام دَ ماشوموالی پاکیزګی او عصمت دَ خپل فن او کمال په مرسته په یو تصویر کښې نقشه راښکله. چه مصوّر دا تصویر مکمّل کړو. او بازار کښې ئې دَ نمائش دَ پاره پیش کړو. نو خلقو دا تصویر ډیر خوښ کړو. او دَ مصوّر کمال ئې وستائیلو.

ډیره موده پس دې مصوّر دَ انسان په صورت کښې دَ شیطان د نقشې راښکلو خیال وکړو. هغه دَ دې غرض دَ پاره "یهودا" (JUDA) منتخب کړو. "یهودا" دَ عیسیٰ علیه السلام هغه شاګرد وو چه عیسیٰ علیه السلام سره ئې غداری کړې وه. او دښمنانو ته ئې پرې جاسوسي کړې وه. مصوّر دَ "یهودا" په شکل دَ سړی په تلاش کښې ډیر وګرځید وخو بیا ئې نه مونده. آخر یوه ورځ دا مصوّر په بازار کښې روان وو چه یو څو بد معاشان ئې چه دَ شرابو په نشه کښې ډوب وُو تر نظره شول. هم په دغه شرابیانو کښې یو سړے وو چه دَ نورو نه په ډیر بد حال بد رنګ او بده ورځ وو. مصوّر دَ دې سړی انتخاب دَ "یهودا" دَ ماډل دَ پاره وکړو. او هغه سړے ئې ځان سره بوتلو. او دَ هغه په نمونه ئې دَ خپل فن په نادر دَ "یهودا" نقشه په تصویر کښې سازه کړه.

دا خبره ډیره حیرانتیا ده. چه دا بد معاش شرابي چه دَ "یهودا" دَ پاره ماډل شوے وُو. هم هغه کس وو چه په وړوکوالی کښې د خپل معصوم شکل او مخ له کبله ئې دَ حضرت عیسیٰ علیه السلام دَ تصویر دَ پاره دَ نمونې کار ورکړے وُو.

څوک چه غور او کړو نو دَ حیرانتیا خبره نه ده. ځکه چه په شروع کښې دا ویلي شوی دی چه ښه او بد په انسان کښې یو ځائې ایښودې شوی دی. او انسان دَ خپل ښه اعمالو له کبله خپل ځان ښه او نیکی کمال ته رسولے شی. او دَ بد وچادو په سبب ځان دَ بربادئ کړنګ ته هم ګزارولے شی.

(په شکریه دَ ریډرز ډائجسټ)

عبید الله جان داوړزی
(راولپنډۍ کالج)

د ماشومانو احساسات

کله چه ماشوم د هغه خاموشه دنیا نه په دې فراخه دنیا کښې سترګې اوغړوي. نو د دې نه پس د احساساتو دوره دده د نوې ژوند فلسفې نه شروع شي. او دغه رنګ دوره ودده د احساساتو نه پېدا شي. او دغه احساسات په اصلي معنو کښې دده د ژوند د تجربو او علم بنیاد جوړ شي. او د دې په برکت دا ماشوم د خارجي دنیا د علم خزانې خپلې کړي. او د خپل ځان نه ګېرچاپېره فضا نه خبردار شي. که ماشوم ته د فطرت د طرف د دغه پخه طاقت نه وې ورکړې شوې. نو ده به هېڅ کله هم د احساساتو نه سوړې نه دې خپل کړې. څنګه چه دده احساسات پېښه پوې. هم دغه رنګ ورسره ودسره د ماشوم د ژوند ماڼۍ هم ډنګه شي. او په دې ماڼۍ کښې د احساساتو ډېره لویه حصه ده. نو ځکه په نفسیاتو پوهه او د علم په کالي پناسته میړنی د احساساتو په اهمیت زور ورکوي. او دا ئې چه ترکومه پورې د ماشوم د زدکړې او د ژوند ماڼۍ په عالم فنا باندې دا وږدو تعلق دې. نو د احساساتو شمع د لاسه غوره ذول نه دی پکار.

نبه ده: نو راځئ چه دا معلومه کړو. او کله د کب په ادبو کښې سترګې اوغړوو. چه د زدکړې په سلسله کښې احساسات څومره ضروري دي. او د ژوند ماڼۍ په اوډو د ولو کښې څومره څومره لاس اوږدي.

کوم وخت چه ماشوم په دې دنیا کښې سترګې اوغړوي. او دده د ژوند فلسفه شروع شي. نو د دې سره سم د ماشوم د احساساتو دنیا بیدار شي. کله چه ماشوم اوږې شي. نو هغه و لوږه مړ و نو د پاره هغه په ژړا شي او ورچې پرېتې کړېکې وهي. او په دې خوارکه سره د دې د خپل ولوږې احساس پوره کړي. او په خوشحالۍ خوشحالۍ سره د هر او جیب د برګانو په میاشتو کښې هم د مور سینې پورې اینښتې اوده شي. دغه رنګ ماشوم د ډېرو احساساتو یوه مجموعه ده. مثلاً

اوّل. د لیدوکتو احساس. دویم د آوازونو اورېدو احساس. درېم. د حرکت کولو احساس

اوّل. د لیدوکتو احساس:— کله چه ماشوم په دې فراخه دنیا کښې سترګې پرانځي. نو دده د پیدا کېدو نه پس د لیدوکتو احساس شروع شي. او د خپل ځان نه ګېرچاپېره د شیزونو په لیدوکتو خوشحالی محسوسه وي. او کله چه د نړا اوبي. نو د نړا طرف ته لاس اچوي. چه هغه دا حاصل کړم.

دویم. د آوازونو اورېدو احساس:— او دغه رنګ دا ماشوم کله په سپېرېدو شي. نو د مختلفو آوازونو

ودریدلو او په هغې ډ متأثره کېدلو احساس وړمې خورې کړی. او دا احساس د ماشوم په ژوند کښې ډېر لوئ اهمیت لری. او چه د کوم طرف نه آواز راځی. نو زړه هغې ته ډېرې ته غوږونه نیغ کړی. او د پوهېدو کوشش اوکړی. او اکثر داسې هم اوشی. چه بعضې وخت ماشوم غیر آواز داوری. نو دا د ماشوم په دماغ کښې د لاشعور خانې ځائے اونیسی. او ترعمره عمره د هغه زړه کښې پره ناسته وی. او بے علم مور پلار ماشوم په مختلفو آوازونو د ېرُولو کوشش کوی. او دغه ماشوم د بزدلئ یوه مجسمه پاتے شی.

دریم د حرکت کولو احساس:— دا نوے کلی کله چه په سپرېدو شی. نو هم دغه رنګ د حرکت کولو احساس ئے هم خپلې وزرې په دے خورےکړی. او ځکه ماشوم د خپل وجود د مختلفو حصو حرکت کولو علم زده کړی. او هغه په خپل معمولی حرکت کولو هم پوهه شی. او د ځائے په لوېد ژوړدو هم ورسره ورسره پوه شی. او کله چه ماشوم د لوړے نه ژوړے ته شی. نو په چغو سر شی. او دا کوشش کوی چه په سمه کېنی. او اکثر چه مور پلار د ماشوم دا حالت اووینی. نو د ځان د خوشحالولو د پاره د دے نه ننداره جوړه کړی او دا بے وسه کسه ماشوم د لوړے نه ژوړے ته کړی. نو ماشوم د ډېرے په چغو او کړیکو د هلو سر شی. او مور پلار ئے دا خیال نه کړی. چه دا د ماشوم د فطرت نه خلاف کار دے. او ماشوم د وېرے خوئی زده کړے نه علاوه په ده کښې د ځان غیر محفوظ ساتلو احساس هم پیدا شی. او د دے احساس په وجه د خود اعتمادی نه بنا لسته کالے ماشوم په یو کوټک کښې ورا دغوږزوی. او لکه د اګد په رنګ ځان صفا پرېږدی. او بیا ترعمره عمره ځان د بل محتاج شمیر کړی.

پاتې له خو نرۍ دنیا نه

کاش! چه تا...... ځما...... ځما یوه خبره خو...... او س ید ے وے کته...... چه دا...... چه دا ځما هم هغه...... هم هغه...... غیرتی ورور...... شمروز خان دے...... چه له خپل پلار...... او تره...... په بدل کښی ئے...... په سکو نو...... بهادر خیلی...... د مرګ خوئے له واستول...... کاش چه تا خو...... لږ صبر کړے وے...... ک ک ااا ش......"

او بیا ئے شمروز خان ارمانی او بد نصیبه خور هم د هغه خواه له اوس سپېدله ؛

سید خلیل احمد
(اولنی کال)

عِلم

علم یو ډیر ضروری شے دے. او خاصکر بیا په ننَ صبا زمانه کښ خو علم حاصلول ډیر ضروری دے.
ولے نن صبا زمانه کښ بے علمه سړے جاهل گڼړلے شی.

د غیر تعلیم یافته سړی مثال په دنیا کښ داسے دے. لکه چه کوم سړے میدانِ جنگ له تش لاس روان
ی ددے خبرے مطلب دا شو. چه هغه به خامخا دَ دښمن له لاسه ختم شی. هم دغه رنگ بے علمه سړے په هوښیارو
ښ نه شمیرکیږی. او خلق ئے هم هیڅ قدر نه کوی.

دَ علم متعلق حضور نبی کریم صلی الله علیه وسلم هم فرمائیلی دی چه طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ
عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ ط (ترجمه) دَ علم طلب په هر مسلمان سړی او په هرے مسلمانے ښځے باندے
فرض دے ــــ دے نه معلومیږی چه علم څومره قدر و قیمت لری. او څومره ضروری دے. نن نه څوارلس سوه
اله مخکښ حضور نبی خوږ پیغمبر صلی الله علیه وسلم دَ دے د حاصلولو حکم ورکړے وو. دَ علم دَ ضرورت اندازه دَ نبی
کریم صلی الله علیه وسلم دَ دے فرمان نه لګیدے شی.

نن صبا صرف هغه ملکونه ترقی یافته گڼړلے شی. چه په هغے کښ د تعلیم ډیر انتظامات وی. او خلق ئے هم
تعلیمیافته وی. شکر الحمدُ لله ډیر دَ خوشحالی مقام دے. چه پاکستان کښ تعلیم دَ پاره ډیر انتظامات دی. او خلق ئے
هم تعلیمیافته دی. دَ علم حاصلولو چه دومره ډیر ضرورت دے. نو هر چا ته پکار دی چه دَ علم حاصلولو پوره
پوره کوشش اوکړی.

دَ تعلیم یافته او دَ غیر تعلیم یافته سړی ترمیانځه ډیر فرق دے. لکه چه څرنګ ټولو ته معلومه ده. چه
د عالم سړی په مجلس کښ او په خلقو کښ او علاوه دَ مجلس او خلقونه په هر ځائے کښ ډیر قدر او عزت وی. او
دَ بے علمه سړی معامله بالکل برعکس وی. او په خلقو کښ هم بے قدره وی. رښتیا خبره ده چه د علم په ذریعه
سړے ځان اوچتو درجو له رسولے شی.

دَ علم متعلق په عربئ ژبه کښ یو فقره ده چه : " اَلْاَدَبُ یَرْفَعُ الْقَامِلَ "
(ترجمه) علم او ادب ګمنام سړے هم اوچتو درجو له رسوی! دَ دے فقرے په رښتیا والی کښ یو واقعه مشهوره
دے. دا چه خلیفه مامون ډیر علم دوسته سړے وو. اکثر به د هغے په دربار کښ دَ عالمو خلقو مجلس به جوړ

او په مجلس کښې به رنګ په رنګ مسئلو باندې به بحثونه کیدل. یو ورځ چه مجلس شروع شو. نو په دې وخت یو سړې رانوتو. چه د شکل نه ډیر غریب ښکاریدو. او په بدن ئې جامې هم ډیرې زړې وې چه دا ننوتلو نو ټولو نه وروستو په یو ګوشه کښې کیناستو. اتفاقاً په بحث کښې یو مشکله غونډې مسئله دا پېښه شوله. دَ هغې مشکلې مسئلې جواب دې غریب سړي مجلس ته واوروլو. خلق ډیر حیران شو. او مامون هم حیران شولو. او هم خوشحاله شو. او هغه نه ئې پاسولو. او په ښه ځائې کینولو.

دې نه پس په مجلس کښې بیا هم یو بله مسئله پېښه شوله. په دې مسئله کښې هم دې غریب سړي جوابونه د ټولو په مقابله کښې ښه وُو. خلیفه مامون تر نه ډیر خوشحاله شو. او اول ئې چه په کوم ځائې کینولې وُو. د هغه ځائې نه ئې هم په ښه ځائې کینولو.

څه لږ وخت پس په مجلس کښې چه درېیمه مسئله پېښه شوله د دې حل هم د دې غریب سړي جواب د ټولو په مقابله کښې بیا ښه او درست دُو. په خلیفه مامون باندې دومره ډیر اثر اوشو. چه هم هغه وخت له خپل ځائې نه پاسیدو. او هغه سړې له لاسه ئې اونیولو. او ځان سره ئې نزدې کینولو. دَ مجلس ختمیدو نه پس مامون خپلو نوکرانو ته حکم ورکړو. چه دې سړي ته ادبه او کپړې راوړی. دَ حکم تعمیل اوشو. څه وخت چه هغه سړي جامې واچولې. نو هغې نه پس مامون ځان سره په طعام کښې هم شریک کړلو. او د دې مامون سره دومره نزدې ناست وو. لکه چه یو بادشاه بل بادشاه سره نزدې ناست وی. او مامون ورله یو ټک ډېر هم انعام هم ورکړو. او په لږه موده کښې په لویو لویو عالمانو خلقو کښې حساب شولو.

د علم حاصلولو ډیر فوائد دی. اوله فائده ئې دا ده. چه د نبی کریم صلی الله علیه وسلم په حدیث باندې به تعمیل اوشی. او چه په حدیث باندې چا عمل اوکړو. پس ضروری خبره ده چه هغه د خدائے او رسول کریم خوشنودی هم حاصله کړه.

بله فائده دا ده چه علم والا په هوښیارو خلقو کښې شمیرلې شی. او د هوښیارو هر څوک قدر ومنزلت کوی. دَ علم دا فائده هم ده. چه سړی کښې د علم په ذریعه دا قابلیت پیدا شی. چه هغه په نیک او بد کارونو کښې فرق اوکړی. ضروری خبره چه څوک نیک او بد کارونو کښې فرق اوکړی نو هغه به له بدو کارونو نه هم ځان اوساتی. دَ دې فائدو نه علاوه نور ډیر فوائد هم دی ــــ آخرکار مونږ په دې نتیجه ته اورسیدو. چه صرف علم یو داسې شے دے چه د دې په ذریعه د خدائے تعالیٰ او دَ نبی کریم صلی الله علیه وسلم خوشنودی حاصلیدے شی. او صرف د علم په ذریعه عزت حاصلیږی. او صرف د علم په ذریعه سړے ځان له بدو کارونو د ساتلے شی. پس دا خبره ښکاره شوله. چه هر یو له علم حاصلول ضروری شے دے.

ن بهادر خټک شملو درم کال

پاکستان او د آبادئ مسئله

څه وخت چه انسان پیدا شی. نو خدائے ورته دوه لاس او یوه خوله ور کړی وی. د دِ
لب داده. چه انسان ته خدائے دوه داسے وَسیلے (WEAPON) وکړے. چه یو خوا ئے پیدا کړی
بل خوا ئے ختم کړی. دا دواړه وسیلے د یو بل هر وخت حاجتمند وی. او د یو بل د مدد نه بغیر
ئ کار سر ته نشی رسولے. لکه څنګه چه انسان د یو بل مُتاز او محاجتمند وی. یو ئے پیدا کوی
بل ئے خوری. دغه شان دا سِلسله جاری ده. او تر قیامته به جاری وی.

خو دلته دا سوال پیدا کیږی چه آیا یو ماشوم چه پیدا شی. نو دے د کار کولو قابل وی
دے د ملک و سیلے عمل ته راوستے شی. نو جواب ئے دادے. چه نه او هیچرے نه. دا وخت
شوم صرف د بل په آسره پروت وی. بل ئے پیدا کوی او ده ته ئے په خوله کښ اچوی.

د دے نه علاوه یوه بله نرقه هم شته. چه لکه د ماشوم په شان ئے په خوله کښ غواړی.
وی د سړی په نسبت زیات کار نشی کولے. او د کور کار د پاره پیدا شوی ده. چه د کور رونق
جوړ وی. او د ماشوم خصمانه او نوره د کور رما ته ګوره په ښه شان سره اوکړی. نو مونږ وئیلے
و. چه سړے د باهر کار د پاره او ښځه د کور کار د پاره په خپل خپل ځائے مفید او موزون
. نو معلومه دا شوه. چه دے فرقو ته صرف سړی پیدا کوی. او په جولئ کښ ئے ورته غورزوی.
اوس که چرے دا سړے د کار کولو نه په شا شی. او یا د څه مجبورئ په وجه کار ته غاړه نه
ی. نو نتیجه به ئے داوی چه په کور کښ ټول ماشومان بلکه ټول خاندان به ئے واویلا کوی.
ت به ورسره غاړه په غاړه وی. او چه د څالا تو ته ئے د کور مشر کوری. نو خفه کیږی. هر
ت د مرګ سوال او التجا کوی او یو وخت راشی چه د مرګ دا سوال ئے هم قبول شی. دنیا د
نه خلاص شی. او دغه غم ئے بال بچ ته په ورثه کښ پاتے شی. او هم د غه شان دا سِلسله
ی وی.

دغه رنګ مثال د یو ملک دے. چه آبادی ئے زیاتیږی نو ده ئے ته به هم په خوله کښ ورکیدے

شي نو اوس که چرې د دې ملک وسيلې زياتې نه وي. نو د خوراک څښاک څيزونه به کم وي. د خلقو معيارِ ژوندگي به لاندې وي. ملک به پر تنگ لنډ وي. په ټکړو ټکړو کښې به تقسيم وي. د کر کيلې قابل به نه وي. په گز گز کښې به خلق اوسي. او يو داسې وخت به راشي چه د قدم د اغستو ځائ به هم نه وي.

اوس اوس مو په اخبار کښې ليدلي دي. چه په دنيا کښې هر درې سيکنډه بعد يو بچې پيدا کيږي. او د دې حساب مطابق په هفته کښې شل لکهه زياتيږي. په ۱۸۳۰ء کښې د دنيا کل ابادي يو ارب وه. په ۱۹۳۰ء کښې دوه چنده او په ۱۹۶۱ء کښې درې چنده يعنې دريش ارب ته اوس سيده او د ماهرينو خيال دې. چه په ۲۰۰۰ء کښې به شپيتو اربو ته رسي. او شپږ سوه کاله پس به انسان په گز گز فاصله کښې وي. په ۲۶۰۰ء کښې به انسان په سپوږمۍ او ستورو باندې سکونت اختيار وي نو اندازه او لگوئ. چه څه به وي. او څه به کيږي. مونږ ته پکار دي. چه ستورو ته د ختو نه مخکښې آبادي کمه کړو. او د ملک هر وکړې خوشحال وخت تير کړي. دا مسئله د پسماندو ملکونو د پاره ډيره خطرناکه ده. نور ملکونه به پرې پوهه دو. د خپل ملک مثال به واخلو. چه آبادۍ ئې څومره زياتيږي. او د ملک په معيشت باندې څه اثر غورزوي. د پاکستان آبادي ۱۹۶۱ء د مردم شمارۍ مطابق تقريبًا نهه کروړه او اته دريش لاکهه ده. او په درې کښې تقريبًا لس لاکهه اضافه کيږي. يعنې په سو کالو کښې ۲۳۰۸ برابر اضافه کيږي. او د دې په وجه څمونږ د ملک يو لاکهه ايکړه زمکه بيکاره کيږي. ولې چه يو خوا دا زمکه ټکړې ټکړې شي. او بل خوا ته نه يوازې د نورو بلکه د ځانونو طريقو د کر کيلې نه هم پاتې شي. پيداوار کم شي او د غربت واويلا د کور کور نه راځي. لکه چه اوس اوس څمونږ صدر صيب امريکې ته مخاطب شوې وو. چه څمونږ اوله مسئله د آبادۍ مسئله ده او مونږ ستا طرف ته د امداد د پاره کورو. نو د دې نه معلومه شوه. چه څمونږ غربت هم د زياتې آبادۍ د وجې دې. ولې چه امريکه پاکستان ته تراوسه پورې ۱۰۱۵ ارب ډالره امداد ورکړې دې. او دغه شان نورو ملکونو هم ورکړې دې. خو تراوسه پورې مونږ دا مسئله حل نه کړې شوه. ولې چه د پاکستان علاقه محدوده ده. يعنې ۳۶۵۵۰۲ مربعه ميله ده. او ابادي ورته کال په کال زياتيږي. او معلومه خبره ده. چه زمکه ئې نشي زياتې دې. د دې مثال به داسې واخلو. چه که چرې يوه تنگه لنډه کوټه وي. او کټونه هم په کښې محدود وي. او ناڅاپه ډير ميلمانه راشي. نو دوئ به مجبوراً په يو کټ کښې دوه دوه څملي. او دغه شان به شپه په ځمکه

ناآرام بے آرامہ تیرہ کوی. نو دغہ رنگ کہ خمو نږ نورمیلما نہ جاری اوساتلے شی. نو نہ یوا ځے
مونږ بلکہ مونږ بہ هم تنګ لنډ وُو. ځاوند بہ مو خراب وی. او دَ ځاوند نہ بہ پہ مرګ خوشحال
یو. نو راځئ چہ پہ جمعہ سرہ دَ نو و میلما نو څہ انتظام اوکړو. چہ ژوند مو خوشحال او پہ آرام
سرہ تیر شی. دَ دے دوہ طریقے دی. یا خو بہ آبادی کمہ وُو. او یا بہ بے کارہ و سیلے پکار راولو.

I ا۔ دَ آبادئ کمے :۔ آبادی پہ دوه طریقو کے دے شی. یو خو دا چہ دَ انسان دَ طرفہ څہ طریقہ
اختیار کړے شی. مثلاً کم عمر کښ وادہ نہ کول. دَ یوے نہ زیاتے ښځے نہ کول. او نور ہے هم
ډیرے طریقے دی. چہ مونږ لہ پرِ عمل کول پکار دی.

دَ دے دَ پارہ ځمونږ حکومت خاندانی منصوبہ بندی جاری کړے دہ. چہ حکومت پہ ډیر
زغم کوی. خو څہ بنہ نتیجہ ئے نہ دہ بنا یلے. وے چہ خلق دِ منصوبے سرہ تعاون نہ کوی. دَدِ
وجہ دادہ چہ ځمونږ دَ ملک خلق تعلیم یافتہ نہ دی. دوئ ګنړی چہ حکومت ځمونږ پہ مذهب
کښ خلل اَچوی.

ب۔ دوئیمہ طریقہ دادہ چہ کہ چرے اِنسان پہ خپلہ دَدِ انتظام اونہ کړو. نو قدرت بہ ئے پہ
بیارو. جنګونو او نورو ډیرو طریقو سرہ کوی. مونږ تہ دَ بنګال مثال او دَ دوو جنګونو مثال یاد
دے. چہ قدرت پہ څہ رنګ آبادی کمہ کړہ. وے چہ څہ وخت آبادی پہ یو ملک کښ زیاتہ شی
نو دَ هر څیز قیمت زیات شی. او خلق کوشِش کوی چہ زیاتہ منافع اوکړو. نو هر څیز کښ ګډون
کوی او دَ دے نہ قِسما قسم بیماری جوړہ شی. او پہ ټول ملک کښ خورہ شی.

دَ جنګ مثال بہ دا سے واخلو. چہ انسان زیاتیږی. نو ملک پرِ تنګ شی. او څہ وخت چہ
ملک تنګ شی. نو بیا څہ وی. "تنګ آمد بہ جنګ آمد"

II دَ ملک وسیلے :۔ پہ یو ملک کښ کہ وسیلے زیاتے وی او آبادی ورسرہ زیاتیږی. نو دَ آبادئ
دَ زیاتیدو سرہ سرہ بہ دَ ملک خوشحالی هم زیاتیږی. وے چہ دَ آبادئ زیاتیدل. دَ مزدورو زیاتیدل
وی. او دغہ مزدور دَ ملک پہ کارخانو او نورو ډیرو ځایونو کښ کار کوی. او دَ ملک بیکارہ وسیلے
بہ پہ کار راولی. هر کار پہ ښکلی طریقہ روان وی. دَ تعلیم بنہ انتظام وی. خلق خوشحال وی. او
ټولے بیکارہ وسیلے پہ کار کښ راوستے شی. نہ دَ مقدمو او نہ دَ ملک دټکو وکیدو څہ ویرہ وی.
زمیندارہ پہ بنہ شان سرہ روانہ دی. بنہ تخمونہ او نور ډیر فائدہ مند څیزونہ پہ دیانتدارئ
او ایماندارئ سرہ کیږی. او دغہ رنګ ملک دَ ترقئ پہ مخ روان وی.

اوس به دَ پاکستان مثال واخلو چه دلته څه حال دے۔ دَ پاکستان زمکه څه رنګ چه لګګیږ
شوی دی۔ محدوده ده۔ او آبادی ورته زیا تیږی۔ خو که چرے مونږ کوشش اوکړو۔ نو مونږ
تول مصیبتو نه رے کولے شو۔ ولے چه دَ یو اندازے مطابق زمینداره په یو مربع میل با
۲۵۰ کسان ساتلے شی۔ او ځمونږ ملک تقریبًا دَ دِ اندازے نه کم دے۔ دَ غربت وجه آبادی
کیدے شی۔ خو ډیره وجه ئے بیکاره وسیلے دی۔ چه کولے ترے اوسه پورے په کار نه دی راغ
ولے چه دَ هر ملک دَ پاره یو حد دے چه هغه ته (MAXIMUM POINT) ویلے شی۔ که چرے دَ یو
پیداوار دَ دِحد نه لاندِ وی۔ نو دَ ملک وسیلے به ئے بیکاره وی۔ نتیجه به ئے غربت او مفلس
او که چرے دَ دِحد نه پورته وی۔ نو بیا هم به دا۔ ولے چه دَ دِحد نه پیداوار نشی زیاتیدے
معلومه دا شوه چه دَ دِحد نه پورته او لاندِ دواړه حالات نه دی بنه۔ دَ پاکستان تقریبًا ۴۰ یا
میلین ایکړه زمکه بیکاره ده۔ نه پکښ څه کیږی۔ او نه پکښ څه کولے شی۔ که چرے دا زمکه په
کښ را وستے شی۔ نو پیداوار به تر څه حده پورے زیات شی۔ او ډیره آبادی به په ځائے شی۔
چه ځمونږ ملک په زمینداره آباد دے۔ کارخانو ته خام مال هم دَ زمیندار په ذریعه راځی۔ او
په وجه ډیره ښه مبادله هم راځی۔

نو اوس که زمینداره لاندِ وی۔ نو ملک به پسمانده وی۔ او ټوله کارخانه به پوره پوره
نشی کولے۔ نو مجبوراً به دَ بل امداد ته ناست وُو۔ دَ دِ دپاره دَ پاکستان حکومت اوس اوس
اصلاحات کړی دی۔ او به خو دئے بهتر کړے دے۔ او نورے ئے داسے ډیرے طریقے اختیار کړی دی
چه زمینداره بنه شی۔ او د غه شان دَ ملک په بهتری باندِ ، تر او غور زوی۔ ځمونږ ملک چه په
عالم وجود کښ راغلو۔ نو داسے نه وُو۔ لکه چه نن صبا مونږ ته ښکاری۔ هر څه حالت خراب وُو
کارخانے نه وے۔ هر طرف ته واویلا او فریاد وُو۔ خو اوس ئے دومره ترقی کړے ده۔ چه هغه دا
نشته۔ کوم چه لس یا شل کاله مخکښ وه۔ مونږ به په شل یا دیرش کالو کښ هغه حد ته ځان رسو
کوم حد ته چه نن صبا امریکه او نور ملکونه رسیدلی دی۔ ملک نه به یو جنت جوړ وو۔ او دَ ملک
هر وګړے به خوشحال وُو۔ انشاء الله تعالیٰ۔

ارباب محمد اعظم داودزئ ځلورم کال
۱۹۵۹-۶۰ء

دپاکستان بچت

آمدن نه د خرڅ لرے کولو نه پس پاتے شونکے مال ته بچت وائی. مثلاً د یو فرد آمدن زر روپۍ دے. او خرڅ ئے آته سوه روپۍ دی. باقی دوه سوه روپو ته بچت وائی. هم دغه شان د پاکستان آمدن که چرے د خرڅ نه زیاتی شی. نو هغه زیاتی دولت ته به د حکومت پاکستان بچت وائی. بچت (SAVING) او د هغه د ترقی کاردنو باندِ لګیدلو (INVESTMENT) کښ ډیر فرق دے. په دے مضمون کښ د بچت په هغه حصه باندِ مونږ بحث کول غواړو چه کومه حصه د ترقی دکاردنو د پاره استعمال کړے شی. د یو فرد او د یو ملک په بچت او د بچت د ترقی د پاره خرڅ.. کولو کښ ډیر فرق دے. یو فرد د خپل بچت مطابق خرڅ کوی. یعنی چه څومره ئے خادروی. نو هومره پښے غزوی لیکن حکومت مخکښ د یو کار د خرڅ اندازه اولګوی. بیا هغه رقم په ډیرو طریقو سره پوره کوی. مثلاً په قسما قسم ټیکسونو او د بهر ملکونو نه په قرضو آخستو او دنکارنګ نوټونو ذریعو پوره کوی.

د پاکستان د ټول آمدن تقریبًا اووه فیصدی بچت کیږی. او اوده کم سل دوپۍ خرچ کیږی. خو دلے دا بچت د ترقی دکاردنو د پاره کافی نه دے. که مونږ د خپل ملک ترقی غواړو. نو مونږ له پکار دی. چه بچت کښ زیاتے اوکړو.

دوه طریقے دی چه د هغے په وجه مونږ د خپل ملک د ترقی د پاره دولت پیدا کولے شو.

(ا) په کورنئ معامله کښ مونږ له پکار دی. چه مونږ خپل بچت کال په کال زیاتول شروع کړو. فرض کړه چه کال پس مونږ په سلو کښ پنځه په بچت کښ زیاتے اوکړو. په دغه شان هر کال چه پنځه فیصدی په بچت کښ زیاتے کیږی. نو څه موده پس به یو وخت داسے راشی. چه مونږ به د خپل ملک د ترقی کاردنه په خپله سرته درسولو قابل شو. او د باهر ملکونو ته به څه مونږ هیڅ حاجت پاتے نه شی.

(ب) دویم ضروری څیز دا دے. چه مونږ د پسمانده ملک په حیثیت په خپل بچت باندِ د ملک د ترقی کاردنه سرته نه شو رسولے. مونږ د بهر ملکونو د مشینونو او قسما قسم آلاتو نه بغیر ترقی نه شو کولے. د دے د پاره مونږ له پکار دی. چه د باهر ملکونو نه د قرضے آخستلو ذریعے اولټوو. ځما دا مضمون د دے دویم شرط سره څه تعلق نه لری. د دے د پاره څه په دے باندِ زیاتی بحث کول نه غواړم.

"پاکستان کښ ولے کم دے" په پاکستان کښ د کم بچت ډیرے وجے کیدے شی. مونږ له پکار دی

چه مونږ د خپل بچت د زیاتولو طریقې زده کړو. اقتصادي ماهرانو چه د کم بچت دوه بنودلي دي هغه داوي

(۱) **کم آمدن** :- په پسمانده ملکونو کښې د بچت د کمي لومړی وجه کم آمدن دے. د یو فرد یا د یو ملک آمدن دومره کم وي. چه څه نه شي. نو هغه څه. او په ډېره مشکله د ژوند ورځ ضروري څیزونه پوره کوي. د کم آمدن په وجه بچت کم وي. او د کم بچت په وجه ترقي په ملک کښې کمه کیږي. او د کمې ترقۍ په وجه آمدن کم وي. په دے شان دا بانړی چخ چرلیږي.

(۲) **د آمدن غیر مساوي تقسیم** :- د عامو خلقو د پاره کم آمدن د کم بچت یوه لویه وجه ده. خو د یو ملک د اقتصادي حالت د پاره دا یو کامل دلیل نه دے ځکه چه د کوم قوم آمدن یو شان نه وي تقسیم شوے. او پکښې ډېر زیاتے اوکې وي. په داسے ملک کښې یو وړوکے ټولے د مالدارو خلقو وي. چه هغوی د آمدن ډېره لویه حصه آخلي. د زمکې مالکان چه د ټولے آبادۍ لس فیصدي دي. دوئ په ټول آمدن کښې څلویښت فیصدي آخلي. باقي شپیته فیصده آمدن هغه څلورنیمو شلو خلقو کښې تقسیم شوے دي. لس فیصدي خلق د حد نه زیات مالدار دي. که چرے دوی غواړي. نو ډېر زیات بچت کولے شي. د دے نه دا معلومیږي. چه د کم بچت وجه کم آمدن نه دے. بلکه داد ټولي آمدن د غیر مساوي تقسیم وجه ده. د دغه لس فیصدي د خلقو د کم بچت وجے دوه دي.

(ل) لومړے وجه دا ده چه څه بچت کړي. نو هغه په قسما قسم رواجونو باندې خرچ کړي.

(ب) دویمه وجه دا ده چه دا خلق هغه څیزونو باندې پیسے ورکوي چه کوم څیزونه د پیداوار زیاتید د پاره موزون نه وي. مثلاً څوک پرے زر آخلي او څوک پرے زمکے. پروفیسر د (Lewis) لیوئیس وئیلي دي چه داسے یو قوم یا ملک نشته چه د هغه د خپل قومي پیداوار د دولس فیصدي. بچت نه شي کولے. ځکه چه غربت یو ملک د جنګ کولو نه یا نورو ذریعو سره د خپل آمدن ضائع کیدلو نه نه دے منع کړے دائ چه دے قومونو غربت ځان سره یو بهانه جوړه کړے ده په هغه ملکونو کښې چه لس فیصدي خلق څلویښت فیصدي آمدن آخلي. او د خپلو زمکو په آمدن باندې په عیش او عشرت ژندګی تیره دي. په داسے ملکونو کښې بچت په دے وجه کم وي چه دا خلق خپل بچت په ګرجو او ښه ښه کورونو جوړولو باندې یا په نورو قسم پیداوار نه زیاتید ونکې څیزونو او یا په زمکه آخستلو باندې خرچ کوي.

(۳) **د خلقو قدرونه** (Values of the People) ځکه چه پروفیسر لیوئیس (Lewis) وئیلي دي چه هغه لس فیصدي خلق خپل بچت د ترقۍ د کارونو د پاره نه استعمالوي. بلکه هغه څیزونه پرے آخلي. چه کوم څیزونه په نظر کښې ښه او د ادچت قیمت ښکاریږي. د یو څیز د زیات قیمت او د ښه والي مسئله د هر یو قوم د معاشرتي (یعني د ټولنې اولاندینې ټولے) په دماغ کښې پرته ده. او دوی خپل بچت په هغه څیز باندې لګوي. چه د دوئ په نظر کښې

م بنه او د اوچت قیمت دی. پس ددې نه دا معلومیږي. چه د کم بچت وجه کم آمدن نه دی. بلکه دا د خلقو د قدرتونو زیاتي آمدن استعمالولو باندې منحصره ده. آیا چه دوئ دا خپل زیاتي د کم کار د پاره استعمال کړي. آیا د ترقۍ د پاره یا د ځمکې او د سرو زرو اخستلو د پاره استعمال کړي که د دوئ په نظر ځمکه یا سره زر د ترقۍ کارونو نه بنه وي. نو سره زر یا ځمکه به پرې واخلي او د ترقۍ د پاره به خپل آمدن نه خرڅ کوي. دا سې قسمه څمونږ ملک کښې ده. خلق د ترقۍ کارونو په ځائې یا پرې ځمکې آخلي او یا پرې سره زر. یا ئې د نورو پیداوار نه زیاتېدونکو کارونو د پاره خرڅ کوي. مثلاً که چرې د سرو زرو په نسبت که ورته او سپنه د زیات قیمت ښکاره شوه نو د سرو زرو آخستلو په ځائې به اوسپنه آخستل شروع کړي.

(۴) د خود نمائي خرڅ طرف ته مائیله کیدل. (CONPICUOUS CONSUMPTION) د خود نمائۍ خرڅ طرف ته د مائیله کیدلو وجه دا ده چه د پسمانده ملکونو خلق په مختلفو ذریعو سره ریعني ریډیو. پریس. فلم) د مالدارو ملکونو د خلقو د اوچت ژوند د تیرولو د حال نه خبردار شول. نو دوئ دا غواړي چه مونږ هم معوئ نیشان ژوند اختیار کړو. د دې لالچ په وجه قیمتي څیزونه استعمالوي. یعني دا خلق هم د معوئ پیښې کول غواړي دې په انګریزۍ کښې (DEMONSTRATION EFFECT) وائي د دې مالدارو ملکونو د خلقو د پیښو په وجه دوئ زیاتي آمدني په دې قسم څیزونو باندې خرڅ کوي. او که آمدن ئې زیاتیږي. نو د نوي نوي قسم د ژوند ضروریات راپیدا کیږي.

(۵) بې علمي. څمونږ په ملک کښې د کم بچت بله غټه وجه د خلقو بې علمي ده. د بې علمۍ په وجه خلق خپل زیاتي آمدن په پیداوار نه زیاتیدونکو څیزونو باندې خرڅ کوي. مثلاً په یو واده باندې لس دولس زره روپۍ خرڅ کول یا مقدمې کول او پرې زیاتې زیاتې پیسې خرڅ کول دا ټول د بې علمۍ نښې دي.

(۶) د مالیاتو ادارو کمې. بله لویه وجه د بچت د کمۍ د مالي ادارو د غیر موجودګۍ په د وجه کوم آمدن چه بچت کیږي هغه هم د ترقۍ د کارونو د پاره نه استعمالیږي.

د بچت د زیاتولو طریقې

(۱) علمي او تعلیمي تبدیلیانې:- داسې یو عالمانه منظم ایجاد کول چه ورته نبرود نه وائي. چه دا خلقو ته په مختلفو ذریعو یعني د فلمونو. ریډیو. پریس. اشتهارونو او قسما قسم لیډرانو په ذریعه د بچت قسما قسم فائدې او بنائي او د فضول خرڅۍ نوې بدۍ بیان کړي. اګرچه د خلقو خیالاتو بدلولو باندې ډیر زیات وخت لګیږي. ممکن خبره ده چه داسې یو طریقه د خلقو خیالات په ډیر لږ وخت کښې د فضول خرڅۍ نه د بچت طرف ته راواړولې شي مونږ که خپل کورنۍ خرڅ په دوه قسم کښې تقسیم کړو (الف) عادي خرڅ خوراک، پوشاک (ب) او

متنوع خرڅ مثلاً نه ضائع کیدونکے څیزونه. قالینونه، موټرونه.او د نورو قسم رواجونو باندِ خرڅ کول.

موږ د عادتی خرڅ دَ کم کولو په ډیر لږ وخت کښ قابل گرځیدے شو. دا دویم قسم خرڅ د تعلیم او ښودنه نه بغیر د کم کیدو څه امکان نه ښکاریږی.

(۲) تجارتی پالیسی کښ تبدیلی کول:- موږ له پکار دی چه موږ د درآمد د پاره داسے یو سخته پالیسی جوړه کړو خاص طور د عیش وعشرت په څیزونو باندِ سخته پابندی اولگوو. او د داسے قسم څیزونه ملک ته د راتلو اجازت ورنکړو. د دغے څیزونو د نایابی په وجه باندِ به خلق د بچت کولو د پاره مجبور شی او بچت به ډیره زیاته ترقی اوکړی. او کومے پیسے چه خلق نن صبا د مالدارو ملکونو کښ د خلقو کوی. د دے څیزونو د نایابی په وجه به دا پیسے پریږدی.

(۳) انتظامی امور. حکومت له پکار دی چه داسے قانونونه جوړ کړی. چه خلق په قسما قسم رواجونو باندِ دخیل زیاتی آمدن لگولو نه منع کړی او په داسے قسم فضول خرچو باند سخته پابندی اولگوی.

(۴) ځائے په ځائے قصبو کښ مالی ادارے جوړول پکار دی. چه د گرد و نواح کلو خلق د هغه ادارو نه دَ فائدے اخستلو قابل اوگرځیږی. او د هغے ادارو قانونونه په آسانو طریقو سره جوړول پکار دی. چه یو بے تعلیم سړے هم پوهیږی. او پرائمری پورے تعلیم حاصلول هر یو سړی باندِ لازمی کول پکار دی چه د مختلفو کتابونو د مطالعو په ذریعه د بچت د فائدو نه ځان خبردار کړی. او فضول خرچی پریږدی.

(۵) خلقو کښ د بنک حساب عادت راپیدا کول. بنکونو له پکار دی چه هغه د خلقو د هغوی په بچتونو باند د نفع ورکولو د دولت حفاظت کښ د ساتلو ذمه واخلی او په موافق طریقه سود ورکوی.

که موږ غواړو چه بچت زیات شی. نو موږ له پکار دی چه پدے شرطونو باندِ عمل اوکړو.

رضاء الله خلورم کال،

اقوامِ متحده

په سان فرانسسکو کښې د ۲۵ر اپریل نه تر ۲۶ر جون ۱۹۴۵ء پورې د پنځوس ملکونو د نمائندګانو یو کانفرنس اوشو. په کوم کښې چه د یو بین الاقوامی اداره د قیام په حقله غور اوشو. هم د غې نمائندګانو د دې اداره چارټر جوړ کړو. په ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کښې د دې اداره بنا اوشوه. او صدر روزویلټ انجهانی د دې نوم اقوام متحده تجویز کړو. انګریزی، فرانسیسی، چینی روسی او هسپانوی د اقوامِ متحده سرکاری ژبې اوټاکلې شوې.

مقاصد:- بین الاقوامی امن او حفاظت قائمول.

د قومونو په مینځ کښې دوستانه تعلقاتو ته ترقی ورکول.

د مختلفو ملکونو د اقتصادی، سماجی او د ثقافتی مسئلو د حل کولو د پاره بین الاقوامی تعاون پیدا کول وغیره.

رکنیت:- هغه درست امن پسند ملکونه د اقوامِ متحده ممبران جوړیدې شی. چه د اقوامِ متحده د چارټر شرائط اومنی.

د سیکورټی کونسل په سفارش باندې جنرل اسمبلی ممبران د اراکین معطل کولې یا خارج کولې شی

اقوامِ متحده د لاندې یو شپږو اعضاؤ نه جوړه شوې بنیاد مونده دې.

(۱) جنرل اسمبلی (۲) سلامتی یا سیکورټی کونسل (۳) اکنامک او سوشل کونسل (۴)

(۵) بین الاقوامی عدالت (۶) سکرټریټ.

(۱) **جنرل اسمبلی:-** هغه ټول ملکونه کوم چه د اقوامِ متحده ممبران دی هغه د دې اسمبلی ممبران هم دی. د هر ممبر یو ووټ وی. د اهمو خبرو اترو فیصلې په $\frac{2}{3}$ دوتونو باندې کیږی.

(۲) **سلامتی کونسل:-** د دې پنځه مستقل ممبران دی. چین، فرانس، روس، امریکه او برطانیه. شپږ غیر مستقل نمائندګان جنرل اسمبلی منتخب کولې شی. دا اداره د بین الاقوامی امن ضامنه ده.

(۳) **اکنامک او سوشل کونسل:-** دا په اتلسو منتخب شده وو ممبرانو مشتمله ده. د کوم انتخاب چه د جنرل اسمبلی نه کیږی دا اداره د اقتصادی او سوشل ترقۍ ذمه واره ده. د دې د لاندې کمېټې کیږی دی

(۴) **تولیتی کونسل:-** د دې د لاندې هغه کمزورې خود مختاره علاقې دی. چه د بعضې ملکونو په نګرانۍ کښې دی. د اقوامِ متحده په چارټر کښې د غیر مختاره علاقو په حقله هم اعلان شته. د دې بنیکرو، مرسته او برمخ تګ اقوام متحده خپل فرض ګڼی.

(۵) بین الاقوامی عدالت :- دا داقوام متحده دَ ټولو نه لوئے عدالت دے. دا صرف دَ قانون توضیح کوی، په قانونی فیصلو څوک په عمل کولو نشی مجبورولے. دَدے پنځلس[۱۵] ججان دی. دَ کوم انتخاب چه جنرل اسمبلی او سلامتی کونسل کوی.

(۶) سکرتریټ :- دا دَ سکرتری جنرل اودَ عملے په علے باندے مشتمله دے. دَ سیکورتی کونسل په سفارش باندے جنرل اسمبلی دا مقرروی. دَ سکرتریټ د لاندے اته محکمے وی.

بعض مخصوص ادارے

(۱) بین الاقوامی لیبر ارګنائزیشن — I.L.O

(۲) داقوام متحده د خوراک اوزراعت اداره — F.A.O

(۳) داقوام متحده تعلیمی سائنسی او ثقافتی اداره — UNESCO

(۴) بین الاقوامی فضائیه اداره — ICAO

(۵) بین الاقوامی بینک دَ تعمیر او ترقی دَ پاره — I.B.R.D.

(۶) بین الاقوامی مالی فنډ — I.M.F

(۷) عالمی دَ صحت اداره — W.H.O

(۸) بین الاقوامی دَ مهاجرینو اداره — I.R.O

دَدے ټولو ادارو داصل مقصد دَ روستو پاتے او پسمانده ملکونو مدد کول دی.

اقوام متحده دَ دوئم جنګ عظیم دَ بربادی په وجه په وجود راغله. دَدے خبرے پوره کوشش کیږی. چه لیګ آف نیشنز (League of Nations) دَ ممبرانو نه چه کومے غلطئ شوی دی. چه هغه آئنده اونشی.

دَ اقوام متحده دَ ممبرانو اکثریت دا غواړی. چه دنیا هیڅکله هم بیا دَ داسے خونړے تباهئ ښکار نه شی په دے ایټمی دَور کښ چه دَ دنیا په تباهئ دیل نه لګی دے ادارے نور هم اهمیت اوموندو. په کوریا کښ د جنګ په بند یزکښ دا اداره کامیابه شوه. هرکله چه بین الاقوامی اختلاف پیدا شوے دے. نو ددے ادارے ممبرانو د هغے د لرے کولو پوره کوشش کړیدے. د ۱۹۶۲ء په اخیر کښ د کیوبا په مسئله باندے واقعات دومره خراب شوی دو. چه د لوئے نه لوئے مفکر هم دَ آئنده پخقله څه پیشنګوئی نه شوه کولے. ولے داقوام متحده دَ سکرتری جنرل مسټر او تهانټ (برما)، په بے پچه کوششونو او شواخونو دا مشکل حل شو.

زاهد حسین (دوېيم کال سائنس)

دکرکټ د لوبې يو مختصر تاريخ

په دې وخت کښې د کرکټ لوبه نه صرف کمال انتها ته رسيدلې ده- بلکه د لوبو په ميدان کښې د هرې يوې لوبې نه وړاندې ده- او ځکه دې لوبې ته (QUEEN OF THE GAMES) وئيلې شي- د لوبغاړو د دلچسپۍ خو به ئې يو اړخ ته کړو- هغه خلق چه دا لوبه نه شي کولې- او نه ئې کتې شي هغوی د خپلې تسلۍ د پاره تول ورځ ريډيو ته ناست کومنټري اوري- خواه دا د کرکټ لوبه دې د دنيا په بل سر کښې وی-

د تقسيم نه پس پاکستان هم دې لوبې له توجه ورکړه- او د عبدالحفيظ کاردار د قيادت لاندې ډيره کاميابي حاصله کړه- او د خپل ملک نوم ئې اوچت کړو- خاص طور سره د اوول (THE OVAL) (انګلستان) په ميدان کښې پاکستان واحد ملک دې چه انګلستان له ئې شکست ورکړې دې- د انګلستان خلقو وئيل چه د نيل په درياب کښې اور لګيدې شي- خو مونږ نه شو کولې د اوول په ميدان کښې د کرکټ لوبه نشي ګټلې-

د کرکټ ابتداء:- د کرکټ لوبه د ډيرو ګرانو مرحلو نه پس د ترقۍ دې مقام ته رسيدلې ده د دې لوبې ابتداء څه رنګه شوې ده- د دې په جواب کښې يقيني وينا کول ګرانه ده- خو په ظاهره دا لوبه د يورپي ممالکو او خاصکر د برطانيه په غيرو کښې پيغلتوب ته رسيدلې ده- کم وخت چه د برطانيې تهذيب ترقي کوله هم هغه وخت هم دغه لوبه د دنيا خصوصاً د يورپ په ډيرو ملکونو کښې په بيل بيل رنګ کيدله- د ايران، يونان او د روما زړو لوبو کښې د پنډوس او تيغ نښې ليدلې شي- خو په وېلو کښې راځي چه دا لوبه د يورپ د شپنو نه روانه شوې ده- کوم وخت به چه هغوی خپل څاروی ځنګلو ته د څرولو په غرض بوتلل نو هغوی به د خپل ځان د مشغولتيا د پاره يوه دنه په نښه کړه- او هغه به ئې په کاڼی ويشته- د وخت تيريدو سره سره د دغې کاڼي ويشتو يوې لوبې شکل واغست- او دغه شپنو به تونګی جوړ کړل- يو به په کاڼي نښه ويشته- او دا نښه به بچ وله ده- او بل به په جواب کښې کاڼي له ګزار ورکولو-

دکرکټ عروج :- دوخت تیریدو سره سره د لرګی ځائے تبنی یعنې (TREE) واخست۔ او د کانړی ځائے یو کلک پنډوس (BALL) واخست۔ او د وني ځائے چه په لمبه کنړے شوه۔ دے لرګو (STUMPS WICKETS) واخست۔ انسانی ذهن په دے لوبه کښی تبدیلۍ راوستلے۔ آخر یو وخت راغلو چه د ګزار پر اصلی کو لو۔ او و ځلو۔ او د لبنو ترمنځه د منډو په شمیر د نمبرو جوړو لو طریقه رواج کړے شوه۔ برطانیے دا لوبه خپله قومي لوبه اوګرځوله۔

په ۱۷۴۴ء جوزف نوم یو شاعر دے لوبے له د کرکټ نوم ورکړو۔ جوزف دد دے لوبے نقشه دومبے راښکلے ده۔ د دوو نیغو لرګو د پاسه یو لرګے د پروت وو۔ یو سړی به پنډوس ورګزار ولو۔ او بل سړی په جواب کښی را منع کو لو۔ دریم لو بغاړی به یو لرګ دو چه به ئے پنډوس د ګزار وړی کو لو نه پس راستنولو۔ یعنی ن صباچه ورته فیلډر (FIELDER) ویلے شی۔ په بنیادیو کښی به دا لوبه امیرانو، نوابانو او شهزادګانو کوله۔ ۱۷۱۹ء کښی ایټ دربار باد شاه د خپل خوښۍ له خاطره په دے لوبه ډیرے پیسے خرڅ کړے وے۔ ۱۷۱۹ء کښی په سکولونو کښی هم دا لوبه شروع شوه۔

دوغے لوبے پر وړمبے میچ ۱۷۴۴ء کښی شوے وو۔ چه د هغے نمبرے[ا] او ریکارډ تر اوسه هم موجود دے۔ د دوو بنیادیو یعنی کینټ (KENT) او لنډن (LONDON) ترمنځه (COUNTY MATCH) تو لو نه وړمبے میچ ۱۷۱۹ء کښی شوے وو۔ ۱۷۴۴ء کښی پر وړمبی ځل د دے لوبے قوانین جوړ شول په وړمبی ځل جان سمال نومے لوبغاړی په یو ورځ سل نمبرے (CENTURY) په ۱۷۷۵ء کښی جوړے کړے وے۔

۱۷۸۸ء کښی ایم سی سی یعنی (ملبورن کرکټ کلب) چه د دنیا د کرکټ تو لو نه لویه اداره ده جوړه کړے شوه۔ ۳۰ مئی ۱۷۸۸ء کښی په وړمبی ځل ایم سی سی په دے قوانینو نظر ثانی کړے وو۔ ۱۷۸۸ء کښی د انګلستان د دوو سکولونو ایټن او هیرو ز ترمنځه وړومبے مقابله شوے ده ۱۸۰۶ء کښی د لارډز په مقام په وړمبی ځل د جنټلمین (GENTLEMEN) او د پلیرز (PLAYERS) ترمنځه مقابله شوے وه۔ ۱۸۲۲ء کښی یو امپائر د (UMPIRE) په اولنی ځل د غلط بال (NOBALL) ګناه د لو فیصله د یو بالر خلاف کړے وه۔

[ا] دد دے لوبے یو خوا دی او دد دے لرګی بل خوا غزدی۔ د دے ترمنځه ۲۲ فټه فاصله وی۔ چه د دے لرګو ترمنځه یو منډه کاوو جوړه شی۔ ETON GIMMONS

۱۸۷۷ء کښې د انګلستان او د آسټریلیا ترمینځه اولنۍ ټسټ شوے وو۔ د امیچ انګلستان په ۸ وکټو ګټلے وو۔ په ۱۸۸۲ء کښې چه اسټریلیا انګلستان له په ۷ نمبر شکست ورکړو۔ نو یو تماشبین په ئې مرشیه۔ او د ایشز (ASHES) رسم د دغې ورځې نه شروع شو۔ په دغه یو سپری د رسے ژکې (STUMPS) د سیزل او محفوظئې کیښودل نو د سے ته ایشز وئیلی شی۔ ۱۸۸۲-۸۳ء په رومبی ځل د ۵ ټیسټونو مقابله د آسټریلیا او انګلستان ترمینځه شروع شوه۔ هم په دغه زمانه کښې د ډنیا مشهور لوبغاړے ډبلیو جی ګریس پیدا شوے وو۔

په شلمه صدۍ کښې کرکټ ډیل عروج ته اوړ سیدو۔ هم په دغه زمانه کښې (سر) جے بی هابز سر رونلډ جارج بریډ مین۔ پا نسفورډ۔ وکټر ټرمپر۔ میکارټینے۔ والټر هیمنډ۔ سټین میکیب نرینګ وُدے۔ جارج هیډلے۔ لاری کانسټینټائن۔ ډ ونی فارس۔ سر دلیپ سنګه۔ جی۔ نواب آف پټوډی۔ سید وزیر علی۔ لاله امرناتهه۔ سر لین هټن او نور نامتو لوبغاړی پیدا شوی دو۔

۱۹۳۰ء کښې د اسټریلیا بریډمین د انګلستان خلاف په ټسټ ۳۳۴ نمبری جوړے کړے وو۔ د ے نه مخکښې چا دومره نمبرے نه وے جوړے کړے۔ ۱۹۳۸ء کښې د اوول په میدان کښې هټن د اسټریلیا خلاف ۳۶۴ نمبرے جوړے کړے وے۔ او د بریډمین ریکارډ ئے مات کړے وو۔ پوره شل کاله پس په مارچ ۱۹۵۸ء کښې د کنګسټن جمیکا په مقام د غرب الهند (WEST INDIES) پر لوبغاړی ګارفیلډ سوبرز د پاکستان خلاف ۳۶۵ نمبرے په دریم ټسټ کښې جوړے کړے وے۔ او سوے (OUT) نه وو۔ او د لین هټن ریکارډ ئے مات کړو۔ د ټسټ نه علاوه په اوله درجه میچونو کښې د پاکستان حنیف محمد په قائد اعظم ټرافی کښې د بهاولپور خلاف په حیدرآباد کښې ۴۹۹ نمبرے جوړے کړے وی۔ او د دنیا ریکارډ ئے ایښے دے۔ دۀ د نه وړاندے د اوله درجه میچونو د نمبرو ریکارډ د بریډمین ریکارډ وو۔ هغه ۴۵۲ نمبرے جوړے کړے وے۔

پخوا د هندوستان کرکټ به په عجیبه رنګ کیدو۔ د هندوستان مشهور لوبغاړے رنجیت سنګه جی دائی چه یو ځل څه یو مهاراجه لوبے له راوغښتم۔ او د لوبے شروع کیدو نه وړاندے مانه مهاراجه اووے چه رنجیت سنګهه ته چرے په صفر آؤټ شوے نئے۔ نو رنجیت سنګهه ورته اووے چه اؤ ډیر ځله۔ نو هغه مهاراجه اووے چه څه خو چرته په صفر نه یم آؤټ شوے۔ چه لوبه شروع شوه نو مهاراجه صاحب بیټنګ (BATTING) شروع کړو۔ نو مهاراجه صاحب ته پاره بولنګ ایل. بی. ډبلیو۔ کیچ آؤټ۔ رن آؤټ۔ سټمپ آؤټ۔ معاف ځکه چه مهاراجه وو۔ او چا ډیر ے

هم نه شو آؤټ کولے۔ چه صفر ۵ شپږو بے ربے کړے۔ او آؤټ شو۔ نو رنجیت سنګهه ته اوس چه ماته وشے۔ چه څه چرته په صفر نه یم آؤټ شوے۔ نو رنجیت سنګهه او وئیل۔ چه زه دا تو ته به نه آؤټ شوے یے۔ او نه به چرته آؤټ شے۔

۱۹۳۲ء کښ چه غیر ملکی سرکاری ټیمو نه هندوستان ته راتلل شروع شول نو د مهاراجګانو دا موږے ختمے شوے۔ او په هندوستان کښ کرکټ په اصلی معنو کښ شروع شو۔

خاص طور سره چه ۱۹۳۶ء کښ د هز هائی نس جام صاحب آف نواانګر کے۔ ایس رنجیت سنګهه په یاد کښ رانجی (RANJI TROPHY) ټرافی شروع شوه نو هندوستان کښ د کرکټ ټیمو کښ د کهلو جذبه پیدا شوه او کرکټ په خپل اصلی رنګ کښ شروع شو۔ ننن دا لویه د دولتِ مشترکه په ټولو ملکو نو کښ کیږی او په ډیره ترقی ده۔

پاکستان کښ هم دا لوبه ډیره مشهوره ده۔ ۱۹۵۲ء کښ پاکستان هم د دنیا کرکټ امپیریل کانفرنس کښ شامل کړے شو۔

هر کله چه دا مضمون څه د پښتو لوستی نکو د پاره لیکم۔ نو ضروری ګڼړم چه د پښتو ځوانانو لوبغاړو ذکر او کړم چه د هندوستان د طرفه د غیر ملکی ټیمو نو سره لوبیدلے وی۔ مثلاً صالح محمد خان مرحوم۔ خان بهادر سلطان محمد خان مرحوم۔ حافظ عبدالرشید برک۔ کریم بخش۔ او د دوی نه پس شیر محمد خان۔ لطیف او مفتی ایوب عوندے لوبغاړی پیدا کړی دی۔

قطعه

تُوره تر مُلا د نګیالی غُندِ کړه
جذبه پیدا د ابدالی غُندِ کړه
که توقع تر څه د نفعے لرے
د ګل سا تنه د مالی غُندِ کړه

محمد شیر دوېم کال
(۱۹۵۸-۵۹ء)

ګل لمان شاه
څلورم کال

(ترجمه)

(چین)

حکیم کنفیوشس

د قدیم چین دا مشهور فلسفي او ادیب د شانتنګ په ریاست کښې پیدا شو. په ماشومتوب کښې یتیم شو. سرکاري ملازمت ئې شروع کړو او ورو، ورو ئې ترقي کوله. عن چه د ملک د لویو نه لوئ قاضي شو. کنفیوشس د ملازمت نه په دے وجه استعفیٰ ورکړه چه د هغه په خیال باچا د حکومت کارونو نه بې پرواه شوے وو. په چیني ادبیاتو کښې تر ټولو زاړه کتابونه هم د کنفیوشس دي. دده موده د عیسیٰ علیه السلام د پیدائش نه ۵۸۰ کالو اګاهو نه تر ۴۷۹ ـ ق ـ م پورے دے. کنفیوشس د خپل عمر لویه حصه د ملک په سیاحت کښې تیره کړه په دے موده کښې هغه د شاعرانو سندرے، ذړے قصے او روایتونه جمع کول. هغه دوی کښې څه څیزونه انتخاب کړل ترتیب ئې ورکړو او تر کافي حده ئې پکښې مناسبت او موسیقي پیدا کړه. ځکه خو دده یو هم عصر چه دده قلمي تصویر راښکلے دے وائي چه پکښې په ټیپلي او بربط د نمانځام په وخت په یوه سندره د ټیلو بنوډلے دے. د کنفیوشس نه پس فلسفیانو او مذهبي استاذانو دده دا انتخاب د اخلاقي تعلیم په نصاب کښې شامل کړو. او دا ئې ګرانے ګرانے معنے ورته واغوستولے چه ټوله خوبي او اثر ئې ورته نامل کړو.

د دے فلسفي وینا کانے د چین په لویو لویو کتابونو کښې موندے شي او دده په یاد کښې د چین په هر ښهر کښې معبدونه جوړ شوي دي. کنفیوشس په خپل ژوند کښې تل په دا سے اصولو زور ورکولو چه د اعتدال لاره ښيي د هغه څنې اقوال دا دي.

۱- نیکي یو بل سره مینه ته وائي.

۲- پوهه د یو بل د ضرورتونو، معاملاتو، فطرتونو نه د واقف کیدو نوم دے.

۳- د لوست او فکر نه بغیر تعلیم بیکاره دے او د تعلیم نه بغیر تش غور و فکر هم د کار شے نه دے. دا خو د ځان خودکشي ده.

۴- ځلوله پکار دي چه هر چا سره د مینے سلوک کوي. دوي له خراب صحبت ډغور ل پکار دي. او بانده دي چه دوي خپل ټول کوششونه د ذهني قوتونو په بیدارئه خرڅ کړي.

۵- سړي له پکار دي چه د عزت ژوند تیر کړي که هغه په ښخ سر نه شي کرځیدے، نو ژوندے ولے دے؟

(CONFUCIUS) سنه

د مطالعې اصول

د مطالعې د پاره توجه د تړلو ضروري څيز دے. د پوره انهماک د مطالعې د پاره په لاندې ټو هدايتو عمل پکار دے.

۱. هغه ټول ځايونه د زړه نه وباسئ چې ستا سو ذهن کښې انتشار پيدا کوي.

۲. د مطالعې د پاره د تړلو نه بند وخت سحر ياد شپې وي. مطالعه دا سے خاموش ځائے کښې کوئ چه کښې د رڼا او باد کافي انتظام وي او کرسي يا ساړه موږ نه تکوي.

۳. کتاب ستر کو ته ډير تردے مه نيسئ ادمه په کتاب ورتيټيږئ. په ملاسته کتاب لوستل نظر خرابوي.

۴. هميشه په ناسته کتاب لولئ. ناسته دا سے پکار ده چه سرے زر ستړے نه شي.

۵. د هرے ورځے د پاره دستور العمل جوړ کړئ. د لوستو د وخت تعين هم ضروري دے.

۶. کتاب دوه ځله لولئ. په وړومبي ځل په سرسري نظر به د کتاب خاکه ستاسو ذهن کښې کښيني او په دويم ځل به د کتاب ډير پټ ارخونه تاسو ته ښکاره شي.

۷. دا ياد ساتئ چه هره پيرا کښې يو مرکزي خيال وي په دغه مرکزي خيال ځان پوه کړئ. د دے نه علاوه فني اصطلاحات هم ځان سره نوټ کوئ.

۸. د لوستلو په وخت کښې په ډيره توجه خپل دماغ حاضر ساتئ. اهم او مشکل ځايونه وروورو لولئ او ځان پرې پوهوئ. غير اهم ځايونو باندے سرسري نظر اچوئ.

۹. خپل ځان ته يو واضح مقصد جوړ کړئ. او خپله ټوله توجه په دغه مرکز راغونډه کړئ.

۱۰. د لوستلو نه اګاهو د تيرے ورځے د مطالعے اهم نکتے ځان ته را ياد کړئ. په دے طريقه ستاسو په مطالعه کښې يو تسلسل قائم وي.

(بنگال) حبیب الرحمن
غلام کمال

تاج

(یو تصوّر)

(د ډاکټر ابندرناټه ټیګور دَ ترجمه)

شاه جهانَ: ستا عظیم سلطنت تباه شو خو ستا دَ محبّت دَا وښکے یو څاڅکے غیرفانی کړو۔

زمانه دَانسان په نَه دهٔ نه رحمیږی۔ هغه له به دَ زمانے په دے ناکام کوشش پورے خندا ورتلله۔ چه دَ محبت دغه یادګار به ئے دهغه دَ ذهن نه دَ هیرولو کوشش کولو۔

تاجَ: تاپخپل ښائیست هغه مسحور کړو او غیرمتشکل مرګ لره دِ یو اَبدی حیثیت ورکړو۔

یه تاجُ: ته دَ شپے په بوکنوکے چپیا کښے خپلے محبوبے سره (چه ستا په غیږ کښے پرته ده) چه دکوم راز خبرے کوے هغه دَ کا ږی دابدی سکوت نه آواز راوباسی۔ سلطنتونه ختم شو۔ اوُصدئ دَ وهم یو تصوّر کښے غرقے شوے خو مرمر لا تراوسه ستوُدته وائی۔

— زما یاد دی" او ا —" زما هم یاد دی" خو ژوند هیرول کوی ځکه چه هغه "لامتناهیت" ته هرګلے وائ او چه سفرکوی نوځان سره توښه نه اخلی او ځان نه ورستو دحُسن د هیرو یادګارونو نه بغیر هیڅ نه پریږدی۔ داد ے دَ تاج دَ ابدی چپیا راز چه دَ مرمر دَ دیوالونو نه چغه وهی۔

عبدالوحید خلوم کال

دجنّت حقداران

(دمشهور جرمن شاعر گوئیټې نه ترجمه)

یو زاهد ته په یو صحرا کښې یو داسې سړے چه پښې ئې لکه د بزو وے. ووئیل.

" په دعا اسے نیاز بینه! ماته هم دعا وکړه چه زما هم خدائے جنّت نصیب کړی. ځکه چه زه هم د روحانی خوشحالئ اروزمن یم " زاهد ورته جواب ورکړو.

" ماته خوستادا ارزو ډیره گرانه ښکاری. او خدائے خبر که پوره شی د فرښتو سره نزدے والے او تا په شان سړے چه پښې ئے لکه د بزو وی؟ " دغه سړی ورته اووئیل

" زما پښو څه گناه کړے ده. ما خو ډیر داسے ساده گان خلق چه سرونه ئے د خرغوندے وو جنّت ته په تلو لیدلی دی."

له فان. (FAUN) یو خیالی څناور چه وجودئ لکه د بزے او سرئے د انسان وی.

صاحبزاده حبيب الرحمٰن صاحب قلندر مومند ایم اے
(چه په کال ۶۰-۱۹۵۹ء کښې د انګرېزۍ استاذ وو)

غزل

خوله م کېښوده او ده شوم په رنګينو خسارونو
چه مسود د ئ پره کيدلو راغے خوب په انګارونو

ما د خيل بزم د يوه کړے ورته کوم غلے سوزم
ستا محفل ته څنګه درشم دے قدغن په اظهارونو

دا د حسن مملکت کښې کوم نمرود دے پيدا شوے
چه د ئ پرونو کلي وران شوا وشو پور په ښارونو

چه په مو نږ ئ چمن اور کړو او س دِ راشي که کتے شي
سرۀ لاله په سرو ميرو کښې د ارمان په مزارونو

دا په دے لاره تېر شوے کوم د وينے سودا کړے
چه ګلونو کښې سا نشته وارخطا د بهارونو

چه د ستا د پاره ورک شول نداره ئ لږ وکړه
مينه ! څو مره ښکلي ښکاري ځوان فکرونه په دارونو

ستا د مينے برکت دے چه څوندونه ماتړي
څه د چا په الزامونو څه د ستا په انکارونو

دا د چا د مينے داغ م په تندي د ے ښکيدلے
چه بدنام شومه رسوا شوم په کوڅو په بازارونو

قلندر ستا سو تکل کښې تو مونو شپو ته غاړه ايښې
کوم خلسا ځکښي يو ځدک شوي ښکلو ښکلو سهارونو

عبدالرحمان فیاض
مخدوم کلال

غزل

سترګے مې غریبږی د ستا سترګو ته
ولے به بیا ګورم دَ چا سترګو ته
ته چه نه ئے غلے خفه ناست یمه
نه شمه کتے دَ بل چا سترګو ته
راشه که دَ زړه حال مې لږ ګورے نن
سترګے مخامخ کړه ځما سترګو ته
نور به راته څه وائے دا ډیره ده
اوګوره ځما په ژړا سترګو ته
نور مې که غم نه کړے خیر دے مکوه
خیال مې لږ کوه دَ وفا سترګو ته
روح مې هم خوشحاله شی چه اوګورم
یو وارے دے ستا په خندا سترګو ته
هر اندام دِ خپله ستا صفت کوی
زه دِ یم حیران دے شهلا سترګو ته
زه فیاض چه ستا په لوری اوګورم
راشی یو نښکلے رڼا سترګو ته

اورنګزیب استر افریدی
(دریم کال)

غزل

سلسله دے د سلګیو په ماښام کښې راته راوړه
انتظاره! زړه شکنی دے په انجام کښې راته راوړه

معصوم دید مې اونختلو په حلقو کښې ستا د زلفو
د "ادا" داتمناده چه زړه دام کښې راته راوړه

په اشنانو کښې د سترګو رویداد د بیګانے شپے
نظر یئے د رقیبانو، په سلام کښې راته راوړه

څما فکره لیونیه، پس د شونډو و د زنیخو نه
د ساقی د دَر دیوار ټول په نیلام کښې راته راوړه

ستا دا زیړ زیړ اننګی به بیا سرخی د شفق ولځلی
د بنو تورو د روحیو په نیام کښې راته راوړه

ستا کابره کتل صنمه شول په هره ورځ مرګونه
میشا کړه تبسم نن، ژوند پیغام کښې راته راوړه

شمس الحق شمس
دوئیم کال

غزل

غاړه په غاړه د رقیب سره چه یار وینمه
لیمه م سره شی پکښ سیخ چه رقیب خار وینمه

خاطر م غوڅ شی چه نظر م په رقیب پریوځی
لاشی ستی چه رقیب خواکښ د نګار وینمه

غوټې د زړه م شی خفه پرخه پر ووژړیږی
زه چه بوستان کښ بے له یار سرو چنار وینمه

نه چه کوم لوری ته نظر کړم خلق خوشحاله ګرځی
زه بینوا په جدا ئیجه کښ ځان په دار وینمه

دا روغ وګړی د لیمو په خمار مست چه کړے ته
زه لیونے له ډیره قهره ځان په نار وینمه

ته چه په چا باندے د مهر باران اُووروے
زه له چشمانو په ملن باندے جو نبار وینمه

نور غم نیلی چه اُوده شی غم تر لار سئی یاره
ولے زه شمس سره ستا غم لیل والنهار وینمه

۵

محمد آباد چمن داؤد زئ
اوسنئ کال

غزل

ستا دَ سرو سترګو میخانے چرته دی؛
هغه دَ مینے افسانے چرته دی؛
ړاوړه ساقی نن شرابونه ړاوړه
هغه نسکوړے پیمانے چرته دی؛
نن خو دَ غم غزلے وایم آشنا
دَ خوشحالو رَم ترانے چرته دی؛
په هره لاره نن لټون کوُمَ
سُتا دَ پلونو نښانے چرته دی؛
چه شکریه ستا دَ لیدو کړم اما
هغه فقرے دَ شکرانے چرته دی؛
بس چه په مینه کښ لمبه لمبه شی
هغه چمنَ پړوانے چرته دی؛

امین الله بېدار دویم کال
۵۱-۱۹۵۸ء

غزل

په خندا خندا راغلې په ژړا ځم
زه وللې ته له لوړې د بېديا ځم

ګرځوي راپسې يار زنځير دَ زلفو
دَ مجنون غوندې په لوړې دَ صحرا ځم

تاله دره څو څو ځل يمه شرلے
نن دَ عمر په نيته درنه رښتيا ځم

ياره! ته چه دَ رقيب خواکښې ولاړ ئے
ستر ګے کوزے کړم د شرم ودَحيا ځم

که هزار ځله دَ صبر پياله نوش کړم
تصور چه دَ يار دا شي په ژړا ځم

نصيحت دِ په غوږ نه آورم ناصحه
ځه بېدار به نن ديدن له. دَ آشنا ځم

بشیر احمد (اولنۍ کال) افسانه

تاثیر

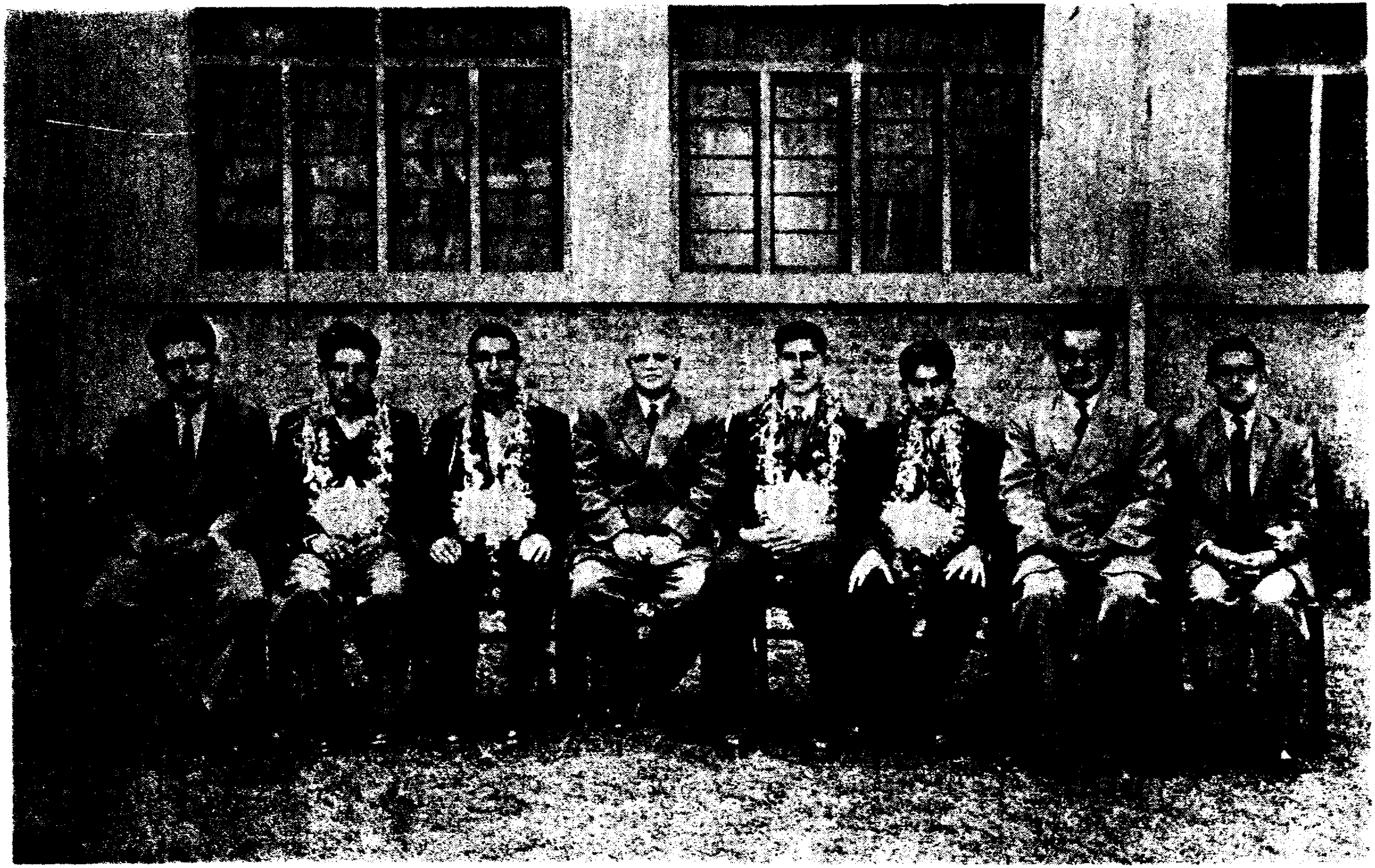
سلیم خان حماد د ترور ځوئے دے. ښه ښکلے ټکره ځوان دے. او هر وخت بت کښې ګرځي. خو واده نۀ یې سے رنګ ورځ په ورځ زیړیږی. بدحاله او پریشانه ګرځي. او چا سره ورته خبرے هم خوند نۀ ورکوی. واده ئے هم پخپله خوښه کیږي دے. مور ورته څو څو ځایو نوکښې جینکۍ خوښے کړے وے. خو ده داهغو نیولے رو. چه واده به پخپله خوښه کوم. او خپله خوښه ئے اوکړه. واده ئے ښه دروند د دوړمه سره وو. او انتظام له ئے پوره یو هفته مخکښې نه بیلے دم. هغه یو ځواکه حماد د ترور ځوئے دے. نو بل خوا م یو ښه دوست هم دے. د واده په ورځ دومره خوشحاله خوشحاله ګرځید و چه هر چا ته ئے زیات کار پخپله کولو. او ټوله ورځ ئے ځان تیکے تیکے کړے وو. هر چا سره ئې جان. او خندا سره خبرے خو هر څلے د خپل واده په ورځ کوی. ولے دے په حیثیت د نوروو نه زیات ښکاریدو. میلمه به لا په حجره را نوتے نه وو. چه دے به په یو ټرک کښې وود سیدلے وو. او داسے ګلک لاس به ئے ورکړو. چه میلمه خوار به تر ډیره وخته پخپل کس لاس د بیا لاس چاپه کوله. ما ورته څو څلے اوعیل هلکه! کار پریږده. لږ آرام اوکړه. او دیر ځان مه ستړے کوه" ولے د هغه په غوږو نه لږیده. ما هم فیصله اوکړه. چه بیا به ورته نه وایم. په دے وجه نه. چه ده ځما خبره نۀ منله. بلکه ما ته د لسو میاشتو مخکښې هغه زړه واقعه رایاده شوه. چه د شمشادی واده کښې ده داجینۍ لیدلے ده. او بیا ئې غوښتې وه. شمشادے د ده د ترور ځوئے دے او داجینۍ د شمشادی د مور خپلوانو کښې وه. په هغه شپه مونږ ته هم د دغې په وجه شمشادی دوئ بلنه راکړے وه. او ما هم ورکښې ګډون کړے وو. او ما ته د سلیم خان د دے خوښے ځکه پوره پوره پته وه. چه یو ځو ده ما ته پخپله ټوله قیصه تیره کړے وه. او بل دا چه مور ته دا حال اوو. نو مور ئې پلار ته اووے. او د پلار ئے د خولے هیڅ وهاک نه وو. هر پیژندګلو او نا پیژندګلو سره به ئے هم دا بیان وو.

سلیم خان دا جینۍ د واده په شپه هغه وخت لیدلے وه چه جینکو شادولے اچولے ده او نور دے ګرځے جینکۍ ئے تماشے ته ولاړے وے. د سلو واتو بلب لاندے د هر چا مخ داسے ځلیدلو. لکه چه د جنت حورے راکوزے شوی وی. سلیم خان د ښځو د دروی انتظام د پاره د یو دی کښې ولاړ وو. او د پهرنه به چه کوم وکے خوا یې راتلے. نو د کور زنانو ته به ئے کوټه کښې ورکولے. او تښه به ئے بیا پهره ته لیږلے. او چه پهر یاد نۀ نۀ به کار کښې لوشان سوړ والے راغلو. نو د جینکو په تماشه به شو.

شاړوله د لاسونو په پړقه کښې ښه ګرمه وه. او ټولې جونه ښه په مستۍ وې. څوک ګډېدلې. څوک خندېدلې او د چا امزرې وسترګو د زړونو ښکار کولو. ناګهانه یو غشې راغلو. د سلیم خان زړه پرې اولګېدلو. او زړه نړې خوږې دردونه شروع کړو. د هغه الوتونکې نظر دومره بې وفائي اوکړه. چه ځانګړې د کټ د پاسه د پورې ولاړې جینۍ په خندانه څهره ورښخ شو. په یو نیب ګتو شو. او په غاښونو ئې د ښي لاس د ګوتې او مړاکې ګوتې نوکونه چیچل شروع کړل. د ماحول نه بې خبره په خیالي دنیا کښې ورک سلیم د ثمرې ترور داخبره کله... اورېدلې شوه - "یو دوه تالۍ ورټې پکار دي" هغه خو د چا سرو شونډو او انګلو داسې نښه کړې وو چه خواوشا خلق څه. چه خپل ځان ترې هم هېر وو. ثمره ترور له راغکښې شوه. او په خپل ګس لاس ئې سلیم له رونوند په سینه ډیکه ورکړه. هغه د خیالي دنیا نه رابهر شو. او دې نه مخکښې چه د ثمرې ترور خبره واوري. هغې نه په منت زاري او خواستونو سر شو - "ثمرې ترور! په خدائے به شي او په تا - یو کار راله اوکړه" ـــــ د ثمرې ترور څه راضي کیدل وو. مخ سره تیاره شوه. او مدعا ئې ورنه اوپښتله - سلیم خان ورته اووې - "د دغه ځانګړې جینۍ راته پوره پوره پته اولګوه." او ثمره ترور چه د دې کارونو ډېره ماهره وه. لږ وخت کښې ئې سلیم خان ته ټوله نښه پته ورکړه. او د دغه واده په لسمه ورځ د سلیم خان مور د ثمرې ترور په ملګرتیا کښې د فیروز خان د لور غوښتو له حاضره شوې وه. او ورسره خبره داده. چه ژوند وخاوند نه ګونګې دولت ډېر ارزي. سلیم خان دوئ ښه مالداره وو. نو ځکه فیروز خان او د هغه ښځې په کښې څه ننه مه اونکړل. او صلاح شول. د ثمرې ترور هم د ګوتو تمهید وځائې پیدا شو. د سوال جواب. بره ښه وتیکه د هغې په لاس شوه. او د واده په ورځ خو هغه سخته خوشحاله وه. خدائے زده چه په واده وه. او که نه د جینۍ په هغه جوړه. چه د سلیم خان مور ورله د واده په خوشحالۍ کښې کړې وه.

د واده ورځ په ډنګ ډونګ تېره شوه. جنجیان سره د ډولۍ ماښام کلي ته بېرته راورسېدل یو ساعت پس د بهر میلمنو ډوډۍ او خوړله او بیا ستړي ستومانه د لارې سفر وهلي د حجرې په کټونو کښې اوغزېدل. سلیم خان چه لږ وخت مخکښې د خوانانو منځ کښې ګیر ناست وو. اوس د واړه ځینې خوږنده یوائې کښې کښې ملاست وو. یو ساعت پس زه پرکاله غونډ شوم. او له م سترګې ورغلې نه وې چه دې کښې کټ یو چرګ ناسې کړو. زه نیغ کیناستم. سترګې م اومښلې. او چه م او غوړولې. نو څه ګورم. چه سلیم خان راته د کټ په بازو ناست دې. ما ترې پښتنه اوکړه. "هلکه! خیر شو." او هغه یو ساعت هیڅ او نه وې. کټ کښې کیناستو. نو د ځ ئې اوکړه. او پاسیده. یو سوړ اسویلې ئې اوکړو. او وې "ترورې ګوره! ډوب شوم خو بې ځایه افسوس....... په ظاهر لباس تېر وتم."

Civics and Political Science Society Govt. College Peshawar
1962—63



Left to Right:— Prof. Qaiser Aminuddin Asstt: Director, Mohammad Tahir I Yr. (Joint Secretary), Sardar Mohammad. II Yr. (Vice President), Ch. Mohammad Ali (Vice Chancellor) Chief Guest, Azizullah Afghani IV Yr. (President), Mohammad Ibrahim III Yr. (Secretary), Prof. Mohammad Ismail Sethi (Principal) Patron, Prof. S. M. Salim (Director)

عرفان الله عرفان (افسانه)
درېیم کال

نامراده هاوال

دَ هغه په آواز کښې خوږه سوز وو. دَ هغه دَ زړهٔ راښکونکې آواز نه علاوه که دَ هغه بدن ته چا په غور کتلي وے نو دَ هغه مضبوط جوسه، تورے تورے سترگے، نسواري رنګ و ښېښته رنګه پوزه. سوږے سوږے شونډے به هیڅ کله دَ چا نه هیرے شوے نه وے. دَ هغه ښائسته بدن سره هم دغه رنګے ښکلے آواز پکار وو کوم چې هغه له الله تعالیٰ ورکړے وو.

تاجي به چې دَ ماسخوتن نه پسته په حجره کښې کېناستو. نو دَ حجرے کنډ ملګري به دَ هغه دَ مجلس دَپاره لیواله ناست وو. مستان به ډیر ښه رباب غږولو. جماګي به هم په منګي غږولو غږولو دَ لاسونو نه پو ټکي یو رل. خو دَ دوئ دا ټڼګ ټکور به د تاجي په غیر موجودګۍ کښې دا سے ښکیدو لکه چې سړے شوملو سره مټهۍ خوري.

نن شپه دَ تاجي زړهٔ نه وو ولے بیا هم هغه ډیر و دوستانو مجبور کړو چې څه مجلس اوکړي. تاجي مجبور کړے شو او هغه نن شپه ډیر ے ښکلے ښکلے سندرے اوویلے. اوُ دَ زړهٔ په تاوُنے اوویلے دَ هغه ارماني ارماني ټپو دَ ډیرو کسانو سترګے دَ او ښکو نه ډکے کړے اوُ دوه درے کسانو خو په ښکاره هم وژړل. دَ شپے په چپه چپیا کښې دَ هغه آواز به تر ډیره لرے لرے کلو پورے آوریدے شو.

تاجي چې نن مجلس ختم کړو اوُ دَ تورو تورو سترګو نه ئے لا څڅیدلے څو اوښکے پاکے کړے نو بیو دَ څه کپ شپ نه سپک کور طرف ته روان شو. هغه له نن کنډ و خلقو دَ زړهٔ دا خلاصه شاباسے ورکړو. ولے تاجي په خوله دَ شاباسي هیڅ شکریه ادا نه کړه. صرف دومره قدر ئے کار سځ وکړو چې سر ئے ښکته کړے وو. اوُ تورے تورے سترګے ئے په سرو سرو ډیپتو کښې څه ساعت دَپاره پټے کړے وے. خلق نن حیران وو. چې هلکه په تاجي باندے څه چل شویدے نن خو ډیر غمژن غمژن ښیدے شو.

جماګي ورته غمژن به لیدے نه شي تو له ورځ غریب د پوه مزدوري پسے اوګرځي. آخو

انسان دے څه حیران خو نه دے۔ مستان او وے داخو ستا سو د خوشحالولو د پاره دلته کښې ناست
او څه څے هم ډیر مجبوره دم. کلې په هغه څه سندرا ښه لیکلې ده۔ یره دیره مهربانی چه هغو زړو
خوشحالولو د پاره دومره تکلیف کوی۔ د جرگې کونو کسانو په یو آواز کښې او وے۔ څو کسانو په کښې
شادی ونه او سندرل او د گورو نو څه څے اوکړه۔ مستانی او جماکی دی هم د چیلم څکلو نه پسته او کښینول
په نیمه شپه تاجی په توله شپه کښې سترگه پټه نکړے توله شپه ئے کوشش اوکړو چه پخپلو
سوی سوی اسویلو د زړه دا دېرو نه بار سپک کړی خو د تاجی خیال هم خیال پاتے شو۔
تاجی۔ جماکی او مستانی په خپلو کښې د یو بل سره دیره مینه وه۔ د دی یے دا او په د یو کار د پاره
هم یو مصلحت وو۔ خو کوم دی دنگ کار چه تاجی ته تن صبا پیښ شویے وو تاجی دا نه غوښتل چه په
دے دی دنگ کار کښې هغه د شان سره بل څوک شریک کړی۔ او هم دغه وجه ده چه هغه ما راز د یره
موده په زړه پټ ساتلے وو۔ هغه څو څو ځله کوشش کړے وو چه هغه دا راز مستانی او جماکی
ته د زړه د اخلاص او وائی او د زړه نه دا دی دنیا رڅه لږ شانتے کم کړی۔ خو د پښتو نه
دے حیا د هغه په ژبه باندے مهر وهلے وو۔
تاجی به چه د سحر مانځه دعا و شکرانے کښې پسته پسته پلاله سمه ما سمه کړه۔ نو غوږ
بے شیرینے ما لافو نه راتله۔ دیوال ته ولاړه د خو نه چوکه بے را واخسته او د خپلے کوټے
موره د اجازت غوښتو نه پسته به په تنده ئے تنده ئے دکور ره اوت۔ کیرچا پیر کلو کښې ئے چه ما
راغونډ کړے نو هغه بے د شیرینے دی کلی پلو اوکړه۔ او په نمبر نمبر به آخیره د هغوی کره
ته هم ورسید۔ شیرینے به چه د تاجی آواز د کلی په کوڅه کښې واورید نو کوټے ته بے منډه
کړه د چرگو ما بے راغونډے کړے او په دے خاق کښې به ناسته وه چه او س به د کلے د سترگو
تورو د زړه شکور تابے را اوړی او د دا به ورله څو جمع شویے آگئ ورکړی۔
تاجی به چه په توله کلی کښې هاغونډے کړے نو په دی سته به شیرینے دی کوټے لره را
... ساعت د پاره به گیناستو۔ په دے کښې
به د هغه خو یو ...۔ ... به شوه۔ تاجی ته به خدای الله ما غله۔
... د میینے ... خبرے به
... تاجی به ... شیرینے په ... د
... خو د هغه ... په ... د دی یو چه ...

تاجي خو داغوښتل چه هغه به دَ شیرینې دي کور ته ځي دَ دیوال ځوا ته هر وخت ناست وي اوُ شیرینه دې ورله جام په جام اوبه راوړي چه تنده ئې ختمه شي. خو هغه ځپلې خوږې شیرینې زمونږ دَ ځپلې تندے سره ولو دَ پاره چرته تکلیف ورکولو.

شیرینې به چه تاجي له دَ چرګو هاګۍ راوړے نو تاجي به په بدله کښې دوچنده پیسے ورکړې شیرینې به دَ زیات قیمت اخستو نه ډیر انکار اوکړو. هغه غریبه وه خو په زړه مالداره وه. دَ زړونه اوبډے نه وه. ځکه به هغې دَ زیاتو پیسو اخستو نه ډیر انکار اوکړو- خو چه دَ تاجي ټنګان ته به ئې اوکتل نو پیسے به ئې واخستے. تاجي نه به ئې اجازت اوغوښتو او کور پلو به پسه راپسے رفتار کښې روانه شوه. لکه چه سپوږمۍ په وریځو کښې اخوا دیخوا شي. او آخیر په کږو وږو کښې ورکه شي. دَ غوا ر لسے سپوږمۍ پشانتے به شیرینه هم په یو ساعت کښې دَ تاجي دَ سترګو نه پناشوه او دَ ځپل کور اوچتو دیوالو نو شاته به پټه شوه. دَ شیرینې پټیدو سره به دَ تاجي دپاره تک توره تیاره جوړه شوه. اوُ تاجي غریب به مراوے دَ دیوال دَ سورې نه پاسیدو اوَ کور پلو به په دسے ناکهانه تروږمۍ کښې ترونږ دَ ورندې روان شو-

دومره ورځې تیرې شوې تاجي دَ شیرینې دي کور له ورغلے دو- اوُ هغې ورته ویلي وو چه تاجیه نه به صبا له وختې کنیزې دَ ترَه دَ ځوئې واده له ځم اوُ دوه ورځې پس به راشم نو تاجي ورته په ډیره ناخوالئ کښې اوئے. بیا خو دا لاړه شوه نو خو بیا کوږے زړه راشه هسے نه چه ورځے ډیرے تیرے کړې- خو چه شیرینې ورله تسلي ورکړه چه نه ژر به راشم- نو تاجي لیونی شانه شو اَو کور پلو روان شو-

تاجي دوه درے ورځے لاندے باندے کلي په کلي ځاګۍ راغونډے کړے خو دَ شیرینې دي کلي ته لاړ نه شو- دوه ورځے لاندے باندے شنګرۍ کالا دَ کلي ځاګۍ راغونډے کړے. دغے بیا هم دیرو تیا ته دَ تاجي بنګلي آواز ته غوږ ایښودے وو- اَو ځاګۍ ئې ساتلے وے چه کله به اوس راشي اوُ اوس به راشي-

تاجي به چه هره شپه په کټ کښې څملاست نو هغه به صحن سره ګور کولو چه هغه شیرینه اُچا په خیال کښې راشي څوک مئې او نه وین اوُ دَ هغه دَ دسے جوړ شوی باغ شنګي کړا ګل اوند ځي کوي. خو هغه سره به سره چه دَ هغه مازغو نه دَ شیرینې ځپلو هسے ورکه لوږے نو دَ هغه دا کپه خیال به دومره هسے شي.

د دې ورځې پس تاجې سحر وختي د کوره اووت هغه خپله ناروغه مور په کټ کښې پرېښوده په تول لاره څپلې غريبۍ ډېر اوتړ ټولو هغه مجبوره وه ډېر نهايات مجبور. هغه ننه خپله غريبي ډېره محسوس کړې وه. خو چه شيرينه به ورته په لاره کښې ور ياده شوه. نو د مور ناروغتيا به ترېنه څه وخت له هېره شوه. هغه ننه د هغې ملاقات له ډېر ناست وه. ځکه مخې په داؤ داؤ تول کلي چا ننم کړل او چه د شيرينې دي کلي ته ئې چه لحنه اوکړه او په کلي ور ننوتو نو ډېره وشمۍ ودته کيلې اوکړې چه چرته ورک شوې وې. ورله په جواب کښې چه ورته تاجې د مور د ناروغتيا اوې نو د هغوي غصه به په کميد وشوه. او ژبې به د نورخه ويلو په مقابله کښې د تاجې مورته په دُعا او کوځيد ې. د شکرېئې ويلو نه پس به تاجې لږ مسکې غوندې شو. او محکښې به وراندې شو. تاجې چه ننه په تول کلي کښې ها غوندې کړې. نو ورسته کښې . د شيرينې دي کورته ور سيده و. ديو بنګلی" چرګې ها" آواز کولو نه پس د ديوال سوري ته کېناستيده و. هغه ننه ډېر تږې وه. د دوؤ ورې ودځو راسته تږې. هغه ډېر ساعت د کوټې محکښې انتظار اوکړو. خو د شيرينې په ځائې د شيرينې مور هغه له د دواؤ د دې ور څو چمه شوې اکئې را او بېستلې. تاجې ترېنه د دومره وخت نکولو تپوس اوکړو. لېکې ورته په جواب کښې اوې بچې شيرينې ته د چرکو د هاکو ځايونه معلوم دي. څه ورپسې ډېره اوکرځيد مه. نو ځکه ناوخته شو. تاجې حيران وو چه شيرينه ننه ورلې بهرنه اوژنه ژ. تاجې ترېنه تپوس اوکړو. ورلې ادې شيرينه څه شوه. خير خو دې؟ بچې هغه ترهٔ کره واده له تلې وه بس هغلته کښې سخته ناروغه شوه. څه ترېنه راغلم او هغه رم هلته کښې پرېښودۀ ماويئې څه چه ښه شي نو بيا به راشي نې.

تاجې چه د دې قسمه خبره واؤريده نو اوچت سرئې ناورند شو. په بدن ئې ځغل راغلو. پېښه ئې د شيرينې مور له درکړې اوئې رادوان شو.

تاجې ننه شپه ډېره نهايات خفه وو. او هم دغه وجه وه چه هغه ننه شپه په حجره کښې د مجلس کولو نه پس چا سره خبره قدمې هم او نه کړهٔ او کور پلو خفه خفه د حجرې نه لاړه تاجې به هر ورځ نه د شيرينې دي کلي ته تلو او د خپلې خوږې شيرينې تپوس به ئې کولو. د لېکې شپې ورځې تېرې شوې خو هغه خپله خوږه شيرينه اونه ليده له. تاجې ننه صبا ډېر غمژن ليدې شو. هر وخت به مراو وې وو. د هغې په آواز کښې اُس هغه

بنګلا نه وه پاتې شوې. تاجي له خبرو اترو، خوراک څښاک کپ شپ هيڅ خوند نه ورکولو - تاجي اوس د لس دولسو شپو راهيسې په حجره کښې مجلس هم پرېښى دے وو. يوه شپه تاجے چه په کټ کښې پروت وو. د ځان سره يې ئے اراده اوکړه. " هرڅنګه چه کيږي څه به اې ومرو د شيرينې دې د تره کور پيدا اکوم او د شيرينے تپوس له به هغلته کښې ورځم "

تاجے چه سحر وختي پاسيدو. مور ته ور تهيت شو او به ئے ورله ورکړے. چائے پرے هم اوڅکوله. او بيا ئے ترِنه اجازت اوغوښتو. مور ورته په جواب کښې اوے بچې نن مه ځه بچه نه يم. خو تاجي د مور او نه منله ځکه چه دا قسم الفاظ به هيڅ هر وخت استعمالول. مور ځان ته راجوخت کړو. ښکل ئے کړو. او بيا تاجے رخصت شو. تاجے د کلي نه لوے سړک ته او تودهاؤ شکرئ ئے په سر وَه. او د خونه چوکه ئے لاس کښې نيولے وه. په سړک لاړے ئے کښې کيناستو. دوه درے ګهنټې پسته د کيړے نو د کلي ته ورسيدو. کلي ته چه ور ننه وتو نو ښه په نادرئے چرګه ما" آواز اوکړو. د کلي ښځو چه دانوے او ښکلے هاوال اوليدو نو ډيرے خوشحاله شوے. په يو ساعت کښې تاجي ډيرے اکئ راغونډے کړے او آخر په تپوس تپوس د افضل کاکا کوټے ته هم ورسيد. کوټے ته چه ور نزدے شو نو آوازئے اوکړو." راوړئ شپږ پيسے ما" تاجے يو ساعت د افضل کاکا کوټے سره جوخت ولاړ وو. په دے کښې ناګهانه نو پته کښې پټ لاس د کوټے نه را اووت. او تاجي له ئے په چيه خُله آکئ ورکړے. تاجي چه د پيسو بوجګئ نه پيسے را اوپستے او د کوټے نه پناه زنانه ته ئے اوويلے چه هغه دا پيسے واخله د زنانه لاس د کوټے نه بيا راووت ونے پيسو طرف کوړ نه شو. په نو پته کښې د زنانه پټه چيرے تاجے کلک د ګچے او نيو او د ځنے نيولو نه پست د تاجي ښکلے يلئ په ژړغونې ژړغونې آواز کښې اووے. تاجيه سلمان کړه. ته به ځما د ننګو ميلے ډک ځ او په رندو ستړګو ئس څه اوکړے: تاجي چه د پيغلے شيرينې د غلے دا ستے قسمه خوخبرے واوريدے نو د چيو لاندے ئے مزکه او ښتيده او يو درځ شو چه د ګوشکرئے د سونه دا پريوته په کښې ها چوره چوره شوے. په ځغر ځغر د کلي نه بهر را اووتو. داسے ښکاريد ونکه چه دماغي توازن ئے خراب شوے وي. سړو ښځو بروښځے تاجے د يو کلي نه بل کلي ته او بل کلي نه بل کلي ته په منډه منډه خلاص دو. هغه تاجے چه شيرينے به په کلي هم نه ده وېښتے ماشومانو اوس په کاڼو ويشتو. په کلي کښې خلقو ډير ساعت د تاجي د مور جنازه جماره کړه چه اوس به تاجے راشئ خو تاجے د چا د غمه په يو لوئے سفر وتے وو - په ډير لوئے ښکر

یونس قیاسی (راولنډکال) (افسانه)

خونړۍ دنیا

دُ شپې تورسے تیرے خپل تورجال په کائنات پوره خور کړے هم نه وُو۔ چه "احمدخیل" نومے قبیله کښې یوه غوغا جوړه شوه۔ دَ قبیلې ټولو خلقو دملک دلاورخان کور پله منډے وهلے. دهرچا په ژبه دَ ملک دلاورخان نوم وو۔ دملک حبیب لوے او خائسته کور نه یوه ماتم کده جوړه شوے وه۔

دوه مړی د ویښو په یو لوے سیلاب کښې لړلی پراته وُو۔ اوملک دلاورخان په یو کټ کښې غلے ناست، مړګے ته ئے کتل۔ دَ هغه سترګے ړندو او ښکو نه ډکے وے۔ ټک تور او لوړ بریت ئے چه هروخت به لکه دَ تیغونو تیغ ولاړ وُو۔ نن کوزنه وړند وُو۔ او ټک سُور مخ ئے لکه چه اکثر به دَ نمر دَ سترګے په شان روښ وُو۔ نن دَ خزان دَ پاڼے په شان ټک زیړ وو او هغه دُړوند ټوپک ئے، د غه مړو سره جوخت پروت وو۔ او کورے د ټولی قبیلے خلقو نه ډک وو۔

دواړه لاشونه په یو ځائے پراته وو۔ په دے کښې یو لاش خو د ملک دلاورخان دَ ځپلے وفادارے او پاک دامنے ښځے وو۔ او دویم لاش دیو ښکلی او خائسته ځلمی وو۔ دغه ځلے له موجوده ساعت نه اګاهو نه چرے دلاورخان لیدلے وو۔ او نه دَ قبیلے نورو خلقو۔ هرچا به چه یو ځل داخو نړے منظر ولیدلو، نو وړو به ئے او به شو او دَ دغه کوره به بهرته راووتلو۔ دَ لاورخان دَ کور ښبهر میدان هم دَ خلقو نه ډک وُو۔ هرځائے کښې واړه واړه ټولی جوړ شوی وُو۔ هرطرف ته پس پسے شروع وُو۔ هیچا هم دومره جراُت نه شو کولے چه دلاورخان ته لړ ورنژدې شوے وے۔ او حالات ئے ترِ معلوم کړے وے۔ ځکه چه دَ ه قبیلے نو سپین بږیري مشران هم چپ وُو۔

باوجود ددے نه هم چه چا دَ دلاورخان نه حالات معلوم کړے وے، خلقو ځپلے ځانله خبرے مشهورے کړے۔ چا وے چه "دغه ځوان دَ مهمند وو۔ دملک حبیب تربور ونے ئے ټله

تعلقات وُو۔ ئن ملک حبیب دواړه په خپل کورکښ په مجلس اوليدل، او دا سے جوش کښ راغلو په دواړو کښے فيصله کړل "اوچا دا خبره خوره کړه۔ چه "دغه ځوان دَملک حبيب ميلمه وُو. چه راغلو نو ملک حبيب په کورکښ موجود نه وو۔ ښځه ئے په کورکښ تنها وه۔ هغې ئے ميلمستيا اوکړه۔ وے ددغه ځوان نيت ورته خراب شو، لاس ئے ورته واچولو۔ چه په دے کښ پرِ ملک حبيب راغلو۔ دَ ښځے نه ئے په ميلمه دَ ذ اوکړو۔ نبه ئے ختا شوه او دَ ميلمه په ځائے ئے خپل تمبراولګيد و۔ او بيا ئے ميلمه هم اوېشتلو" دغه شان نورے هم ډيرے خيالی اوفرضی خبرے کيدے۔ وے دَدغه قتلان اصل حقيقت نه دَ قبيلے يوکس هم واقف نه وو۔ بلکه اصلی واقعات خو دَ دورِ ماضی په شاه پناه وو۔

دَ ئن نه پوره شل کاله اګاهو۔

"احمدخيل" او" بهادرخيل" دوه بهادرے قبيلے وے، دَ دغه دواړو قبيلو تعلقات ډيرخراب وو۔ ددواړو قبيلو نړه او دَ پشتو نو دښمنی وه۔ او په دے دښمنئ کښ دَ دواړو قبيلو دَ ډيرو نوموړو او د بهادرانو شاه ځلمو خپلے وينے تويے کړے وے۔ ستړانو عظيمے قربانئ ورکړے وے۔ اصلی دښمنی خو دَ دواړو قبيلو سرداراتو وه۔ او په دے کښ دَ احمدخيلو دَ سردارانو کورنئ خو تقريبًا ختمه وه۔ ددغه کورنئ صرف دوه کسان ژوندی وو۔ "شيرخان" او" دلبرخان" دا دواړه رونړه وُو۔ د لبرخان بے وادہ وو۔ او شيرخان کښې صرف دوه بال بچ ئے وُو۔ په دغو کښ يو دپنځو کالو ځوے ئے وُو چه شمروزخان نوم ئے وُو. او يله دَ دوؤ کالو لورکل پری وه۔

ئن دَ "احمدخيلو" په ټوله قبيله کښ خوشحالی وه۔ هرطرف ته مشعلونه بل دوُ۔ هرخواته نسا قسم مظاهرے کيدے۔ ئن دَ د لبرخان وادهُ وو۔ او دَ هغه ورور شيرخان خو بے حده ډيرخوشحالَ وُو۔ بلکه دَ قبيلے هرکس د شيرخان او دَ دلبرخان خوشحالی خپله خوشحالی ګڼړله ځکه چه دَ قبيلے دَ سرداړانو کورنئ وه کنه۔

دَ ځوړے لوے اومضبوط کټونه دَ خلقو نه ډک وُو۔ يوخواته دَ قبيلے يوسوزميندار ناست وُو۔ دَ چلم تويئ دَ ساړونه ډکه وه۔ دغه زميندارانو به لحظه په لحظه دچلم دَ تويئ په ملړو به دهوړ سروتيکے اېښود ے۔ او سوړ لوګے به ئے تراوخکو۔ څه واړه هلکان دکټونو په ډاګئ دخاورو په سلوبے پرواهئ سره پړتلئ وهلے ناست وُو۔ په منځ ميدان کښ درے

ځلود یوزکی پراته وو. د پاسه پر تولا یانے غوړ دے وے. د تولا یانو په ځکینئ حصه
دوه بالښتونه پراته وو. او پر د پاسه دوه ماه جبینے په ریښمنو جامو کښ ملبوس ښتے نا
ډول سینګار ئے پوره کړے وو. د سرو او دَ نی پر و اصلی او نقلی کالی پرا نباز وو. ځلے
پاند ونو نه ډکے وے، او پر د یر ساعت نه ئے شمخوند و نه وهل. شاه نه ئے سازیان نا
ووُ خپل سازونه ئے سازول. ګویا دَ تماشے پوره انتظام وو. هر خوا ته دُ ډمانو دُحسن
غږ ووُ. دَ دوارو ډمانو شکلونه یو شان ووُ. تو رے ژو رے سترګے، او بدے زلفے، پو
تندی، رو زے هر څه ئے مشابه ووُ. ګویا د شباب په عالم کښ ئے هم هیڅ کے زیاتے نه
دوار ه ډمانے په خپل ځا ئست او مشابهت کښ دَ قدرت دَ بے مثاله فن یوه نادره نمو
ټول ناست عالم دَ قدرت د دغو عجو بو په حرکت کښ ډیر په بے آرامئ سره انتظار
آخر دَ دغو خلقو دَ انتظار ګړئ ترسره شوے. دوا ړه ډمانے د خپله ځایه را او چتے
دخپل استاذ او دَ نو رو سازیانو په پښو پریوتلے. دَ هغوی او ستاذ هم په ډیر فخر یه ا
کښ په خپلو ګنړو او نورو پر یتو لاس را ښکلو. دوپری مارهم خپلو دوپرو له تنګ و
او بیا دواړو ډمانو په ګنړو ساز ونو خپل شریک رقص شروع کړو.
دَ واده خاوند دلبرخان هم دَ خپلو ځلمو دوستانو په ټولی کښ ښخ ناست ووُ. یارا
دوستانو ئے په سرو د پئ اینبو دے. په لږ ساعت کښ دَ ډمو په دے کړا کښ دَ قبیلے خلق
دلچسپی وا خسته چه له ډیر جوشه ئ دَ ډمانو هرے یوے ټیپے او هرے سندرے او نو
ئے سرونه خوځول شروع کړل. هر چا خندل، دَ چلمو نو او د چرسو نو دور جاری ووُ. او
کس په یوه عجیبه منتئ کښ مست وو.
ناګهانه یو شور جوړ شو. دلبرخان دَ کټ نه کوز پریوتلو. دَ سرو وینو یو سیلاب ج
او یوه لحظه پس دلبرخان دا سے قلار شو چه هډ و د پ ئے هم او نه وهلو. یو څو کسانو دَ
او نیو و. او چت ئے کړ و. یو لوئے خنجر ځن دد لبرخان په سینه کښ ښخ وو. ا فرا تفری
شوه، هر کس حیران او پریشان وو. وے دا پته هیچا ته هم او نه لګید له چه په دلبرخان
ګذار چا او کړ و. په دومره لوئے میدان، خوشحالی، تماشه، خندا، پرتا، دَ ډ ن پرو تهکا
څه چُپه چُپیا شوه. ګو یا خو شحالی او ماتم دواړه سره غاړه غټئ شول. د دلبرخان په
عجیبه انقلاب را غلو. بل مشعلونه بیا مړه شول، ساز ئے بند ئے شوے او هر خوا ته

ان یو عجیبه حال طاری شو۔
مشران راغونډ شول، جرګه کیناسته، د دلبرخان په وینو لړلې په کټ کښې واچولې شو، ولې
...ه وی ور شیرخان په دې ځائې کښې موجود نه وُو۔ یو څو کسان شیرخان پسې اخوا د یخوا
...ځولې شول۔ خو د هغه هیڅ پته او نه لګیده۔ خلق نور هم پریشان شول۔ اوډ هرچا په
...ه کښې قسم قسم خیالونه را او چتیدل شروع شول۔
هم دغه ساعت د لرې نه د اس د پښو ټکار واوریدې شو۔ اس هم د جرګې پله راروان وو
...لو خلقو توجه هم دغه طرف ته شوه۔ اس هم په دغه ځائې هیسار شو۔ د سپور مخ ونړا
...ړه وه بیا هم د دا تلونکی بیلتون ګران وُو۔
"څوک یې هلکه؟" د جرګې یو مشر دراتلونکی نه په اوچت آواز تپوس اوکړو۔
"زه یم رستم خان۔" راتلونکی هم په اوچت آواز جواب ورکړو۔ دا د دلبرخان و نا داداو
...ور مزدُور رستم خان وُو۔ هغه یواځې نه وُو، بلکه یو بې حرکته او بې هوشه بنیادم هم ئې
...په شاکړې وُو۔ رستم خان په ژرا سره اووې "رونړو! نن ځمونږ د سردارانو کور وران شو،
...یاردلبرخان کټ ته راوړاندې شو۔ او هغه دویم کس چه ئې په شا اوړې وُو۔ هم د دلبرخان
...کټ کښې واچولو۔ خلق حیران و پریشان پاتې شول۔ هرچا کوتې په خُله کښې اونیولې۔ دا د
شیرخان" لاش وُو۔ د دلبرخان مشر ورور شیرخان۔ چه په چړو او په خنجرو غارغار شوې وُو
...په وینو لړلې خاموش پروت وُو۔
"دا څه قیصه ده رستم خانه!؟" د جرګې یو بل مشر په حیرانتیا سره د رستم خان نه تپوس
اوکړو۔ او رستم خان په سلګو جواب ورکړو۔ "دا د قدرت د بې نیازئ یوه عجیبه توقع ده رونړو!"
...بیا رستم خان ټوله قیصه په دې شان تیره کړه۔
چه څه وخت ځما د کوهتې نائیک د دلبرخان په تماشه کښې په خنجر اولګیدو هم هغه ساعت
...ه او شیرخان نائیک دواړه د کور نه را و تلو خلق په غوبل سر وو۔ غوغا شوه، او قاتل تړ
...او تلو، او د جرګې نه ئې بهر ته منډه کړه۔ ولې د شیرخان نائیک نظر پرې پریوتلو۔ او
...پسې وې په منډه شو۔ شیرخان نائیک م خالی لاس وُو۔ نه وې سره چاړه وه او نه خنجر
...چه دا واقعه اولیده له۔ نو واپس م خپل کور ته منډه کړه۔ خپله چاړه م را واغستله۔ اس
...د غوجیل نه راوباسلو۔ او دُوئ دواړو م تعاقب اوکړو۔ د هیبت نه م هیڅو بل چاته غږ

او نه کړو. خو افسوس! چه څه هلته وراوړی سیدم نو هغه ظالم تاتل خپل کار کړے وُو. ځ
نا ئیک شیرخان په وینوکښې لتاړ پروت وُو. مانا په شا کړو نو بیا هم ورکښې لږه ډیره ساه و
خو چه په آس را سوړ شوم. نو دَ شیرخان ګیډه کوزه زوړند ه شوله. څه پوهه شوم چه دغه
ئې آخری سلګئ وه. رُستم خان چه نوروخلقو ته اوکتل نو هغوی پټ پټ ژړل. او بیا هم په
دغه بله ورځ دواړه رو نړه د تورو خاورو لاندے شول.

دَ دلبرخان او شیرخان دَ مرګونو نه پس چه د دیمه ورځ بیاه جرګه کیناسته. او فیصله ئې
اوکړه چه دَ شیرخان دَ بال بچ پالنه دے هم دَ هغوی دد غه بوډا او وفادار مزدور رُستم خان
په سپرد کړے شی. او بیا ګڼو مشرانو په دے فیصله آمنه اوکړه. رُستم خان هم د دغه دواړ
ماشومانو پالنه دخپل بال بچ نه هم په ښه شان سره اوکړه. ولے قسمت ته به نور څه منظور
وُو. پنځه کاله پس رُستم خان داسے بیمار شو چه دَ ری غیدو ئے هم و اُمید هم نه وو پاتے دَ
کل پری او شمروزخان ئے پنځه کاله خدمت کړے وُو. بیائے هم دوی ته اصل حالات نه وُ
ښیلی. خو چه پوهه شو چه بیا رغیدنه م په دنیا نشته نو دواړه ماشومان ئے دځان سره
کینول او دوی ته ئے ټوله قصه ترسره کړه. او بیائے په قلار ساه اوختله. او د ے هم دَ خپلو
ن ړد نا ئیکانو خواه له اوری سیدو.

دَ رستم خان دَ مرګ نه پس حالات بدل شو. دَ لسو کالو ماشوم شمروزخان په ن ړهٔ کښ
هم دَ بدل یو هو رېل شو. په رګ رګ کښې ئے دغیرت وینے جوش وهلو. او بیا په دے حالت
کښې دَ کورکندی لویو د ړه وی ته دَ پلار او دَ تره دَ بدل اخستو داسے تلکونه واړول چه دَ
شمروزخان په قبیله کښې او سیندل ډیر کمان شول. په دے وخت کښې دَ هغوی پروړی ش دَ
قبیلے یو بل مشر شهبازخان په خپله ذمه واخستلو. شهبازخان دد ے قبیلے یو دولت مند
او ډیر لوئے ن میندار وُو. دَ دغه دواړو یتیمانو پالنه دَ خپل بال بچ سره سمه کوله. ولے
دَ غیرت نه ډک شمروزخان چپ کیناستل برداشت نه کړل. نیمه شپه وه. په یوه کوټه کښ
هغه دَ خپلے خور سره نزدے په دو ئیم کټ کښې اوده وُو. په نورو کټونو کښې شهبازخان او دَ
هغه بال بچ او کورنور خلق هم اوده وُو. شمروزخان په قلار خپل کټ نه پاسیده او د
خپلے خور کل پری ئے یو دَ افسوس او دَ اریمان ډک نظر واچولو. او بیا ئے غلے غوندے ئے
ورلرے کړو. او دَ شپے په توره تیره کښې داسے غائب شو. چه بیا چرته دَ ورځے په سپینه ...

کښې هم ښکاره نه شو۔

څو لس کاله تیر شو خو د شمروز خان هیڅ پته هم او نه لګیده۔ چا وئې د دښمنانو په لاس ووژلو۔ چا وئې په ځنګل کښې شرمښانو اوخوړو۔ چا وئې په دریاب کښې ئې ځان ډوب کړو۔ ولې د حقیقت نه ئې هیڅوک هم خبر نه وو۔

ملک دلاور خان هم هغه شان د دغه دوه دولاشونو خواته ناست وو۔ د تبیلې کشرو مشرانو په دلاورخان خیل وس اوکړو چې هغه هغه ټول حالات بیان کړل۔ دغه حالات، حالات نه وو د حقیقت نه ډکه افسانه وه۔

د ملک دلاورخان د خپل ټبر سره بې شانه مینه وه۔ د هغه د واده پنځه کاله شوی وو ولې هغه خپل ټبر ته په دې پنځو کالو کښې هم یو ذره بد نه وو ویلې۔ بلکه د کلی ګزاره ئې پرهم نه وه کړې۔ هغه خپله ښځه نه صرف خپله ښځه ګڼله بلکه یوه فرښته ئې ګڼله۔ د هغه ښځه هم د خپل خاوند پوره وفاداره او فرض شناسه وه۔

هم په دغه ورځو کښې دا خبره مشهوره شوه چې اکثر د شپې په وخت کښې د احمدخیلو یو ډله هره ورځ د خپل ټولی سره د بهادرخیلو په تبیله ډاکې اچوی۔ او هم په یوه شپه کښې بې شمیره بهادر خیلی د مرګ خولې ته اچوی۔ په دې خبر د دغه ځوان د بهادرۍ غږ په دواړو تبیلو کښې خور شو په دغه ورځو کښې د بهادر خیلو تبیلې خلق به د نما ښام نه د خپلو کورو نه راوتل۔ د دغه ځوان په دې کارنامو د احمد خیلو لوې دو کوتې ټول د خو شحالۍ نه په جامو کښې نه ځاځیدل۔ او بیا د دلاورخان خو هم د زړه ارمان پوره شو۔ او بیا د ټولو نه زیاته خوشحاله خو د دلاورخان ښځه وه۔ چې بهادرخیلی ئې د ټولې کورنۍ دښمنان وو۔

هم په دغه شپو ورځو کښې یوه شپه د بهادرخیلو په تبیله کښې بې شانه ډزې اوشوې دومره ډزې نورکله چیرې هم نه وې شوې۔ د دغه نومور احمدخیلی د بهادرخیلو سره سخته مقابله اوکړه۔ احمدخیله ځوان بهادرۍ سره اوجنګیدو۔ ولې بهادرخیلو پرې غلبه بیاموندله۔ د احمدخیلو ټولی ماته اوخوړه۔ او د نیمو نه زیات په جګړه کښې په کورو غلو فلرغول بیا هم دغه ځوان همت بائېلو۔ خو آخر ترکومه؟ کارتوس ورسره ختم شول او هم سره د نورو ملګرو تښته اوکړه۔ څکه چې یو کس او د ټول کلی مقابله ورسره نه وه۔ دغه ځوان په سه چل خپل ځان د ملک دلاورخان تبیلې ته را اورسولو۔ ولې د جګړې خبر

د قبیلې یو ځو ځلمو ور پسې تعاقب جاري او ساتلو. او هم دغه قبیلې ته ئې او وسیدل. شپه تول په لاره ختمه شوې وه. د سحر آذانونه شوي وو. ملک دلاور خان د خپل کور نه د لمونځ په نیت بهر راوتلو. او د کور نه د لمونځ په نیت بهر را وتلو. او د کور دروازه ئې لرې پرانیستې وه. دغه ځوان هم دغه پله راغلو. د دښمنانو ور پسې را نزدې شوي وو. د هیبت نه ملک دلاور خان کور ته ننوتو. د ملک صاحب ښځه په کور کښې ځان له ناسته وه. چه دغه ځوان ئې اولیدو. نو اول خو ډیره ووېرېده. بیا ئې همت اوکړو. او د ملک صیب د کټ سرنه ئې ټوکه تماچه را واخستله او په تندۍ سره ئې د دغه ځوان نه تپوس اوکړو. "څوک یې؟ او نه څو نسې کښې نو لاړ شه." دغه ځوان خپل لاسونه په دې آواز اوچت کړل او جواب ئې ورکړو. "خورې! ځما دین په دنیا خوراک دې. ځه هم ستا د احمد خیلو قبیلې نه یم. تول شپه مې د بهادر خیلو په قبیله کښې د هغوی سره جنګ اوکړو. ډیر ستړې یم. په ډیر مصیبت مې ترې ځان را او ویستلو. او تر دې را اغلم. خدائے ته اوګوره. بهادر خیل را پسې دي. ماله پناه راکړه. ته ځما د خور په ځائے یې. او ځه دې هم د خپلې خور نه کمه نه ګڼړم."

د ملک صیب ښځې چه دا خبرې واورېدې نو ظما نچه ئې د لاس نه کوزه پریوتله. او د تهکو پاشوه. "اے ځما دین دوره! ما ستا د بهادر ئ غږ اورېدلے دے. ته ډیر بد مه ستا یو ویښته هم څوک نشي نقصان نولې. بهادر خیلو چه څومره نقصان ځمونږ د کور نی کړے دے. هغه همره نقصان ئې خدائے خبر که د بل چا کړے وي."

"نه خورې! دا مه وایه. دې ظالمانو هرچا نه زیات په مونږ ظلم کړے دے. ما خوئے بیا هم بدل واخستو. ولے په بدل څه؟ بیا مې هم وینه جوش وهي. او نن شپه مې غوارې چه د بهادر خیلو د سردارانو کورنۍ د ختمولو نه پس تول قبیله ختمه کړم. ولې په دې پوهیږم. دې ظالمانو ځما د کل په شان پلار او د کلي په شان تره دواړه په یوه شپه وژلي دي. او دغه شان دوه غټې جنازې په یوه ورځ ځمونږ د کور نه اووتلې. او ځمونږ کور ویران شو. ښځه لاله ما او ځما خور چه خدائے خبر مره به وي او که ژوندۍ. د خلقو په دې پوا ته دي. دلے ما ......" بس بس را ورکه. بس ...... خو څومره را ته اووایه چه ستا د تره سه نوم دی." د ملک صیب ښځې په تندۍ سره ترې تپوس اوکړو. او دغه ځوان ورته په جواب کښې وویل. "ځما د تره نوم شیرخان وو." او ستا د پلار نوم؟ "شیرخان." د دلاور خان ښځې ورته بیا اووې. "او ستا نوم؟ ......"

دے! "هاؤ! زما نوم شمروز دے. او بیا د دیرے مینے د ملک دلاورخان ښځه شمروزخان ته په تندۍ سره ترغاړه وته. د هغے سترګے د اوښکو ډکے شوے - او په ژړا شوه. "زه هم ستا هغه بد نصیبه خور ګل پرۍ یمه. شمروزخان لاله زه ده چه خدائے را ته ډوغ او ژوندے او خودلے." شمروزخان حیران هم وو. او خوشحال هم. ځکه چه دا هر څه په عجیبه انداز کښ اوشو. بیا هغه تر نه تپوس اوکړو. "ته دلته څه رنګ را اورسیدے ګل پرۍ؟ ګل پرۍ ورته په جواب کښ اووے دا ستا د اوښنی کور دے شمروزخان لاله." چه هم دغه ساعت د کور هغه دروازه چه شمروزخان درا تلو سره په تندۍ کښ بنده کړی وه په ډزو اوشکولے شوه په شمروزخان باندے بیا یو هیبت غوندے طاری شو. بدن ئے او رپیدلو. او په حیرانګۍ سره ئے ګل پرۍ ته اووے. "ګوره ګل پرۍ! هغه خلق جوړ ډیر اپسے دلته هم راغلل. هغوی ډیر زیات دی. او زه یو اځے یم. او بیا ستړے هم یم په ما کښ نوره حوصله نشته. ما پرته پټ کړه

"ته فکر مه کوه شمروز لاله! ته اوس په حفاظت ئے. زه دغه کوټے ته ننو زه." هغے یوے کوټے پله اشاره اوکړه. او بیا ئے اووے." هغه هم ډیر پسے دننه ډیر غلم. که دشمنانو درپسے د کوټے ورمات هم کړو. نو پرواه مه کوه. خدائے ډیر اسره ده. پښتنه ښځه یمه سرفه به پراونه کړم." او په دے خیال دوا ړه کوټے ته ننه وتل. او دی ئے په ځان پسے بند کړو. ګل پرۍ د کوټے د دڼوا په کها ؤکښ دا سے او ډیر یده لګ چه یو تربیت یا فته فوجی د جنګ په لحاظ کښ خپله مورچه سنبهالوی. د کور دروازه بد ستور ټکیدله. او چه ډیره لحظه پس هم ورلوے نه شو. نو دروازه ماته کړے شوه. وخے د دروازے نه بهر بغیر د ملک دلاورخان نه بل هیڅوک هم نه وو. ګل پرۍ چه د کوټے د ننه مورچے نه او لیدل چه ډیر ټکوټکے د هغه چل خاوند دے. نو خپله مورچه ئے پریښودله او د کوټے ورئے لرے کړو. وخے د دلاور ملک سترګے لکه د انار په رنګ سرے وے. لاسونو کښ ئے خو لوډیګلے وو. او په اوږه ئے ټوټلے وه. په لاس کښ ئے ډک توپک هو. دشک او د دهم وګمان قوت پرغلبه شو. او ګوته ئے د توپک په ګوتړۍ ابکله د زسوه ښځلے ځوان شمروزخان په مزکه اړ وځے ګزاد شو. او په سرو وینو لتار شو. د ګل پرۍ د خُلے نه یوه کریکه او وتله. او په دویم ډزسره بله ګولۍ د هغے په سینه هم ورخبجه شوله دریم ډز هم اوشو او شمروزخان با لکل بے حرکته شو. ګل پرۍ د مزکے نه سرا اوچت کړو.

"لاله.....زما سرتاجه!..... لږ..... لږ میوخوږ دے..... کیږے دے..... کاش!.....

(باقی برمنه)

صاحبزاده حبیب الرحمن صاحب قلندر مومند ایم اے (ګلدسته)

د انګریزئ سابق پروفیسر

۶۰ - ۱۹۵۹ء

د ګلاب ښکلو کېږه ګله څه!

(د ایډمنډ والرنه ترجمه)

یه د ګلاب ښکلو کېږه ګله! څه په لحنه دِ ښه ؛ زما شیرینې له زما له خوا سلام یوسه
هغه شیرینه محبوبه چه هم ئې زه خرابه کړم ؛ هم ئې خپل وخت، هغې ته دا رنګې پیغام یوسه

ورته دا اووایه چه اوس خو به پوهیږې که نه! ؛ چه په ګلاب دِ یادومه نو مطلب مې څه وی؟
ته د ګلاب غوندې نازکه ښائسته ئې لښتې! ؛ زما تشبیه کښې صداقت شیرینې وی که څه وی؟

د ځو بو میرې هغې پېغلې ته دا هم ووایه ؛ هغه چه خپل اسمانی حسن ئې پنهان ساتلې
چه که ته هم نکه د ګل دې په بیدیا نه زرغونه ؛ ستا حسن هم به بې ستائینې وې ترګو ده تیللې

چه په تیږو کښې وی ښائست هڅ قیمت نه لری ؛ زما شیرینې محبوبې لږ که جلوه وښایه
مه زړاخړ کند کړه چه دنیا دِ ارزو کاملې د کړی ؛ د ومره حیا مه کوه، دا ورته ګلاب به وایه

د ګلاب ګله! بیا دیار به غیږ کښې ورژیږه ؛ چه هغې پېغلې ته د حُسن اصلیت ښکاره شی
تا ئی ښکلی تول خوا بۀ وی یو ساعت د پاره ؛ چه ستا په مرګ کښې ورته دغه حقیقت ښکاره شی

EDMUND WALLER

۱۹۵۵-۵۶ء
راوی خان ساوُد (دوهم کال)

دَ تعلیم شوق

میدان ته راوتلے یم غلیم دَ پاره زه
کالج ته یم راغلے دَ تعلیم دَ پاره زه

شراب یم مدعا ده میخانه کښې که بهروی   په دشت یا په صحرا کښې یا په لاره رګنډروی
ښکلو سره شوقین یمه که وخت وی یا بے وخت وی   ماښام که ما سختن وی نیمه شپه که یا سحر وی

ولاړ یمه ساقی ته دَ تعظیم دَ پاره زه
کالج ته یم راغلے دَ تعلیم دَ پاره زه

دَ شوق پوره کوَ لو مدعا لرمه زړه کښې   نور هیڅ یم مطلب نه دے دا سوَ الرمه زړه کښې
که لاره خطرناک ده منزل لرے دے ډیر   ددے تیاره ماښام پورې نرصبا لرمه زړه کښې

الفت لرمه زړه کښې دَ نسیم دَ پاره زه
کالج ته یم راغلے دَ تعلیم دَ پاره زه

ستړے دَ ژړګی نه کیرچا پیره کړی طواف   دَ وخت دَ تقاضو نه څنګه کاړی واخلم خلاف
کاروان پسے روان یمه منزل ته په ساه ساه   یو درخ به را معلوم شی قسمت را ته خپل صاف

ولاړ یمه ولی طوفان عظیم دَ پاره زه
کالج ته یم راغلے دَ تعلیم دَ پاره زه

تعلیم غواړمه داسې چه خبر له کائنات شم　　آګاه دَ خدائے رسول دَ همه واړو دَ صفات شم
کتاب خلاف اصول نه دی خو مقصد مې تربیت دے　　خبر په رازو نو دَ دنیا دَ موجودات شم

درمان دَ مقصد یم شه یم پاره زه
کالج ته یم راغلے دَ تعلیم دَ پاره زه

احساس دې غوریت کښې دَ تکمیل دَ مقصد نو　　غم او خوړم غربت کښې دَ کالج دَ کتابونو
کولی مې نن څو مره په خوارئ په زړه چاودون دی　　جولئ به ډکه وړمه دَ ګلشن نه دَ ګلونو

کوشش کوم مقصد زړه سلیم دپاره زه
کالج ته یم راغلے دَ تعلیم دَ پاره زه

خُلئ لرم جذبے زړه کښې دَ علم پوهه کولو　　جوکه چه دَ کتاب شم دَ ویلو دَ لوستلو
حاصل کړم علم خپله بیائے بل ته ورکوم　　تیار یمه لمن دَ دے ساعت ته دَ نیولو

ولاړ یمه داؤد دے تسلیم دپاره زه
کالج ته یم راغلے دَ تعلیم دَ پاره زه

غربت وینم همت په لاړ کښې دے حائل شوے　　هر څوکه تصور مې میخانه ته مائل شوے
اوس ګورمه فلک به نا کړدے چه څه کوی　　داؤد چه داسے حال کښې دَ تعلیم دے سائل شوے

آسرا دَ بے وسئ یمه ندیم دَ پاره زه
کالج ته یم راغلے دَ تعلیم دَ پاره زه

٭

يو..... خواهش..... ځما

کاش چه زه وږمه وے چه هوا کښې الوتلے وے
لوړ اوچت له مځکے په فضا کښې ګرځيدلے وے

دا فضا خو پريږده ترآسمانه رسيدلے وے
هلته د قمر غوندے مے شکلے مخ ليدلے وے

دا شنه شنه باغونه شنه طوطيان به زه تول هيرووم
کاش که خپل آشنا يو ځل په غېږ کښې ځه نيولے وے

ځه خان بهادر به په غمونو ګرفتار نه ووم
دريغه که آشنا مے ځه وفا راته ښودلے وے

عبدالعزيز شاهد
(دوم کال)
۲۲-۱۹۶۱م

بهار

په رنګ رنګ ګل ګلزار دے ⁖ دا شوخي ده د بهار
هر بوټی په شين لباس کښې ⁖ هر صحرا کښې دے بهار
ګلستان ډک د ګلونو ⁖ هر بلبل دے په چغار
هر شاهين دے په مستۍ کښې ⁖ راکوزيږي له کوهسار
ترانې پټې پرتې دي ⁖ هر آواز کښې د آبشار
د لالا په زړه کښې داغ دے ⁖ دے هم څانګې له خمار
که دنيا ب غارې ته لاړ شي ⁖ تصور کوه د يار
د خزان نوم راته مه اخله ⁖ کوے نشم انتظار
دا څو ورځې د بهار دي ⁖ چه زه او کړمه ديدار
يو ليلی وه بله نشته ⁖ نه مجنون غوندې سرشار
لے بهاره لږ استون شه ⁖ کائنات دے تار په تار

عزيز کند کچکول په لاس کښې
ناست په لاره د دربار

محمد جاوید دویم کال

لوبې او لوبغاړے

کال ۱۹۶۰ کښې د روم د اولمپک (OLYMPIC) ریکارډونه

منډې

سل میټره - آرمین هری (ARMIN HARY) (جرمن) ۱۰ سیکنډه (عالمی ریکارډ)

۲۰۰ میټره - لیویو بیروتي (LIVIO BERRUTI) (اټلی) ۲۰،۵ سیکنډه -

۴۰۰ میټره - اوټس ډیوس (OTIS DAVIS) (امریکه) ۴۴،۹ سیکنډه -

۸۰۰ میټره - پیټر سنیل (PETER SNELL) (نیوزی لینډ) یو منټ او ۴۶،۳ سیکنډه -

۱۵۰۰ میټره - هرب ایلیټ (HERB ELIOT) (اسټریلیا) ۳ منټ او ۳۵،۶ سیکنډه -

۵۰۰۰ میټره - مری هالبرګ (MURREY HALBERG) (نیوزی لینډ) ۱۳ منټه او ۴۳،۴ "

لس زره میټره - پیوټر (PYOTR) (سویټ یونین) ۲۸ منټ او ۳۲،۲ سیکنډه -

۱۱۰ هرډل - لی کیبان (LEE CABAUN) (امریکه) ۱۳،۸ سیکنډه -

۴۰۰ هرډل - ګلن ډیوس (GLEN DAVIS) (امریکه) ۴۹،۳ سیکنډه -

لوړ ټوپ (هائی جمپ) رابرټ (ROBERT) (سویټ یونین) ۷ فټ - ۱ انچ -

اوږد ټوپ (لانګ جمپ) رالف بوسټن (RALPH BOSTAN) (امریکه) ۲۶ - ۷¾" (اولمپک)

۲۶ - ۱۱¼" (عالمی)

هاپ سټپ (په جوختو ټوپ) (HOP-STEP & JUMP) جوزف (JOZEF) (پولینډ) ۵۵ - ۱.½

پول والټ ډون (POLE VAULT .... DON) (امریکه) ۱۵ - ۹½ (عالمی)

۱۵ - ۵½ (اولمپک)

جیولین تهرو (نیزه اندازي) (JAVELIN THROW) ولیم (WILLIAM) (امریکه) ۲۸۳ - ۸ (عالمی)

وکټر (VIKTOR) (سویټ یونین) ۲۷۷ - ۸½ (اولمپک)

شاټ پټ (ګوله) (SHOT-PUT) ولیم (WILLIAM) (امریکه) ۶۵ - ۱۰ (عالمی)

۶۴ - ۶¾ (اولمپک)

هیمر - هیرالډ (HARRALD) (امریکه) ۲۳۰ - ۹ (عالمی)

۲۲۰ - ۱½ (اولمپک)

دسکس (DISCUS) الورټر (AL OERTER) ۱۹۴ فټ - ۱ ۳/۴ ۱ انچ -

شناوري - امریکه ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ټولسو زري تمغوګټنې یولس -

جمناسټک ‏ ‏ سوویټ یونین -

باسکټ بال ‏ ‏ امریکه -

فټ بال ‏ ‏ یوګوسلاویه -

هاکي ‏ ‏ پاکستان -

د اولمپک تمغې

ملک	د سرو زرو تمغې	د سپینو زرو تمغې	د ژېړو تمغې
سوویټ یونین	۴۳	۲۹	۳۱
امریکه	۳۴	۲۹	۱۶
اټلي	۱۳	۱۰	۱۳
جرمني	۱۲	۱۹	۱۱
اسټریلیا	۸	۸	۶
ترکیه	۷	۲	۰
هنګري	۶	۸	۷
جاپان	۴	۷	۷
پولېنډ	۴	۶	۱۱

آیا تاسو ته معلومه ده...؟

پښتو ژبه:- پښتو ژبه د دنیا د ټولو زړو ژبو یوه ژبه ده. چنانچه د اریانو د ټولو نه زوړه مذهبي کتاب وید کښې چه تقریباً درې نیم زره کاله اګاهو لیکلې شوید دې د پکښت د پښتون په معنې ذکر راغلې دې. همدغه رنګ هم په اوستا کښې لفظ بخذ موجود دې. همدغه رنګ پخوانو تاریخ دانانو د دې قوم او ژبې ډېر معمولي ردوبدل نه سوا تقریباً هم یو لیکلې دې. د کوم نه چه د دې د ریښې پته لږي جدید وخیړنو چې چرته د پښتو اصل او ریښه ثابته کړې ده. نو داخیره ئې هم ثبوت ته رسولې ده. چه دا ژبه د عبراني یا د بلې یوې ژبې د ریښې نه نده. ولې د اریائي ژبې د ریښې نه ده

مستر داورتي مشهور مستشرق او د پښتو ژبې کالم لیکي: چه "پښتو ژبه سنکرت او ژند سره ډېر نزدیکت لري همدغه رنګ سر الفرجي اې کوریګن د پښتو ژبې په قله د خیړنې نه پسته لیکي." دو ډېره روښه بخلقو ددې ژبې عبراني سره تړون څرګند ولو. ولې اوس ثابته شوه چه دا خالصه اریائي ژبه ده."

اهرام مصر:- (PYRAMIDS) دا د دنیا د ټولو نه په زړه تعمیراتو کښې شمېرلې شي. دا تقریباً د درې زره او پنځه سوه ق.م (۳۵۰۰) نه تر اتلس سوه ق.م (۱۸۰۰) په منځ کښې جوړ شو. په کوم کښې چه د هر د لوړو لویو خلقو مقبرې دي. دا ټول د مصري نيل بحض نزدې واقع دي. د کوم محل وقوع چه د غزه نه شپېته میله جنوب ته ده. د دې د هغې وخت نه تر دې وخته پورې د مصري تعمیري فن اندازه په ښه شان لګېدلې شي.

ابوالهول:- (SPHINX) دا مجسمه تقریباً درې زره قبل مسیح کښې په غزه علاقه کښې د یو لوئې غره د تراشلو نه پس جوړه شوې ده. دا ۱۸۹ فټه اوږده او ۶۵ فټه اوچته ده. د دې پنجې او تنه د شیر په رنګ ده او سر ئې د انسان په رنګ. د زمانې د دور په وجه د دې شکل ډېر خوفناک شو. هم په دې وجه عرب د دې ته ابوالهول یعنې د خوف پلار وائي.

هوائي جهاز (الوتکه):- د ټولو نه اګاهو مانټ ګولفیر برادران په هوا کښې د الوتلو خیال پوره کولو کوشش کړې دی. هغه یوه غباره د لوړې نه ټکه الوزولې وه. دا غباره د یو نیم میل د پورته الوتو نه پس په ځمکه دا کوزه شوه. د دې نه پس په غباره کښې د هائیډروجن استعمال شروع شو. لیکن د دې کلیس نه

al MAJOR. H.G. RAVERTY   (G.A GRIERSON)

دَ هودَ لوړیدلو خطره وه۔

څه موده پس دَ جرمنی کاؤنټ زیپلن یو ډیر اعلیٰ قسم تسکین ده هوائی جهاز تیار کړو ــــ امریکنیانو یو داسے گیس معلوم کړو چه دَ سپک والی سره سره دے ته هوړ نه لږیدلے دا هیلیم گیس وو۔ چه دَ زیات قیمت په سبب استعمال نه کړے شو۔

دَ تولو نه وړومبے کوم کس چه هوائی جهاز ته دَ الوزولو دَ پاره دَ انجن لگولو کوشش کړے دَ هغه ایس۔ پی لینگلے وو۔ لیکن دَ هغه دَ مرگ په سبب دا کار پایهٔ تکمیل ته اونه رسید۔ دا نیمگړے کار دا نټ برادرانو پوره کړو۔ دَ اولسم دسمبر ۱۹۰۳ء په صبا هغوی څلور ځل هوائی جهاز والوزولو۔ دَ ده دَ ټولو نه اوچت پرواز ۸۵۲ فټ وَو۔ ستمبر ۱۹۰۸ء کښې دا نټ برادران صحیح طریقے باندے کامیابی حاصله کړه۔ او هغوی په اتلسو ملتونو کښې دولس میله پرواز بغیر دَ څه حادثے نه اوکړو۔ او په ذمکه دا کوز شو۔

نوبل پرائیز:۔ NOBEL PRIZE دَ نوبل پرائیز بانی کونکے (۱۸۹۶ء ـ ۱۸۳۳ء) دَ سویډن یو جلیل القدر کیمیادان او انجنیر وَو۔ چه کوم ته دَ بارود او دَ ډائنامیټ دَ ایجاد له برکته ډیر دولت او ناموری حاصله شوه۔ او په یوځو کلونو کښې کروډپتی شو۔ ده دَ خپل دولت زیاته برخه دَ اولس دَ برخ تګ او دَ ترقی دَ پاره اوټاکله۔ دَ ده دَ دولت له منافع نه زیاته برخه بغیر دَ نسل او دَ ملت له فرق نه دَ هغو عالمانو ادیبانو او مصلحینو ته دَ زیات قیمت انعامونه ورکولے شی۔ چه دَ خپل علمی او ادبی تصنیفونو یا کارنامے د تول کال په موده کښې اعلیٰ اوگرزولے شی دوهمی درے انعامونه (۱) طبیعات (فزکس) (۲) کیمیا (کیمسټری) (۳) دَ طب په علم کښې ډیر ښه او ډیر اعلیٰ خیزونے په حقله ورکولے شی۔ څلورم انعام عموماً ادبی تصنیف دَ پاره مخصوص دے او پنځم انعام هغه کس یا ډلے ته ورکړے کیږی۔ چه کوم عالمگیر رورولئ او دَ امن په حقله ښه خدمت سر کړی۔ دَ انعامونو فیصله دَ سویډن او دَ ناروے دَ فاضلانو یو ټیپے ته سپارلے شوے ده۔ دے انعامونو ته نوبل پرائیز وائی۔

نهرسویز:۔ په ۱۸۶۹ء کښې فرانسیسی انجنیر فرډی ننډ دی لیپس (Ferdi nand De Lesseps) جوړ کړو۔ دا ۱۰۱ میله دے۔ دا نهر بحیرهٔ روم او بحیرهٔ اسود پهلو کښې یو ځلئے کوی۔

روټری کلب:۔ د ټولو نه اول روټری کلب په ۱۹۰۵ء کښې په امریکه کښې قائم شو۔ په ۱۹۱۱ء کښې داسے کلب په انگلستان کښې قائم شو۔ ROTARY CLUB په دے وخت کښې په دنیا کښې په اتلسو ملکونو کښې داسے کلبونه قائم دی۔ چونکه په شروع کښې دَ کلب د ممبرانو اجلاس به په لړ پسے (By Rotation) دَ یو بل په کور کښې کیدلو دَ دے دَ پاره دا کلب هم په دے نوم اونومیدلو۔

دیوارِ چین :- تقریباً دوه سوه کاله قبل مسیح کښې دَ چین بادشاه مسمیٰ هیوانګ تي خپل ملک دَ دښمنانو
نه دَ بچ کولو دَ پاره دَ دې په تعمیر لاس پورې کړو. ددې دیوال لوئې والې (لمبائی)
تقریباً پنځلس میله دې. او دا دَ شلو نه واخلې تر دیرشو فټو پورې اوچت دې. دَ دې پلنوالې (چوړائی)
لاندې نه پنځویشت فټه او دَ پاس نه دولس فټه دې. دا دیوال دَ خلیج لیاوټنګ نه واخلې تر منګولیا او دَ
تبت تر سرحده پورې خور شوې دې.

بګ بېن (BIG BEN) :- دَ هغې ګهړۍ نوم دې چه په ۱۸۵۶ کښې دَ انګلستان دَ پارلیمنټ په ګمنټه ګهر کښې اولګولې شوه. دَ
لندن خلق عموماً هم دَ دې نه دَ خپلو ګهړو وختونه درست کوی. دا تول شپه دوباره ساتلې شي.

دلوستو مشین :- په امریکه کښې یو نوې دَ بجلۍ مشین جوړ کړې شوې دې. چه په لفافو ټاپ شده ټپې لولي
او بیا هم دغه ښاردونه او دیاستونه په ترتیب سره ایږدی. لا پورې دا مشین تجرباتی
مراحل سر کوی. ولې په یو ډاکخانه کښې دَ دې ازمائښ شوې دې. دا مشین دَ ټپې اخیری کرښه یعنی دَ ښار او
ریاست نوم په یو لحظه کښې لوستې شي. ددې نه علاوه دا مشین دَ یو خاص آلې په مرسته مختلف قسمه ټاپ
لولي. لا دا مشین دَ لاس لیکلې شوې ټپې نشي لوستې. ولې یقین دې چه څه وخت دا مشین کافی ترقي اوکړی
نو دا به دَ دې قسمه دَ پتو هم یو لوئې تعداد لوستې شي.

بقیه :- علم

دَ علم متعلق دا هم ویلې شوې دی چه:-

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَ لَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ

(ترجمه) علم حاصل کړئ. اګر چه په چین کښې وی.

مګر دا هم په آخر کښې یاد ساتل بکار دی. چه علم هغه علم ته ویلې شي
چه ته ئې حاصل کړې. او بیا خلقو ته هم فائدې ورکړې. یعنی په خپل علم عمل اوکړې
ولې چه دَ بې عمله علم مثال داسې دې. لکه چه "ډوډۍ په لاس کښې وی" چه خپله خو ترې
نه هیڅ فائده نه شي حاصلولې. لیکن خلق ترې فائده حاصلوی.

امین الرحمٰن دوئیم کال

معلومات

دَ ټولو نه لویه دَ غرهٔ څوکه :- ماونټ ایوریسټ (MOUNT EVEREST)

دَ ټولو نه لوئے بِراعظم :- ایشیا۔

دَ ټولو نه لویه غرېزه سلسله :- همالیه۔

دَ ټولو نه لوئے سمندر :- بحرالکاهل۔

دَ ټولو نه لوئے دریاب (LONGEST) میسِس پي (MISSISSIPPI)

دَ ټولو نه لوئے جهیل :- بحیره کیسپین۔

دَ ټولو نه لویه جزیره :- ګرین لینډ۔

دَ ټولو نه زیاتی باراني علاقه :- چراپونجي۔

دَ ټولو نه زیات تود ځائے :- دَموت وادي (کیلیفورنیا) (DEATH VALLEY)

دَ ټولو نه لوئے پارک :- یلوسټون نیشنل پارک (امریکه)

دَ ټولو نه دَ ګڼړے آبادئ علاقه :- جاوا۔

دَ ټولو نه لویه صحرا :- صحرائے اعظم (افریقه)

دَ ټولو نه لوئے عمارات :- ایمپائر سټیټ بلډنګ (نیویارک) (EMPIRE STATE BUILDING)

دَ ټولو نه لویه عجائب خانه :- برټش میوزیم۔

دَ ټولو نه لوئے ښهر :- لندن۔

دَ ټولو نه لوئے دیوال :- دَچین دیوال۔

دَ ټولو نه اوږد څناور :- زرافه۔

دَ ټولو نه لوئے مارغه :- شترمرغ۔

دَ ټولو نه لویه ورځ :- ۲۲ جون۔

ایجادونه

ایجاد	موجد	سن
بړاسی انجن	جیمز واټ (JAMES WATT)	۱۷۶۵ء
بړاسی ماکو	فلټن (FULTON)	۱۸۰۷ء
د ریل انجن	سټی فن سن (STEPH ENSON)	۱۸۲۹ء
د جامو گنډلو مشین	هو (HOWE)	۱۸۴۶ء
د څرخ تمانچه	کولټ (COLT)	۱۸۳۵ء
تلغراف (تار)	مورس (MORSE)	۱۸۳۷ء
ټیلیفون	گراهم بیل (GRAHAN BELL)	۱۸۷۶ء
ټیلی ویژن	بائرډ (BAIRD)	۱۹۲۵ء
ټائپ رائټر	شولز (SHOLES)	۱۸۶۸ء
د ننکو خالونه	ډاکټر جینر (DR. JENNER)	۱۷۹۶ء
ایټم بم	د امریکې او برطانیې سائنسدانانو۔	۱۹۴۵ء
د بجلۍ بلب	ایډیسن (EDISON)	۱۸۷۱ء
ډائنامیټ	نوبیل (NOBEL)	۱۸۶۶ء
فاونټین پن	واټر مین (WATER MAN)	۱۸۸۴ء
اکسیجن	پریسټلې (PRIESTLEY)	۱۷۷۴ء
ریډیم	مادام کیوری (MADAN CURIE)	۱۸۹۶ء
هوائي جهاز	رائټ برادران (WRIGHT BROTHERS)	۱۹۰۳ء

لطیفې

(۱) دَ سرحد یو گورنر د ملاکنډ د بجلۍ پاور هاوس کتلو له تلے وو. هلته ورته دَ هغه ځائے انجنیرانو دَ پاور هاوس مختلف حصے وښوډلے. اؤ ورته ئے اوویل. چه ملاکنډ کښ دکومو اوبو نه بجلی اوباسیلے شی. نو بیا دغه اوبه دَ مړدان ضلع ته دغښناک او او به خور دَ پاره ورکیدے شی. گورنر صاحب تندے تریو کړو. "دابه دیانتی څه نشم برداشت کولے. چه دَکومو اوبو نه بجلی اوځی نو بیا هغه په خوارانو کلی وا نو خرڅوئی. دا او به دهغوی څه پکار؟ انجنیرانو یو بل ته اوکتل.

---

(۲) دَ ډیرے زمانے یو دوه پښتانه مشران چرته دَ اټک نه پورے لاړل. په لاره تلے خو منزلِ مقصود تر هیر شو. مخے له وړاندے یو بوډا پنجابے ورغلو. دے یو تر ینه پښتنه وکړه." چه باباد الادچرته ځی" بوډا کاکاله پښتونه ورته په اشاره ورته اوئیل چه څه پوهه نشوم. د دے پښتون خپل ملگری ته مخ داواړولو "دالا بله :- عجب خانه! دَکور خونے ته ورسیدو او لا پښتونه ورځی.

---

(۳) دوه بانډیچیان دَ ښهر سیل ته راغلی وو. په دیو کښے یو چرے دوجے ښهر ته نه وو راغلے چه دَ کابلۍ درواز ے کښ سرکاے یو سړے دَ مشک سره په " تنها سبیل، تنها سبیل "چغو وهلو ولیدو. نو خپل ملگری ته ئے وویل " اشنا دا شے خو راله واخله ". اشنایئ دغه سړی له یوه آنه ورکړه او هغه ورته جام ډک کړو. دا چه جام وڅښلو. نو مشکی بل جام دغه بل ملگری ته ډک کړو. چه هغه وڅښلو نو ملگری ته ئے مخ داواړولو. "هئ چالاکه! سبیل دِ په خپله وڅښلو او ماته دے تشے او به پریښودے".

---

(۴) یو دوه کسان دَ یو لیډر تقریر اوریدو ته ولاړ وو. لیډر چه په انگریزئ کښے شروع وکړه. نو دیو دے بل ته اووے راځه چه ځو داخو په بله ژبه کښے کنځریږی. په دے کښے لیډر او توخل. دے بل ورته اووے چه لږ صبر ئے کړه نن ئے په پښتو کښے اوکړو. چرے پښتو شروع کړی.

امیر سیاب د تانی
ردویم کال ۶۰-۱۹۵۹ء

یکه زار!

ځما جانان گل دَ گلاب دے — ښه ئے شباب دے تماشه ئے خلق کوینه
ځما جانان گل دَ نرگس دے — چاته په ترس دے، ماته نیغ کاته کوینه
ځما جانان گل دَ رامبیل دے — زړهٔ م غلبیل دے، دخولے وینے تویه وومه
ځما جانان گل دَ ارهر دے — دَ ملک بهر دے، زهٔ ئے دلته یادَ وُومه
دَ یارِم دے څیزهٔ مزه کړی — جمال دَ مخ دَ سروِ قد زلفے ولونه
زلفے په مخ دِ داسے ښکاری — لکه عنبر کافور په یوځلے پراته وینه
زلفے په مخ دِ داسے ښکاری — لکه ښامار چه دَ چندن وُنه کښی وینه
زلفے دِ یوبل نه شرمیږی — ځکه جدا دِ په اوګو وَهی تاولونه
دَ جیلخانے بندی به خلاص شی — دَ تور و زلفو بندی تل تر تله وینه
زانګو دَ زلفو کښی ځه پروت یم — د یار خندا م الله هو مزه کوینه
تیاره دَ زلفو کښی د ورک شوم — اوس به مشال دَ مخ دِ کوم ځلے اتومه
یارم جانان زلفے خورے کړے — یا نور دَ تور و غرو لوځان پناه کوینه
زلفے په مخ دِ داسے ښکاری — لکه وریځ چه په سپوږمۍ راغلی وینه
رنګ د دَ زلفو کښی وینم — ځکه ګلونه دَ لاله جیب کښی ساتمه

محمد یار خان خلو م کال

ښکلې خبرې

۱ ـ انسان اکثر د خپلې ژبې له کبله گناه کوي ـ (د رسول کریم صلعم)

۲ ـ ستاخوا خوږے دوست هغه سړے دے چه ستا عیبونه او نقصونه تاته ښکاره کوي (حضرت عمرؓ)

۳ ـ د طالب علم فرض دا دے چه د علم حاصلولو په لاره کښې سختۍ تیروي. او حاصل کړے علم کافي نه گڼي (حضرت علیؓ)

۴ ـ د توپونو ډېرو میني او تر ټولو لویه فتح چه سړے حاصلوي. نو هغه خپل ځان فتح کول دي. دخپل ځان نه شکست تر ټولو خراب او شرمناک شکست دے ـ (افلاطون)

۵ ـ د قضا پښې ډیرے نازکے دي ځکه چه قضا خپلے پښے په مزکه نه ږدي په سرو په سرونو ږدي ـ (هومر)

۶ ـ کار ژوندو سړو ښائي او بیکاري مړو سړو ـ (د عربي مثل)

۷ ـ نیستي یو داسې راز دے چه نیمه دنیا ئې نیمې دنیا نه پټه کړې ده ـ (ایډم سمتھ)

۸ ـ زه د ژوند هغه لحظې ښې گڼړم چه په کتاب لوستلو کښې تیرے شي ـ (لارډ میکالے)

۹ ـ موږ هغه کاروونه زیات کوو چه د ښځوا راسره ئې خلق ستائي ـ (ایمرسن)

۱۰ ـ د ښه کتاب مړه خپه کول هم داسې دي لکه د انسان مړه خپه کول ـ (کارلائل)

۱۱ ـ د ژوند بالداران شي. د ژوند مړئي کیږي مه ـ (نیټشے)

۱۲ ـ د خوارۍ نه بغیر انسان هیچرې شان او شوکت نه شي حاصلولے ـ (قائداعظم)

۱۳ ـ ... بل تکلیف لرے کولو باندې د سړي خپل تکلیف لرے کیږي ـ (ټالسټائي)

۱۴ ـ سړے چه څه کولے شي هغه یخپله کوي او چه څه نه شي کولے د هغې د پاره نورو ته تلقین کوي ـ (د برنارډ شا)

۱۵ ـ د تیرے هغے نه راتلونکے یوه ورځ ډیره قیمتي وي ـ

۱۶ ـ چه د چا ضمیر مجرم وي هغه ته د بل مدعي ضرورت نشته ـ

۱۷ ـ هغه سړے نیستمن نه دے چه ورسره کم وي ـ نیستمن هغه وي چه د ډیرو هوس لري ـ

۱۸ ـ تسل په کوشش کښې پټه ده په تحصیل کښې نه ـ مکمل کوشش مکمله فتح ده ـ

۱۹ ـ چه څوک ښه کوي هغه د چپ وي چه چا سره ښه اوشي هغه دې وینا کوي ـ

محسن فاروق دوئیم کال

مرغلرے

(رحمان بابا)

عاقلان په وړاندې په وروستو ګوري ؛ په دُنيا کښې کار انجام دَ آخرت کړه
سم دِ لاسه کار د هر ګوره ډېر مشکل وي ؛ څو لا نۀ ئې غريب نۀ يې پرمه دَ غربت کړه
چه نور خلق ملامت در باندې وائي، ؛ لا پخوا تر خلقو خپل ځان ملامت کړه
که لښکر دَ حرص هوا در باندې نۀ ورشي ؛ سر د ننه په قلا دَ قناعت کړه
دا به نۀ شي چه ستا سته او دَ حق لڅ دي ؛ که دَ حق غواړې ته هم لڅ په حقيقت کړه
اے رحمٰنَ اول تهٔ نصيحت واخله
دَ غه پسته بيا و بل ته نصيحت کړه

(حمید بابا ماشوخیل)

چه په تورو سترګو تور رانجه شي پورې ؛ له يوې تورې بلا پاسې سل نورې
تورې زلفې تورې سترګې تورې ورېځې ؛ دا همه تورې بلا دي آدم خورې
يوې بلا څوک ځان ساتلې نشي ؛ ما ته تورې سل بلا شوې راپورې
نه دَ مړو په حساب نه دَ ژوندو يم ؛ عاشق کړم تر دا ميانه پورې دورې
اوس ځما له نام و ننګه سره څۀ دي ؛ ولې وېرګه و يرتۀ رسې په سر تورې
که ته ځان ته افلاطون وائې ناصحه ؛ ما ته عين ليونې دَ مجنون دورې
اوس به کفر ته دَ تور دونۀ لعنو او ځم ؛ ګنړه مکړه ته دَ پند خبرې نورې
کوم يؤ بُت دِ ناست په زړۀ کښې دے حميدَ
چه مدام په پرستش درته نسکور دے

خلیل الرحمٰن عاجز
(دوئیم کال ۱۹۵۸-۵۰ع)

رباعي

دا اشنا مې مخ څرګند کړو له نقابه
که سپوږمۍ وه رابنکاره شوه له سحابه
دَ مشرق نه ترمغرِبه څه لټون کړې
ورشئ وګړئ دا پښتنه له افتابه

که ستا ظلم بې پناه او بې پایان دے
زما صبر دے بې حد ه بې حسابه
شیخه اوس به دِ دَزهد زور ته ګورم
هغه تُرکه رابنکاره شوه بې حجابه

دَ نرګس غونډِ چه ځان ته ملتفت یُ
سوسن ژبې شوم اشنا له دغه بابه
زهٔ عاجز د یار په غم خراب تراب شوم
جګې جګې قبله ګاهٔ بو تُرابهٔ!

2. The second feature is the rule of law. Every game is governed by a set of rules. Those participating in them learn to play within the framework of these rules. Boys and youngmen acquire readily the ethical code of sport and games and it becomes easier for them later in life, as citizen to live within the legal framework of a state. Thus sports serve as a training ground in social and moral obligation. The game may be on the field, it may be in the factory, it may be in the office. It has one characteristic namely, justice and fairplay. Those who observe these rules of play, on the field make them a rule of life. It becomes an instinct.

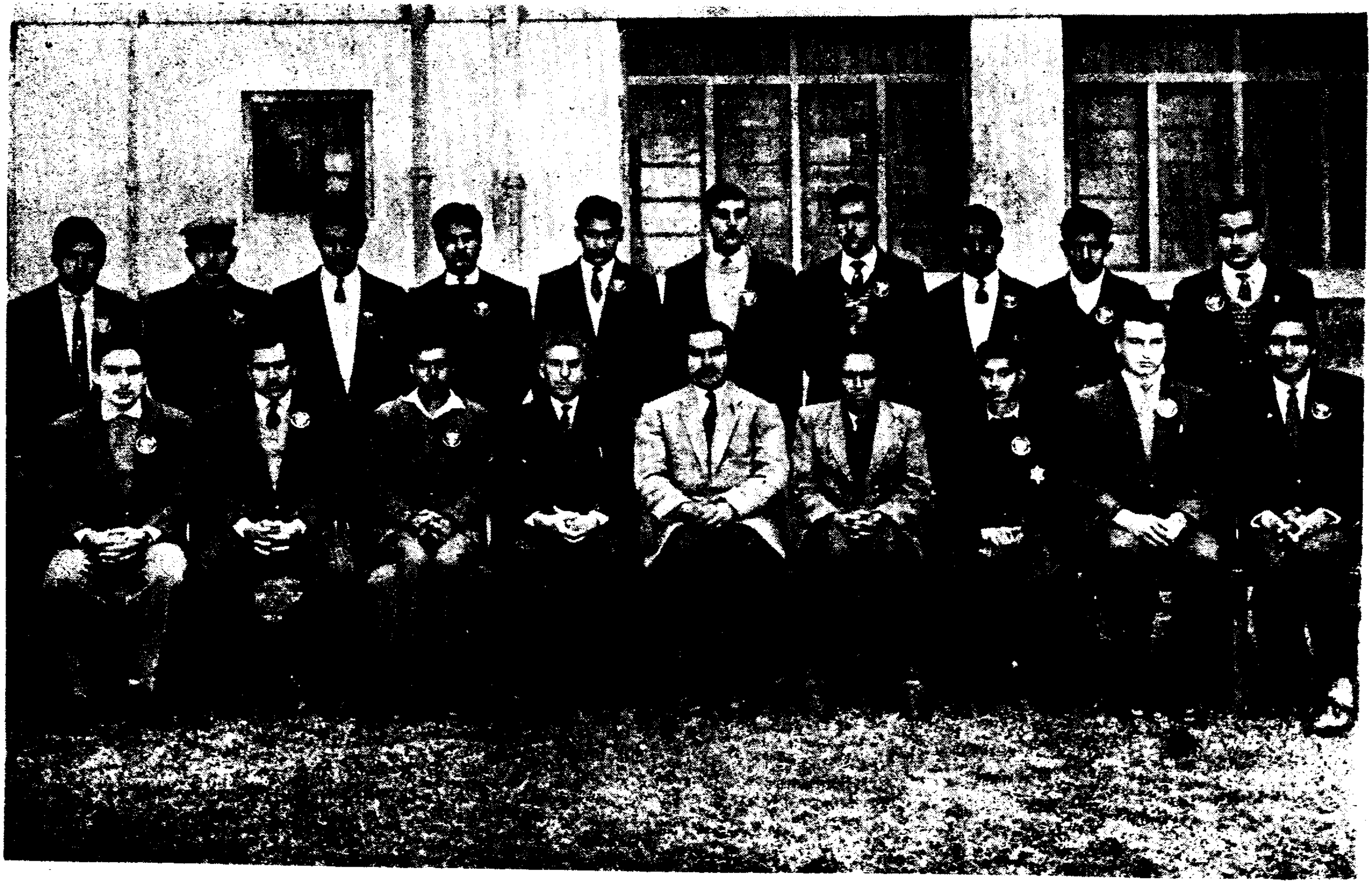
3. Sports teach us to play under an acknowledged leader. He is chosen as the best man available to lay down a policy and see to its execution. Once appointed, all must obey him. No nonsense is entertained, in other words, an elective authority is established. Thus sports provide a training ground in discipline, obedience and intelligent co-operation in execution of the tactics of the leader.

4. Now we come to a fourth feature; that is discipline. Sport is firstly a fight within one's own self. It involves rigid training, abstinence from distraction, obedience (but an intelligent one) to a leader and following a set programme given by him. It therefore leads to the inner discipline and promotes team interest, communal interest and develops in the youth the habit of sympathy and mutual understanding. Secondly, it is a fight against others. It brings the youth in the competitive world. This competition is governed by a set of rules. The ethical code of sport makes us say even when defeated "Congratulations, well-played" This competitive spirit leads to self-improvement. We learn to acquire better skills than the next man. It prepares the youth to apply this spirit of better skill in the field of education where he must acquire himself with better knowledge than the other person.

5. Lastely, it is good that in a world divided by ideological distances and political distresses men and women come together in sport. Sport represents an important non-lingual means of contact between people of different races and creeds. Occasional incidents in international matters can be magnified, but inspite of this the closing ceremony of an Olympiad spiritually impressive.

At the end I will mention that sports give us good health which is a blessing and a pleasurable experience. It is also essential for creative work. Students who have been described by a famous person as "Masters of the nation" when unable to recreate themselves through sports and athletics turn to expensive, uncreative forms of entertainments such as cinemas, restaurants, gossip and aimless walks on "The Mall". The educational circles should realize the value of play and play grounds to keep the students away from the devil's workshop.

Proctorial Board Govt. College Peshawar. 1962 — 63



Chairs :— L to R. Mukhtarullah Jan B.A. I, Ataullah Durrani B.A. I, Khan Bahadur Khattak B.A. II, Prof. O.R. Afghani (Asstt: Director), Prof. M. Ismail Sethi (Principal), Prof. Nasrullah Khan (Chief Proctor), Mohammad Akif B.Sc. II, A. Latif Afridi B.A. I, Suleman Bangash B.Sc. I

Standing:— Mohammad Hassan F.A. I Yr., Mukhtar Ahmad F.A. I Yr., Javed Mohammad F.A. I Yr., Munirul Hassan F.A. II Yr., Nisar Ahmad F.A. II Yr., Zahiruddin F.A. II Yr. Azizur Rashid F.Sc. II Yr., Mohd. Javed B.A. I, Qirat Zaman F.A. II Yr., M. Sharif Khan B.A. I

The Role of Sports in the Development of Youth

Mr. Mohammad Ataullah B.A., D.P.E;

The primitive man was compelled to perfect his techniques as hunter and fighter in order to carry out with utmost efficiency his main professional tasks. These techniques involved running, striking, throwing, leaping, catching and the like, which nowadays constitute the core of athletics and other sport. The technique of these skills ensure greater sucess in life. After ages of immeasurable duration this hereditary process gradually bred a positive eagerness to put body and muscles in play. The taste for physical exercise developed in time into an instinct. This became deeply ingrained in man.

The same is the case with a child. The child wants to run, to jump, to strike, to throw, to climb as sports which are the means for the expression and satisfaction of these instinctive tendencies and in the process develop the coordination of the mind and body and also give emotional training to ensure social adjustment of the child.

On the other hand, organs of his body are in the sound condition and discharge their function properly and efficiently. His brain commands perfect control over the nervous system. His heart, lungs and other organs of the body perform their assigned tasks normally. In short sports give him physical, mental and spiritual health and the child is now perfect sportsman, not only physically fit but he also possesses a healthy temperament and excellence of character. In other words, he has a well-integrated personality.

Now let us see how sports help to give the player a balanced personality, for that I must sum up some specific features along with advantages of sports.

1. I begin with the first feature of sports, i.e., punctuality. Sports function through a programme. The time for start is laid down. There is proper time for reporting to ground start of a match or an event, an interval and a finish to it. Sports, therefore, teach punctuality. Punctuality is a quality the need of which is bound up with social coordination and therefore an asset in the promotion of human relations.

Critics holding the doctrine of National Sovereignty as the great villain of peace have presented the ideal of World Government reducing the national states more or less to the level of local bodies. Approaching the possibility of World Federation from a democratic angle are, scholars and poets like Alfred Tennyson, H.G. Wells, H.J. Laski and Madariaga. But the idea in itself is very challenging. Looking at it from an empirical angle its success lies in inculcating a sense of keen consciousness of world community. Reinhold Neibuhr very rightly contends that a world community "cannot be made to order by legal, constitutional and governmental means. The community cannot be coerced into basic order; the basic order must come from innate cohesion". Considering the law of situation unless the powerful nations of the world abjure colonialism, imperial exploitation and racial discrimination, super national state is a vain expectation.[10]

It is clear from the foregoing conclusion regionalism, nationalism and internationalism have posed shocking threats before humanity. They are contradiction in terms and one cannot seek solvation in these man manufactured systems and ideologies. Our basic requirement to respond to these challenges of life is a social order violating all distinctions and prejudices of colour, caste, race and nationality. Islam with its message of universalism, social equality and innate justice can still come to the rescue of humanity. "Character, courage, industry and perseverence", said the Quaid-i-Azam, "are the four pillars on which the whole edifice of human life can be built and failure is a word unknown to me." True faith in these ideals is an open secret to the response of challenge of life.[11]

10. *Vide* United Nations in action, Chase pp. 3-11.

11. *Vide* Javed Iqbal, Ideology of Pakistan, pp. 168-69.

movements and a fairly large number has achieved political freedom and the rest are on the road to achieving it. Nationalism as is interpreted and practiced today, indeed is the greatest enemy of world peace. It is organized selt interest and self idolatory of Big Powers and is sentimental, emotional and inspirational. Two global wars with untold misery caused to human life and society are its inevitable consequences. In the present age of rockets, missiles, megaton bombs and destructive technological advancements we are further challenged to urgently replace international anarchy by universal toleration and cooperation-Internationalism has started haunting human mind and advocates a family of self-respecting and self-governing nations united with each other by ties of equality and mutual concord. William Lloyd Garrison claims. "Our country is the world, our countrymen aie all mankind. We love the land of our nationality as we love all other lands." Philosophers and thinkers like Confusius, Jean Jacques Rousseau, Immanuel Kant and the world renowned Dr. Mohammad Iqbal present to posterity the pattern of a supra national organisation, so that warfare, strife and discord do not threaten human life. The greatest practical advance in internationalism has been made in the 20th century. To quote some potent examples the League of Nations saw the light of the day on January 1, 1920 with prevention of war and pacific settlement of disputes as its major aims. Within a brief period of 15 years its helplessness in stopping war and injustice were widely known because the massacres in China, Abyssania and Spain were too obvious to expose its impotency.[9] The world was soon plunged in the grip of the second colossol War in 1939 chiefly because of the aggressive nationalistic designs of Hitler, Mussolini and the warlords of Japan. Total extinction of humanity challenged men's minds and the American statesman F.D. Roosevelt enunciated his four freedoms. This was followed by the Atlantic Charter which was announced in August, 1941. The Charter of the United Nations Organization which claims to be a voluntary cooperation of sovereign states and not a super state was ratified on October, 24, 1945. A critical survey of its work induces the synic to call it the "disunited nations". The big powers have converted it into an arena of competition between two power blocks. Since the inception of this world body, blows to international peace have been observed in practically the whole Afro-Asian world. An ideological war between the potent forces of Communism and Democracy are offering a serious set back to the successful achievement of its aims. It has collapsed in settling vital political issues of Kashmir and Congo. Fully realising the helplessness of this body mankind still centres profound hopes in it. The situation is one of perplexing dilemma if no U.N.O., then what total annihilation of human race. Which of the two is a workable alternative certainly the former.

---

9. Morgenthau, Politics Among Nations for 346, Also see Chapter XXVII.

role."[7] No single common factor drawing a nation together, or separating or distinguishing it can be found historically true. Race cannot serve as a single factor and so is the case with language and religion. Switzerland and Canada are nations in spite of being multilingual while Germany, Austria, England and America form distinct nations in spite of prevalence of common languages. If Mazzini and Fichte treat language as the most important factor, John Stuart Mill emphasises most on the identity of political antecedents and similar hisotircal experience and we the people of Pakistan root our Nationalism on common religion. Nationalism is a relatively modern phenomenon. States in the past were not delineated by nationality, but loyalties were owed to the city states, the feudal lord, universal church and the dynastic state. Out of the breakdown of the medieval world eventually emerged the modern nations and Nationalism brought the feudal fragments into a unified whole. The Treaty of Westphalia of 1648 established the modern state system. By the closing of the eighteenth century Nationalism became the outstanding force of History. If in England the rise of Nationalism coincided with the emergence of a middle class due to the development of trade, commerce and industry, in America it was the contribution of the liberal philosophy of John Locke. Thomas Paine and Jefferson, and in the case of the Muslims of Indo Pakistan sub-continent its course was formed by the reform movements of Sayyid Ahmed Khan, the writings of Allama Iqbal and the heroic leadership of the illustrious Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnan. World history fully testifies to the dangerous repurcussions of extreme nationalism, which showed their face, opines Professor Steiner,[8] in the guise of a policy of imperialistic expansion. The forms and methods of imperialism have been varying from military conquest and outright occupation to obtaining trade concessions. Imperialism the fundamental handmaid of what we term extreme nationalism was an offshoot of Industrial Revolution and commercial expansion accompanied by high standard scientific achievements and threw open a challenge to the colonial powers. The First World War was a response to this challenge and caused the collapse of Germen, Austro-Hungarian, Turkish and Russian Empires. The British Empire showed signs of decay from the passage of the Statute of Westminister in 1931. The idea of the self-determination of nations militating against the havoc wrought by Imperialism received stimulus during the First World War. Its contentions are that a nationality spread into several states can never be happy and contented and such a nationality is like a dismembered social organism. J.S. Mill in his Representative Government observes; "It is in general a necessary condition of free institutions that the boundaries of governments coincide with those of Nationality. The Afro-Asian states under the inspiration of the right of self-determination are launching their freedom

7. Essays on Nationalism (Macmillan, 1926) p. 21.
8. op. cit p. 119.

hue and cry giving birth to impediments in the task of national reconstruction and development. At the sametime language controversy in the country is another serious challenge to national unity, stability and smooth coordinated work. I am not going to venture the tracing of the historical rise and causes of this controversy and whether it is justified or not. However desiring to seek some measures which can remove these impediments a few suggestions are being offered for their settlement. Does the acceptance of Urdu and Bengali as the two national languages for the two wings of Pakistan undermines the importance and preservation of our regional languages? The deep concern of our people with the preservation of regional languages and together with them the culture and traditions of West Pakistan is constantly haunting public minds. Languages, in fact, are the vehicle and instrument of the expression of human personality and as such their cause must be duly safeguarded. In this respect I suggest that as is being done already in the country we should not ignore the pressing need for the provision of the necessary facilities for the teaching and research in Pashtu, Punjabi, Sindhi, Kashmire, Baluchi and other dialects that are the proud possession of our people. At the sametime regional cultures should be fully protected by means of encouraging and developing regional literature, folklore, customs and traditions. Besides, translation centres for the purpose of presenting regional literature in the two national languages of Pakistan i.e., Urdu and Bengali by set up.[5] These centres will act as a cementing bond and bridge up the gap created among us by linguistic differences. I will further suggest that both at private and governmental levels assistance be sought for conducting archealogical, architectural, anthropological and ethnological investigation in the various regions of Pakistan. To my mind regional differences in our country are a product of ignorance and lack of information about each other. The suggested steps should unveil the realities and no reason that out of these what we call dissimilarities a common united and distinct culture of Pakistan will spring up.

If the challenge of regionalism confronts us in Pakistan and outside, the problems of Nationlism are a far greater threat and signal to the security and stability of the social order. Nationalism in the words of Hans Kohn is "a state of mind, which views the nation as an ideal form of political organization".[6] Professor Carlton Hayes defines a Nation as, " a group of persons who speak a common language, who cherish common historical traditions and who constitute or think they constitute a distinct cultural society in which, among other factors religion and politics may have played important, though not necessarily continuous

5. *Vide* Javed Iqbal 'Ideology of Pakistan', pp 76-81. The problem is very intelligently discussed by him. It is a very rational and objective analysis of the whole issue.

6. *Vide* the Idea of Nationalism (Mecmillan 1944).

B.C.-322 B.C.) and Montesquieu (1689-1755), the Soil Exhaustion, the Topographical, the Nomad and finally the Adversity theory of Professor Arnold Joseph Toynbee following the line of approach of Max Nordeau[1]. According to the last theory "conditions of hardship or adversity are the real causes, which have brought into existence superior cultures (social change). Such conditions constitute a challenge which not only stimulates men to try to overcome it but generates additional energy for new achievements......[2]" To quote examples the Hebrews and the Arabs were challenged by regional i.e. desert conditions; the Carthagians by defeat in the first Punic War, which inspired them to lay the foundations of a new empire in Spain and the Muslims of the Sub Continent of Indo Pakistan by the rising tide of the alarm of the British Imperialist Raj and its partisan attitude towards the Muslim community and the hovering clouds of the Hindu Ram Raj.[3]

Despite the limitations of the Adversity theory of Prof. Toynbee historical illustrations from human past and present do testify that societies are challenged from within and without and it is their response to this challenge that explains the rise and fall of civilisations. Regionalism, Nationalism and Internationalism are some very high sounding geo-political challenges to human life. Intense devotion and sense of superior pride in the birth place and land of forefathers has more often than not exercised heavy pressure on human endeavour and struggles. The successive rifts between Athenians and Spartans in Ancient Greece for the political mastery of Greece; the abysmal distinctions between Arabs and Ajmis in Medieval times in spite of Islam's explicit rejection of these claims; the cherishing of lofty pride in AryaVarta by the ancient Indo Aryans and the successive failure of the capital move in 1327 A.D., from Hazrat-i-Dehli to a heathen land, Devagira in the times of Sultan Mohammad B. Tughlaq, all unanimously speak of the great human frailty — soft corner for one's own region. To exemplify with the assistance of near at home developments the 'One Unit Issue' with all our actions and reactions serves as a glowing instance. A famous scholar very rightly observes: "The plea for one Unit was a plea for sanity, but its birth and implementation are a story of shameful betrayal which is writ large on the face of politicians..[4]" Indeed, the One Unit Plan aiming at the integration and the creation of a consolidated province of West Pakistan promising administrative and economic convenience as well as prosperity is a sagacious step, but regional considerations are offering a resistance to the move. The power hungry leaders are raising

1. *Vide* Ebenstein, Great Political Thinkers, Chapters II, XVI.
2. *Vide* Interpretation of History pp 27, 77. Toynbee, Civilisation On Trial. p. 10.
3. See Aziz Beg, Before and After Revolution, pp 5-7.
4. *Ibid*, p. 95.

Life as Challenge

Regional, National and International Problems as Challenges Towards Life.

Dr. Mrs. A. Saleem Khan (Political Science)

Mr. President, Colleagues and dear Students,

It gives me immense pleasure to be here this morning and participate in the symposium on 'Life As Challenge'. Being a teacher by not only profession but also conviction, my humble plea is that an increasing contact between the parent institution i.e., the University of Peshawar and the affiliated colleges shall considerably assist in the propogation of the 'true cause' of knowledge. The colleges enjoy the position of being the reserviors of the supply of students to the Post Graduate departments of the University and we naturally look to you. Mr. Principal, for properly moulding the habits, character and thinking patterns of these young lads and lassies. They are under your care for a longer period and at a comparatively more tender age and you can guide and influence them more effectively than the University teachers. Hence, let us further tighten the chains of our contact by accelerating the speed and span of contact among us.

Mr. President, the subject selected for the symposium this morning is really a thought provoking and stimulating one. I do sincerely hope that our collective efforts of to-day shall conclude in the discovery of sound devices as to how the manifold warnings, alarms, signals or speaking precisely challenges of life be received and responded properly. Now, as I am asked to confine myself purely to those issues which emanate from regional, national and international challenges, I therefore wish to begin by scrutinising these issues individually by first reviewing the cause of their emergence. No event and movement can be comprehended and rightly understood unless they are placed in their proper perspective and examined against the wider background of world history.

Several factors as the researches of Socialogists and anthropologists go account for social change in a society thereby causing the rise and fall in human civilisations and culture. Prominent among these theories are the hypothesis of Climate as expounded by Aristotle (384

It is my personal conviction that man can go about his work of investigation and research more efficiently if he understands the functional significance to him, of the special field of knowledge he is engaged in. The number of men and women engaged in pursuit of knowledge is very inadequate. This number must increase enormously for the sake of a progressive human evolution.

I would like to present the outline of a system which would ensure this in a scientific manner.

1. The human child to be fed, clothed and brought up according to the most recent scientific concepts.

2. His early schooling to be according to most improved and recent techniques in education. A record of his aptitude and intelligence to be kept regularly from the very beginning.

3. His schooling and training in the fundamentals of knowledge, till he gets a through grasp of the environment, the living organism, the fundaments and significance of the ecological sciences and in the principles of Eugenical Sciences.

4. His specialized training in a field of knowledge as shown by his aptitude and intelligence test records etc.

5. His training for research in his specialized field.

6. Engagement in research in his specialized field in the light of the goal already stated viz, to contribute the physical intellectual and moral progression of man.

7. This is apparantly the principle and the most vital function of man. This is the only way mankind can ultimatelyd eciae and control their own destiny, by controlling their genetic constitution and their environment; man being a product of interactions of his genetic constitution and the environment.

But does he have any clear cut goal before him? Do the persistent and the highest efforts of the most highly evolved intellects of the human race have any ideal?

Yes, they do and I would like to enunciate it as I understand it as a student of biology.

The ideal is the progressive physical, mental, and moral development of the human species. This is vital. It is only a progressive dynamic progression of the human race that can stabilize and maintain the present civilization. The fundamental principles of work of a civilization that aims at the development of a progressive evolution of man are:-

1. TRUTH: Correctness and exactness in action, thought and narration. This is a fundamental principle of research and scholarship in any branch of knowledge.

2. Work constant and hardwork to the best of the individual's capacity.

3. The most important and fundamental is the persistent extension and utilization of knowledge in the attainment of the ideal already stated. Knowledge and pursuit of knowledge are the only way the human species can ensure a progressive evolution.

The pursuit of knowledge has to be from the point of view of Homo sapiens the man, for his sake, for his progressive evolution. From this point of view I have formulated a classification of knowledge. The various branches of knowledge are defined according to their functional significance to man. Briefly they are:-

1. Biological Sciences— Branches of knowledge tending to study the living organism including man. They include biology and medicines etc.

2. Physical Sciences—The branches of knowledge tending to study force, matter and the physical environment of man. They include chemistry, physics and the related sciences.

3. Ecological Science—The branches of knowledge which interpret the relationships of man with the environment, which is physical as well as biological. This division of knowledge includes History, Mathematics, Pathology and Ecology etc.

4. Eugenical Sciences—Sciences which deal with the principles and techniques of developmental improvement of man, his social organisation and the articles, equipment etc. he uses in the pursuit of knowledge and the attainment of his ideal.

The recent civilization is the highest form of the civilized state attained by the Homo sapiens. His attempt to understand his physical environment has progressively succeeded and expanded. He has developed the age of science, knowledge was never so systematized as it is to-day.

His attempt to understand himself has succeeded far beyond anything attained by any of the preceding civilization.

The insight man has attained into his physical environment is stupendous. The knowledge he has attained of the living organism is unparalleled and is fast expanding. He is attaining ever increasing longevity and getting a closer look at the origin of life. He is conquering disease and developing a disease-free body. He has always been trying to win the secret of life. He is on the threshold of solving its mystery. I would cite a recent and concrete development as an example. Scientists are at last begining to unlock one of the basic chemical secrets of life. One of the basic facts known is that the body turns the foods which are the chemical raw materials into proteins which are the basic building materials of living tissue. Growth essentially is the production of new proteins to construct new cells. The growing research is growing on in the great laboratories all over the world in the attempt to discover how the body manufactures proteins. This problem is at the root of biology; the chemical basis of life. It is one of the most important and exciting aspects of knowledge to-day. After decades of study and research a still far from complete hypothesis has emerged within the past few years, about protein synpthesis. It is known that the food produces certain chemical raw materials in the body about 24 different varieties of them called amino acids. Thousands of molecules of them are combined together in the assembling parts of the cells of plants and animals to produce the proteins. The study of proteins has helped the biologists to explain heredity. The functions of heredity have been traced to two chemicals —one called DNA (short for deoxy rebonucleic acid) is now believed to be the stuff, the heredity transmitting genes or structures are made of. It is in fact the designer of the cells and proteins. The other is RNA (ribonucleic acid) which is intimately associated with it. It has been visualized by the biologists that learning the secret of how the cell makes proteins and nucleic acid, and in turn how to make these all important substances in the laboratory may be a step in ultimately making a living cell in the test tube, in fact in creating life.

Man is thus meeting the challenge of life as a biologist. Man as a scientist has made phenomenal progress in unravelling the laws of force and matter, as is so well known to educated humans everywhere.

Biological Challenges Towards Life

Dr. K.M. Salim, M.Sc., Ph.D.

The early man was a creature of mere fundamental animal instincts. His chief concern was simply to keep alive. He had many enemies; in fact he had enemies on every hand. The most formidable of them were the physical environment and disease. He had however a constitution and mind which were very different from other animals. He had an active and effective grey matter. He analysed his experiences and learned from them. He drew conclusions and formulated laws and codes of conduct for himself. He learnt to judge from his past experiences. He had been gifted with a mind which could think, grow in knowledge, and utilize that knowledge. Gradually through the ages he grew in knowledge. He began to understand himself and his environment. He interpreted the phenomenon around him in his own way. At any time he is a result of the interaction of his genetic constitution and the environment. Consciously and unconsciously both, his attempt to understand his environment has been in order to get a better control of them. His essay to gain a greater insight into working of the forces around him at this stage was out of necessity, the natural urge to survive; without any hankering after knowledge for its own sake. Slowly however, as life became safer, more well ordered, and the division of labour among a population more elaborate, some men began to feel the thirst for knowledge for its own sake. It grew, it persisted, and became widespread-Knowledge for the sake of knowledge. Man became restless and inquisitive and posed himself questions, and pursued them with great persistence. In time man developed a civilization-indeed many civilizations. They arose by the efforts of men who sought knowledge and put the results of their efforts to use, in service of their community. Indeed the vigour of these civilizations depended upon the persistence and application with which the community devoted itself to the pursuit of knowledge, and developed and encouraged the faculty of original thinking. These civilizations degenerated when the men became passive and the society accepted placidly and unquestioningly traditional notions, and started merely annotating and imitating the findings of others. The society became static. The men lost sight of ideals and goals; in fact they had no ideals or goals what so ever. Any system, schedule or society without a progressive ideal cannot survive for long.

4. Cheap transportation to encourage and multiply social contacts will help a lot to weaken human prejudices;

5. The use of money may be extended and also of credit and investment opportunities. Money and these institutions do introduce impressional relations;

6. Illiteracy and ignorance among the masses be liquidated as early as possible. The spread of literacy alone will bring in a quicker and a smoother revolution among the masses;

7. The cultural lag be as much reduced as possible. 'Inventions are usually accepted into culture in two stages. To begin with, people change their day-to-day behaviour to accommodate the new device. Then considerably later on, people change their institutions and belief systems to allow for the invention, and arrange means for controlling its effects in the interest of society. The time between the first and the second stages is known as the cultural lag".

These reforms may be introduced by individuals, groups of individuals and by government or by some combination of these. By co-operative attack on social problems in many lands, the countries revise their policies to let it be more practicable and workable.

Mr. Raymond B. Fosdic says, 'knowledge is not enough..unless we can anchor our knowledge to moral foundations, the ultimate result will be dust and ashes. The towering enemy of man is not his science but his moral inadequacy'. This is exactly what Islam in particular and all the great religions of world in general preach. Moral delinquency sinks man to ignoble depressions.

The above reformative measures will definitely bring man closer and closer to objectivity and scientific outlook on life. And this is undoubtedly good. This would in turn yield happiness for himself and for others which is the ultimate goal of life. Besides happiness knowledge makes a man wise, who begins to behave wisely, if at all he does. A combination of happiness and wisdom will bring quicker adjustments with social and cultural environments.

the literate which eventually intensifies frustration and disappointment. Frustration and disappointment are potential dangers to public and scial peace and tranquillity. Symptoms of this social maladjustment are hysteria, neurasthenia, neurosis, and even suicide.

This number does not exhaust the list of social problems. The writer has however enumerated them, subject to limitation of his knowledge, according to their relative importance.

The individual or joint impact of these problems on the religious and moral beliefs of the peoples can well be assumed. On an average their intensity and conviction are adversely affected. And majority of the people cluster round the averages.

In the remaining portion of the paper an attempt will be made to recommend some measure to rectify, restore, resustain and rehabilitate the social and cultural beliefs of the people.

It is admitted that these problems faced and are still facing human beings here and there. In the first instance they may appear to be threatening, choatic and panicky. But they are soluble. With determination, skill, vision, knowledge and foresight their solution will come nearer and nearer. Other countries inspite of these problems could maintain an ever increasing standard of living. They could only do so that they slowly and steadily did introduce measures which did equate the economic prosperity and the social, religious and moral attitudes. Whether or not they have successfully filled up this gap may be still questionable. But they have surely relatively removed all those snages which were considered barriers and obstacles to their goals.

We can borrow their experience. It is no shame to borrow good thing from others. Good things are perhaps always good; the element of good in them may not be objectively appraised and evaluated.

It is hoped that if the following steps are introduced and harmoniously coordinated the process of human adjustment against the social, political, institutional, economic, religious and moral reactions may be facilitated. They are:

1. The social and political structures may be brought as close to human aspiration as possible;
2. The existing institutions in many human activities may be revised to provide more incentives to human actions;
3. Geographical and occupational mobility may be encouraged;

and for extra-curricular activities. Her absence from the home, no doubt has opened up new careers for her. She has acquired through education equal opportunities and perhaps a professional treatment in society. But at what cost. The anothropologists say that her increasing participation in public life has resulted in some of these consequences.

(*a*) The percentage of women in the labour force is steadily increasing. But the nature of jobs to which a woman in particular can comfortably adjust herself are not increasing proportionately. Consequently the fair and tender sex is virtually compelled to seek jobs which do not befit their temperament or the strain of the job falls very heavy upon her. For example women work as bus conductors, mechanics and professional dirvers.

Since the number of female jobs is limited in the under-developed countries this problem becomes still more serious. Some of the educated girls, consequently, are involuntarily unemployed. This involuntary unemployment of girls may be also due to some family, communal and social pressures. In the absence of these they might have been more effectively utilised in the society for the benefit of the society. The under-developed countries face this challenge of under-utilization of their skill, experience and education; perhaps it is a luxury for them to bear it.

(*b*) Job participation may change their feminish traits, and requirements as for example;

(*i*) the marriageable age recedes;

(*ii*) the sex appeal is weakened or distorted;

(*iii*) the affection for the children and the care for the husband dilute;

(*iv*) matrimonial relations are just mechanised. Unhappiness increases and in the west it frequently culminates in divorce or reparation.

(*v*) Adolescent crimes and delinquent children tarnish the society; etc.

10. *Widespread education.* To liquidate illiteracy under-developed countries are extensively spreading education. Proportionate to the increase of education the number of jobs considerably lag behind. This increases unemployment among

'in Democracies statesmen are poor and they have their fortunes to make; having a craving for money, they become more accessible to corruption, to bribery and so on than is commonly characteristics of the rulers in aristocratic countries. It is admitted that the men who conduct the government of an aristocracy sometimes endeavour to corrupt the people; on the other hand, heads of democracy are themselves corrupt. Whereas in the former case the morality of the people is directly assailed in the latter, an indirect influence is excercised upon the people which is still more to be dreaded".

He further says 'As the rules of democratic nations are almost always exposed to the suspicion of his honourable conduct; they in some measure bend the authority of government to the base practices of which they are accused. They thus afford an example which must prove discouraging to the struggles of virtuous independence and must foster the secret calculations of a vicious ambition. The corruption of men who have casually risen to power has a coarse and a vulgar infection which renders it contagious to the multitude....." He asks what better challenge could one find for the selection of men of unquestioned character and ability to fill up our public offices from thehest to the down.

8. *Social Mobility*. Industrial sceiety depends more and more on division of labour. Various kinds of jobs grow up and over a period of time becomc mobile. Workers pick up new techniques and skills; consequently they leave old professions to join new ones. Social mobility promotes training, breeds talents and furnishes good leaders. Talent and training and not birth, position and family status get more recognition. A new class, based on social ranks and status emerges out. Class consciousness is generated. Social mobility may be horizontal or vertical. Social mobility weakens caste barriers. Caste is an extress from of social class. In a class system the individual can overcome certain barriers and by the dint of personal enterprise or achievement can rise to a higher social level, in a pure caste system he can never. Social enhancement without cultural and heredity backgrounds give rise to certain tendencies in the field of consumption and behaviour which depress individual and public morals.

9. Modern women movement is another very serious social problem. It was once believed that "a woman, cat and a chimney should never leave the house, and if at all a woman should leave the house, she leaves it three times, "when she is christened, married or burried." But now a womon is too much away from the house for education, for jobs

berately undertake painful changes. People voluntarily undergo some sacrificies. The survival of the country becomes a question of life and death for them and they unhesitatingly risk every thing, however precious it may be, for this eventual goal. National strength or prestige becomes the supreme goal, industrialisation the chief means. The costs, inconveniences, sacrificies and loss of traditional values can be justified in terms of this collective ambition. National ambition was a potent element in the industrialisation of Japan, Germany and Russia. In India, Pakistan and China it is true with added force in the present era.

6. Secularization. Roman Catholicism did not flourish industrialisation. Reformation helped the Industrial Revolution in North-Western Europe. Secularisation advocates 'decline in the prestige and power of the clergy in favour of the productive classes the lessening of religious restrants on knowledge and opinion, the relaxation of ritualistic controls over economic acitivity and the diminishing reliance on superstitution and magic'. Religious states like Pakistan and Israel may denounce it but they cannot check its resultant consequences which are steadily creeping into their economics:—

7. Ethical and legal discipline. An industrial society is a regulated and a Co-ordinated economy. Unless it submits to a particular kind of discipline which vouchsafes industrial-efficiency and productivity through honesty, fair competition, individual and collective efforts, it cannot flourish. These ideals of industrial efficiency and productivity may fail in the beginning and perhaps they do 'corruption, nepotism, jobbery, adulteration, price manipulation and lack marketing activities are all specimens of a lack of some discipline'. Corruption in government and business is inevitable in one form or another in all countries, but relatively speaking it is more pronounced as well as that it lingers in democratic countries praticularly where there is mass illiteracy and ignorance among the governed and perhaps the endless ambitions of the few governors. It is said that thefirst few years in Russia after the Revolution of 1917 manifested perhaps too much explicit signs of unbridled corruption, vengeance and inefficiency in public administration so much so that by 1921-22 one out of every three persons in Petrograde was a government official, corrupt and inefficient.

De Tocqueuville in his 'Corruption and Vices of the Rulers in a Democracy, and Consequnent Effects upon public Morality" says that

it was the age of wisdom, it was the age of foolishness, it was the epoch of belief, it was the epoch of incredulity, it was the season of light, it was the season of Darkness, it was the spring of hope, it was the winter of despair, we had every thing before us, we had nothing before us...."

In an underdeveloped country the social problems, as they are, seem to be simple and unassuming. The man to man relations are frank, candid and personal. People are helpful and sympathetic. Religious beliefs are followed by honesty and with conviction. They may be blind and ignorant but still ignorance is bliss to them. Unless these religious beliefs become dogmatic and fanatic they are harmless. Ethics and morality are similarly simple and precise. The whole of the religious values are reduced to a few taboos and a few exhortations. The taboos which are the negative values are relatively more pronounced.

This is in a nutshell a cursory description of the social, religious and moral structures of peoples in the underdeveloped countries. They have not been thoroughly good nor they have been equally disappointing. The lack of the emergence of social problems in its present form and magnitude and in its present trends in the developed and the developing areas has considerably arrested the growth of cultural, economic and social developments of the areas and of the peoples. The dogmatic religious values in the ancient times have probably played more havoc than even the lack of social problems etc. Strict moral requirements accordingly nourished in these so called favourable soils. These stereotyped moral standards relative to the more or less same environments and situations do not get an opportunity to adjust and adapt themselves with the changing society.

Some of the basic social probiems which face a developing economy are the following.

1. Population ana all its allied effects.
2. Industrialisation and the resultant conseuqences of it.
3. Urbanization and the imbalances which it introduces rather pretty fast in the structural and insitutional behaviour patterns of the peoples.
4. Rapid changes and quick transformation in the social, economic, cultural and intellectual fields do complicate the public relations and very often result in the deterioration of public administration in the first few decades of national reconstruction.
5. Nationalism. It lends support to the ambitious programms of industrialisation. It induces and persuades the people to deli-

Social changes are introduced by groups of individuals. It is a group action and it is necessitated by the environments or circumstances. Unless the reasons for a proposed change are understood, and it is felt necessary, it will never be made.

When these social changes come in clusters they assume the form of movements. Philip Taft defines 'Social movement' as a 'widely held desire to change political, social or economic relations, not primarily for the advantage of the participants, but for the benefit of all people'.

When the conditions of life change, institutions must be adjusted to protect the individual and the society. This resultant adaptation 'constitutes social reforms' according to Mr. Thomas H. Green.

The criterion of a social reform movement according to Mr. Rudolf Heberb should 'aim to bring about fundamental changes in the social order especially in the basic institutions of property and labour relations'.

In each country there are many social reform movements simultaneously in action. They are an outcome of a complex structure of human institutions and values. Human institutions and values represent men's experiences in life and their adjustment to their beliefs, objectives, hopes and fears of life as a whole. They depict a social adjustment process which is perhaps the biggest and also the most difficult problem of man.

This social adjustment process is complicated OR eased down according to the nature and magnitude of social, religious and moral problems of the period. Social problems are particularly periodic. They may be exactly repeated in different countries at different times. They may also perhaps follow a same sequence in individual countries. First things come first and last things come last if at all we can precisely determine the last thing in particular.

Since this challenge is relatively more pronounced at this particular time for the relaively under developed countries which are coincidently at the threshold of titanic revolutions in them. Quick and rapid transformations are taking place. Old order is fast changing yielding place to new. Old values are being disintegrated, new values are not yet formed. Unhappy past is receding, but the pleasant future is not yet clearly visible. These countries are caught in a dilemma. The situation is very baffling, confusing and indecisive. This may be resembled to the scene described in the opening stanza of Charles Dickens' Tale of two Cities wherein he writes that "it was the best of times, it was the worst of times,

combination of the two has been ever slowly and steadily raising the status of man. His domination over natural, physical, and economic forces proportionately has been increasing.

He has not yet achieved complete success nor he may perhaps ever achieve it. But this does not mean that he should abandon and give up his struggle for it. At times his struggle is cowed down by contrary forces arrayed against him. At times he is relatively more successful in his mission. Sometimes he goes up and some times sinks in relation to his environments. The struggle for the eventual salvation of mankind continues. Progress is never steady. Progress in the industrial as well as in any other sector of social or cultural life proceeds by jerks and rushes.

Progress according to Prof. Arnold Toynbee is a movement of self-determination. Mr. Singer says that progress should be measured by the degree of 'Co-operation with man in the conquest of nature'. The idea of social progress captured the imagination of thinkers. In 1737 the idea was proclaimed by a French philosopher, Abbe-de Saint Pierre, in a book entitled Observations on the Continuous Progress of Human Reason. "He clearly presented for the first time the thought that humanity has an immensely long, progressing life in front of it'. He wrote that mankind can improve its condition.

Improvement means to bring about desirable social changes. Social changes, although they may be greatly needed, generally run counter to established beliefs. 'People resent criticism of accepted notions'. They become angry and sometimes quarrelsome when their traditions of social patterns, religious beliefs, and of morality are attacked. Perhaps no value is permanently constant. Nothing is absolutely good except the good itself. Every new idea of change or reform is not adopted immediately. Every innovation is looked down upon with suspicion and fear. Even relatively nobler social reforms received vehement criticism. For instance when prisoners' reformatories were opened in the hope to rehabilitate them in life it was regarded that it would make crime more attractive. Efforts to control child labour were regarded as an unnecessary interference in the rights of parents to decide what was best for their children.

Whatever we do in cooperation with other people is social behaviour. Man is not unto himself. He lives in the society and also dies in the society. Therefore throughout his span of life he excessively borrows from the society as well as lends his experience to it. There is very little of the behaviour of an adult which may be regarded as strictly individual behaviour. He can therefore, through his contribution to the society, can ameliorate the social conditions. Man, if he likes, can better society by his deliberate efforts.

Symposium on Life as a Challenge

Prof. N.A. Bokhari

Life is a challenge. How should we meet this challenge in the fields of social, religious and moral problems?

"All our life so far as it has definite form, is but a mass of habits—practical, emotional and intellectual-systematically organised for our weal or woe, and bearning us irresistably toward our destiny, whatever the latter may be...." William James.

Life is a living process and it is a very precious thing. It is worth living. It must be lived with dignity, pleasure and happiness. The Creator created it for a purpose. He says that He is a hidden treasure and He wants that He should be known. His very first creation was a spectacular one. He ordained all the angels to submit to Adam the moment he was created one of them, perhaps their teacher challenged it. He lost it through a trial whereas all others unconditionally surrendered to Adam. It may be inferred that the life itself immediately it was created was confronted with a challenge which could not be sustained. No doubt Mr. Satan did surrender but he did not admit his defeat. Ever since he has been seriously trying to beguile, misguide and mislead the sons of Adam. Let the sons of Adam, accept this challenge as boldly and courageously as he himself once did. The forces against man may be mighty, tremendous, terrifying and hostile but let him not be scared, obsessed and dominated by them.

It is also said that a malik represents a might and a potential strength.

When all malakut bowed before Adam it means that all the mights of the Creator on the very first day acknowledged the supermacy, of the Created specimen. This belief in man that he emanated life and that he is the centre of all human activity, has instilled in him the ambition to lead his life as marvellously as he can.

The purpose of life is to serve and help. Since life itself is endless service and help towards life must necessarily be needless. This happy

all are intrinsically useful, they can lend themselves to destruction. And second, these developments have a trend towards effecting the earth as a whole. There is an intrinsic conflict with geography and institutions based thereon. This is the maturing challenge of technology.

Present awful possibilities of nuclear warfare may give way to others even more awful.

The solid one fact is that the immediate challenge to life is due to an evolution that while useful and constructive is also dangerous. Can we produce the required adjustments with the necessary speed? The most hopeful answer is that the human specie has been subjected to similar stresses before and seems to have an ability to come through after varying amounts of trouble. To ask for a complete detailed solution in advance would be unreasonable.

inside the sun leads to the conclusion that the sun must become more and more brilliant with the passage of time. In about 10 billion years' time its luminosity will increase by a factor of 100. By that time, it is expected that the surface of earth will be heated to about the boiling point of water, the oceans shall be no more and the earth's atmosphere shall probably escape into inter-planetry space due to this tremendous heat. No life will be possible on earth any longer and all its inhabitants shall perish due to this heat. After this maximum effort, our sun, deprived of its last ounces of fuel will finally turn towards its death bed. However, this grim picture is no longer so gloomy now that the success of interplanetary communications has opened the possibilities of human migration to some other distant planets.

Another challenge to life and the one that has kept the Malthusian Economist awake during nights is the state of affairs vis-a-vis our rapidly depleting sources of energy. It has been argued that while our cabonaceous sources are limited in supply the way that they have been consumed uptill now there will not be much left for us in a few hundred years' time. However, the discovery of Atomic Energy has, for the present allayed all our fears on this score. With the research in hand we have just been able to convert only .7% of the mass of the fissionable material into energy. Theoretically, there seems to be no limitation as to the 100% conversion of mass into useful form of Energy. This implies that so far as our sources of energy are concerned their is no danger of their being exhausted in due course of time for a foreseeable future.

The worst of the challenge to life is from the technology that these forces have compelled the man to master. The effect of the technological progress has been to enlarge the size of political, economic and cultural units—and to increase the danger of collision among nations, among economies and among cultures. Technological evolution is still accelerating. Technologies are always beneficial, constructive and yet their consequences tend to increase instability. With the advent of nuclear energy—a means of inexhaustable supply of energy—what is going to happen to technology is rather hard to imagine. However, the effects as far as they can be foreseen are radical indeed.

Similarly, very recently a unique feature has crept in industry and that is auto-mation. Machines containing 10000 vacuum tubes now operate faultlessly over longperiods performing many millions of regulated preplanned actions per seconds. The effects that these machines are going to have on the efficiency of industry are again very difficult to realise.

Such developments as abundant cheap energy, greater automation and improved communications have certain common trails. First, although

Challenges of Physical Universe Towards Life

Prof. Habibur Rehman

Allow me to qualify life at the very outset. By life I mean the Human Life as it is to-day subjected to the laws of Evolution and in a continuous process of development towards higher and higher norms.

Life, in the context of what is stated earlier, appears to be challenged by the physical Universe in two different ways. Our very existence appears to be in jeopardy, of course, in the distant future, on account of an inter-play of mighty forces—the dynamism of which is responsible for whatever is happening now, and an insight into the working of which is the aim of our Physical Sciences. A process, so it looks is heading towards its logical end over which we-the mortals-seem to have no control inspite of the bitter destiny that the end has in store for us. Then, there is even a greater danger to life on account of what we have learnt, in the course of our struggle for existence, about moulding and reshaping these forces to serve our specific limited interests—the daily, nay, the hourly improvement of which methods is the purpose of our advanced technology. I am trying to make just this humble submission that while there is no doudt about the existence of forces in this Physical Universe definitely hostile to us as a result of their inner blind mechanism we ourselves are heading towards an earlier disaster created and nourished by us as a result of our successful combat for the subordination of whatever could be of some use to us. This is what can be rightly remarked as the irony of the Fate.

The first reason for such a pessimistic view about Life is what the physical scientists call the possible heat death of this planet. In our studies of the origin and the evolutionary development of the Earth we know that its entire history is closely linked with the central body of this planetary system, i.e., the sun. The sun is anp has been the ultimate source of all forms of energy and the sustainer of life on this globe. The energy reaching us from the sun enough to afford liveable temperature is produced by the transformation of chemical elements that is steadily going on within its hot interior. From the rate of consumption necessary to support solar radiation, we find that the chemical fuel suffices for roughly another ten dillion years. A detailed study of the processes going on

To bring humanity at one platform it is necessary to develop this unitary and balanced outlook on life. It is only in this way that nations of the world would be able to get rid of their narrow subjectivities.

Ladies and gentlemen: Life is a very vast and endless subject. Therefore I end my introduction of the subject and would not like to stand any more between you and the learned participants.

Thank you very much.

There is no doubt that reality as a whole is one - a unity in diversity. But ever since the growth of human consciousness the Reality has been looked at from two different points of view: The subjective or the religious methods and the objective or the scientific method. But methods have got their own techniques and their own logic to follow. The scientists and philosophers claim that they understand Reality while the prophets and the mystics tell us that they do not only understand it but also live into it beyond the space-time continuum and over and above the laws of causation. Since the Reality is one, and, as validity for both the techniques is claimed, the two roads then must lead to the same end. I am an optimist and think that the two paths must meet one day. The two paths as yet do not negate each other as it is generally understood. The only desirability is that science needs some modification in its mechanistic methodology, and similarly Religion must be looked at in its essential universality from the point of view of broad ends and not that of limited means. It should be looked at in its most pure and simple form and must be differentiated from the customs, superstitions, fanaticism, and from all other undue interpretations based on political and economic motives.

This wholeness and synthesis in outlook harmonizing religion and science surely prepares us for a balanced and objective outlook about both external and internal features of Reality.

Life being an internal urge to grow must be lookea at from an open mind, because while not strictly following the laws of causation, it does not seem to be a blind and vague movement. Prophets, scientists and philosophers all have worked for the same end; we observe that truths of all the religions and facts of the all sciences do nothing, but help in strengthening all those life supportıng forces which promoted and preserve life. One naturally comes to this conclusion that these benefactors of humanity have been working for the continuous strengthening of the creative and constructive forces of life, and this has been their only cherished goal.

The sooner the humanity as a whole looks at life in this broad perspective ana accepts it as a challenge the sooner will it reach its destination, which is nothing less than a complete mastery of MAN, over himself and his universe. The unexplored possibilities of complete adaptation and mastery of MAN over the forces of Nature are immense. This vast universes is for MAN and the distant planets in the still more distant worlds of galaxies must soon he within his reach for this purpose. Great have been those who have died for this cause and great will be those who aspire for it.

cyclones, storms, regional, national and international prejudices, psychological and biological limitations, exploitation of the just and the weak by the unjust and the strong etc.

It is perhaps because of this that we find such ideas in world literature; (*i*) life is a tale, told by an idiot/Full of sound and fury/signifying nothing. (*ii*) life is nothing but a preparation for death (*iii*) life is nothing but a delusion and a dream (*iv*) Man is a poor creature, just a cog in the machine; he is condemned to live and die (*v*) Man cannot prevent what is going to happen and man cannot do what is not already fixed and determined, etc. This weak, emotional and fatalistic attitude towards life can be found in any society on the earth. But through thorough examination we find that the East is the more servere victim of this diseased attitude towards life than the West. So many causes like climate, socio-economic conditions, etc, many be held responsible for this attitude. But the external causes are never so strong as the internal ones. I quite agree with Prof. M.M. Sharif when, in his book 'Muslim's Contribution toward Science', he writes to the effect that the reason why Muslims were left behind in the field of science and technology was in the main due to the strong influence of Ghazali's philosophy of mysticism which left no scope for Ibn-i-Rushd's objective approach. Ibn-i-Rushd had emphasised over the objective technique for the understanding of Reality. Europe had been influenced by such techniques and so took lead in the scientific adventures. But Ghazali's ultimate emphasis on subjectivity and mysticisn influenced the Muslims to such a degree that they directed all their attention and energy from outer realities toward the inner mealities of the self and its enlightenment.

The Muslims are not alone who have got themself barred into narrow barriers of their subjectivity due to the one or the other reasons, but it is true about the whole of the East which has gone so much lost into its introvert and pseudo-mystic approach toward life that today it is a major victim of both internal and external anti-life and negative forces of Nature.

Truly speaking, both the East and the West have gone astray. While East has gone so much in the direction of 'within' that the outer-realities now present a veritable challenge. And, similarly, the West has exhausted itself so much in controlling external realities that the inner Reality of life is almost inaccessible, as a result of which psychic and spiritual chaos has set in, so much so that the neglected inner realm of life has become a challenge to the life of the West.

Whether it is the East or the West, both must accept the challenge and this can be the only way out.

Introduction

Mr. Mohammad Ashiq, Director Philosophy Society

Respected Vice-Chancellor, Mian Sahib, Ladies and Gentlemen.

As a brief introduction of the subject of the symposium I seek your permission to read out the following few passages.

The subject for today's discussion is 'Life as a Challenge'. The question is what is life and what do we mean by the world 'challenge'? A very simple answer to this question can be, that life is a mysterious, growing and continuously creative urge manifesting itself at its higher level in the form of human will. As far as the word 'challenge' is concerned it means a capacity to realise certain conditions which create a danger for any spiritual or material existence. So 'life as challenge' means life as capacity to realise those conditions which create danger—danger for all those conditions which so far have either promoted life, or are promoting it, or, will promote it.

Science and religion have got different ways of approach to the problem of Reality. But because of different nature of to-day's discussion we will not touch the problem: Whether the present system of Reality is the result of a gradual developmental process or it is a sudden creation of a some supreme wisdom. We will likewise not touch this problem; whether human specie is an emergent and special creation or the result of a developmental process of evolution. Putting aside all thesedi fficult problems if we simply look at the forms of life available on the planet of which we are the inhabitant we find that life manifests itself in three major forms, namely, botanical, animal and human. At all these three stages life seems to be a unique kind of movement emerging as a result of the tug of war between inorganic and organic, life producing and anti-life, creative and non-creative forces.

For facilitating the discussion let us take the example of life as it manifests itself in its highest form of human being. No doubt we can clearly see those forces which are and have deen dusy in promoting and maintaining human life; and busy too in creating all those conditions which have made human life and civilisation what it is. But there exist other kinds of forces too-earthquakes, diseases, poverty, ignorance,

(*ii*) Kaferistan—There are three valleys called Remboor, Bumburiat and Barir which has been called by some people Kaferistan. But I don't know why the people call it Kaferistan. The majority is that of Muslims and still now the pagans are being converted to Islam. In this regard I would like to appreciate the Chitrali Ullamas who are trying to convert them to Islam.

In these valleys there are very few pagans who have religion at all. They put their dead in a coffin and place them in a grave yard. They eat dead animals. They have a very old type of fashion. The women wear a long rough type of cloack even in the summer. The women do all the work in the fields and in the house. They slaughter at least 30 or 40 goats or sheep for a marriage celebration day. Any how I request my friends not to call these villages Kaferistan. They should call them Islamistan because now the majority of the people there is of Muslims.

(*iii*) Drosh—There is a tehsil and a cantonment which is the headquarters of Chitral Scouts. There is a very poor city and a high school too. The people and the boys come from the village for shopping and studying.

(*iv*) Jenjeril—Ashrett and Arendu and other petty villages which are very beautiful for their green lands and extended fields. Asondu is the post of Chitral Scouts. There is a pass between Chitral and Kabul.

Sports

The people are interested in Polo and foot-ball. There are many games which are being played there but it will be a boring article to go in detail. People are interested in hunting and evening walk. Most of the people walk round their fields to make themselves pleased and enjoy fresh air there.

Philosophy Society, Government College Peshawar—1962-63



Sitting:— Mr. Matloob-Ur-Rauf (President), Dr. Mrs. Saleem (Head of Political Sc. Department, University of Peshawar), Mian Zia-Ud-Din (Sitara-e-Pakistan, Former Ambessador of Pakistan in W. Germany), Ch. Mohammad Ali (Vice-Chancellor, University of Peshawar), Dr. Razi-Ud-Din Siddiqi (Vice-Chancellor, University of Sindh), Mr. M. Ismail Sethi (Principal), Agha Kafeel Siddiqi (Vice-President),

Standing:—Mr. M. Saleem Butt (Secretary), Mr. M. Bakhshish (Treasurer), Mr. Jameel Ahmad, Mr. Bahader Sher, Mr. Awal Khan, Mr. M. Ashiq (Director), Mr. M. Sarwar. Mr. Zia-Ud-Din (Joint-Secretary), Mr. Jaffer Shah, Mr. M. Khaliq.

2. Biar—In this area there are only three villages very important which must be mentioned here:

   (*i*) Mastooh—This is capital of this district. There is a post of Chitral Scouts and a big fort (Noghor).

   (*ii*) Bori—It is very beautiful for its fruits and green grass extended gardens.

   (*iii*) Sonoghor—It is so beautiful for its bright scenery and for its green grass lands and gardens.

   (*iv*) Torkhow—There are three villages which are very important to write (a) Werkop—It is very beautiful place for its green lands and gardens (b) Raen is important for its fruits and green fields (c) Shagram—There is a tehsil and it is a centre for the people in the village near by.

3. Morkhow—There are three villages important:

   (*i*) Drason—There is a tehsil. The people of this area decide their matters there.

   (*ii*) Kosham is a historical place which produces a good citizen for the country. The people of this village are very sensible and clever and are very hard workers. This place is not so fertile as others are.

   (*iii*) Terich—It is important for its cold weather and cool water. Terichmir the highest mountains in Pakistan is there. It is said that only two human beings have ever climbed up to the mountain's top since the early history of Chitral. The water of this area is so cold that some people cannot drink a full glass of water.

   (*iv*) Lotkoh—It is important for its hot springs. These hot springs are healthsome for a patient or disease and when one takes bath there he becomes all right.

4. Chitral district—Chitral is the capital of this state. There are the governing or ruling authorities. The fort of king (Mehtar) is there. There is a small bazar and power house, airfield, cantonment, a hospital, council, a well constructed jamia masjid and a high school. There is a tehsil and a district.

   (*i*) Ayon is a very beautiful fertile place with green lands. People are very hospitable and have a good unity.

Dialects

They speak Chitrali dialect only. There are a few people who speak their own dialects in the small valleys of this area.

Traditions

When there is marriage or other celebration day one has to invite a few friends and relatives. The villagers and neighbours are expected to come and to join in the pleasure and they are served a celebration feast. In this matter one has to spend a lot of money forthe entertainment of his guests. Even in the death one has to invite all the people who have come for Namaz-e-Jenaza or to the grave-yard with the dead body. The relatives of the deceased distribute the money amongst the people. The rich people refuse to take it.

Culture and Civilization

The people are back-ward and there is no Intermediate college even. No industrial factories are there. The people have no job to do. They live on cultivation and farming. There are three High Schools and two Darul Ulooms where a number of students are getting education. There are no means of communication and transportation from village to village. The people had to go either on foot or on the horse.

Cultivation

The people can sow maize, barley, wheat, rice, pulses etc. The land is fertile but the weather is very cold. There the people sow and harvest their crops in different times. When some people sow the seeds others harvest them at the same time. From village to village the people have different time to sow and cut the crops.

Features and nature of the people

The people are strong and hard-working. They lead a very had life. The majority of the people have their own farms. They have different colour and features and different nature. People are on the whole very upright, sincere, bold and sympathetic.

Important villages

It is divided int two districts: Chitral and Mastooj and into six tehsils:

1. Upper Chitral—In this area there is only oned istrict Mastooh.

Chitral Valley

Ashraf-ud-Din, B.A. (Part I)

Many of the tourists have writen about their stay in Chitral. They have ignored a few things sometimes and exaggerated some on other times. So I, being a resident of Chitral want to state something about Chitral and its importance, situation, conditions of the people, climate and important villages which have been stated wrognly by some tourists and visitors.

What is Chitral? In chitrali dialect (Khowar) chetur means land or farm. It is said that the ruler of Chitral had awarded a farm to one of his body-guards who had performed a noble service to the king while there were some disputes between Chitral and Kabul. The land had been given out of the rulers own land therefore it is called Chitrar in Chitrali dialect and it means "farm-land". This Chitrar has been changed into Chitral.

Situation

Its boundary starts from Lowari top and ends at Bordghol top. Distance from Lowari top to Bordghol is approximately 200 miles. The boundaries of China and Russia meet it at Bordghol top. It is situated between China, Russia and Afghanistan.

Climate

The climate of this area is strange one. From one village to another the climate is different and effects on the crops and fruits. The water is different from village to village and from valley to valley. In summer the weather is so pleasant that one can enjoy it. In February the water is so cold that even in summer one likes to take bath with hot water. Water is so tasty and cold to drink.

Relligion

The people are very orthodox and they perform their religious duties on every turn of their life. They are very humble, sincere and upright in the matter of religion and scoial matters. However there are very few people callen Ismailia and very few pagans in Biar and Kafaristan respectively.

my satirical remarks against any body. But why should I write a story? I can write an essay. Early rising" is the most suitable topic that comes to my mind. I can say therein "Early to bed and early to rise makes a man healthy, wealthy and wise". But this is not true. I am telling a lie. Sleep is better than rising. Then how can early rising be a good thing and the best thing in the world? "Our College" is the topic that presents itself to me. What a fool I am. Why should I have not thought of it before? I think, I can write a long article about the College. But who will read it? No body, I think. I must write about my village. It has many charms which are not for the out-siders. I shall be doing a great service to the nation by describing those charms. Here is the essay, "My village lies at a distance of two miles from Peshawa city." Here I have to answer a question. Why should people read the article which contains the description of my village. Think of some other subject. It is getting late. This thinking can be done tomorrow. Let me meanwhile have complete rest. Rest will not do. I must have a sound sleep. It will refresh the mind and make me fit for my job. Sleep is necessary for health. It is then decided that I have to write my article for the magizine tomorrow without fail. What is it, Mr. Editor? Who has reproduced my thoughts here? It looks like an article. I have not disappointed you, Sir, Here is my article for the Magazine.

For the Magazine

Abrar Hussain Khalil, B.A., (Part I)

I must write for the magazine. I cannot afford to displease my professor who has always been very kind to me. I must obey him. Well, then, I have decided to write for the College Magazine. What a stupendous task it is. Very few people can write for an English journal. I am one of them. I have decided to write the article. Being a man of strong determination I hope to accomplish this heavy task. When you make up your mind to do a thing and have the enthusiasm to carry out your plan, half the work is already done. Mine is a very good start. Good start means well begun is half done. This means I have completed half of my article. What a fool I am. In spite of so much progress I have not yet thought of the subject. Yes, I must have a subject in the mind first. That is the greatest difficulty of all the writers. I am no exception. There can be many subjects. I can write a book on that. A splendid subject, a fascinating topic. No, no this will not do. Why should I relate my personal experiences to others? Will not this topic give my readers the impression that I have had many love affairs in my life? Why should I write such lines that - - - "I was so overcome by my desire for her that I embraced her most unexpectedly and kissed her with utmost tenderness on her fiery cheeks. It seemed that my lips were burning and my mind going blank"? I know that the students would like to read it. But my professor would get me wrong. I must think of some other topic. Young men like stories. I must write one for the magazine. It is the story of a king. Yes, a story will be the most welcome addition in the magzine. It may bring me an honour or a prize. "Once upon a time there was a king" - - - - - But who would like to read the story of a king. I must write a modern story. It must be full of realism. "A poor boy worked in a mill" - - - - This is not a good sentence. It should be, "there was a poor boy who worked in a mill". But this is the story of a poor boy. No body would like to read it. A poor boy should not be the hero of my story. He must be a brave man or a scholar. Wait, please, I am reminded of my professor's instruction. He wanted a humerous article. An idea has just struck me which can be expanded into a humerous story. The other day I saw some boys dancing round a drummer. I can write the story of "The drummer and the college students". I can create humour therein. But where there is humour there is satire. I do not want to direct

Some Good Sayings

Fazal Ahmad, B.A. (Part I)

1. Clean your finger before you paint at my spots.
2. He that falls in love with himself will have no rivals.
3. He that teaches himself hath a fool for a master.
4. Less wishes a few troubles there are.
5. If you would keep a secret from an enemy tell it not to a friend.
6. Love your enemies because they tell you your faults.
7. She laughs at every thing you say, why? because she has fine teeth.
8. The proud hate pride in others.
9. Time is a herb that cures all diseases.
10. The more acceptable service of God is doing good to man.
11. Write empires in dust, benefits in marble.
12. Work as if you were to live one hundred years, pray as if you were to die tomorrow.

Quotable Quotes

Gulzar Khan, B.Sc. (Part I)

1. Evil often truimphs, but never conquers—The Holy Bible.
2. The evil that men do lives after them, the good is often interred with their bones—Shakespeare.
3. What is beautiful is good and what is good will soon also be beautiful —Sappho.
4. Beauty is power while smile is its sword.—Reade.
5. A thing of beauty is a joy for ever—Keats.
6. The only reward of virtue is virtue—Emerson.
7. A man is a worker, if, he is not he is nothing—Old saying.
8. "Say well" is good, but "Do well" is better—Old saying.
9. No pains, no gains; no thorns, no throne; no gall, no glory; no cross, no crown;
10. Blessed be ye poor; for yours is the kingdom of God —The Holy Bible.
11. There are three faithful friends; an old woman, an old dog and ready money—Frank.
12. Most friendship is feining, most love is folly—Shakespeare.
13. The things taught in the schools or colleges are not education, but the means of education—Emerson.
14. Great ambition is the passion of a great character—Nepoleon.
15. Cowards die many times before their death—Shakespeare.

Every month he is provided with a good deal of money by his parents and he spends it in a proper ways. They arrange picnics and tours and enjoy them. They also have literay circles and debates in their hostel at least in a week and a golden night once a year. The gates of common room and reading room are every hour open for them. A cinema show in the evening is a thing to look forward to.

Boarders have matches with day scholars which bring them in close contact. They develop a keen sense of collective honour and extend the spirit of cooperative life. This co-operative life does a great thing for students. It brushes off the black spots of their character. It develops union and friendship among the students. A student who has some expereinces of hostel life can never have curved ideas. One gives up one's habits and learns many good manners. Many students coming every year from the far away corners of the country have learnt manners and respects for the feelings of other in the common place.

Boarders develop the spirit of give and take. No one is selfish. They move about and eat together in companies. There is akind ot socialism in hostel life. If one is rich he cannot show it by waring costly dresses, by using much money or by boasting. They are all friends and try to become real associates and gain something from one another.

In a college hostel human qualities are greatly developed. One learns to be more tender towards others whenever a friend falls sick one learns to nurse him, to comfort him, to encourage him and help him in all ways. Besides this one also learns many new things. One becomes familiar with different traditions of different places. One increases his vocabulary by learning many words of different languages. Not only does knowledge increase, one's outlook also increases, study also is helpful. Boarders pay a great attention to their study. They study till mid-night. The junior students consult seniors and take their help. But on the whole, life in a college hostel does more to improve a student than to injure him.

Life in a College Hostel

Gulzar Khan, B.Sc. (Part I)

Life in a college hostel is a great amusement. There is nothing like it in student life. A real life of a student starts from the hostel. The day-scholars who live with their parents and relations talk of home and its comforts but in heart they envy their friends in the hostel. In a college one does have all the funds, freedom and good time that a day scholar does not have it at his comfortable home.

Life in a college hostel is a revolution. So many young men livng together in friendship; and freedom which has the immense influence on the mind of a collegion's friendship which would last a life time are made here. One forgets all about his private friends but not his fellow hosteler These friendships are lifelong.

The great thing about life in a college hostel is the freedom it gives us. Here we are free to do what we like. We are free to move about, free to study, free to enjoy and free to be overselves. But this freedom has some limitation. There are hostel regulations which every student has to obey. One cannot go out when study hours begin at night. No student can keep a pistol with him. One must not have a bulb more than 60 watt. in his room. Heaters are strictly prohibited.

When "sign" is over, no one can go to other's room or make noise. These regulations are not unsuitable for every student is required to have a discipline and learn something. To tease the superintendent, to bribe the chowkidar, to deceive the bearers, to lock a first year student in a latrine or a room, to steal some thing from the kitchen or from room-mate. There are what all good collegions in the hostel are fond of. But the Superintendent does not take any strict action because these are not the worse of them. The habit of crying, pushing, elbowing and free style wrestling is always found amonst boarders which is due to their active minds. Boarders are much more active and frank with one another than day scholars.

In a hostel every student is all in all. He manages his own household in his allotted room. He keeps it clean and tidy, arranges all its inner economy in a good manner. He does not worry about money.

male and female live together. Thus the biological group also becomes an economic group. Family has a very intimate character, and its members are bound by a natural affection. Thus it is also a social group. In the same way, the family is a biological, economic and social group.

The family educates its members, helps them to enoy their leisure, and controls their choice of profession. It is within the family that the child acquires his or her likes and dislikes, his or her hates and loves. It is the family which teaches him or her what good to seek, what pleasure to enjoy, what career to adopt. It is within the family that he or she learns the meaning of co-operation and self-control, of sympathy and loyalty. The family is also the administrative unit of human society. The eldest member is generally the leader and the guide and all members obey his will. They also obey the unwritten rules of conduct and keep up the traditions, customs and usages of the home.

The family is therefore, called the cradle of civic virtues. The parents practise the virtues of self-control and selflessness. Children develop their sense of discipline and self-restraint. Thus the family is a school of discipline, it is a state in miniature.

Family is the Primary School of Social Virtues

Pir Bakhsh Durrani, B.A. (Part I)

Human society comprises of innumerable social groups and institutions. But the most common, universal and important of them all is the family. The whole society is divided into families. There is no individual who is not a membr of a family. Every one is born in a family, grows up and lives, and ultimately dies in the family. This is the universal feature of human society, which makes the family its basic unit. Family is based on socially recognised sex relations between a man and a woman. Its important function is to provide parental protection and care for the children and young folk who could not live and survive without it.

Furthermore, family is one of the most important functional units of the society. Almost all important functions and works are carried on within the sphere of the family life. Family has been in the past and even today an economic unit of society. Many families have their property and interests, such as land, shops, factories and private institutions. Thus from the point of view of its universality, the imortance of its social functions and the hisotical and social role it has played in the evolution and survical of human life and society is quite rightly considered the basic unit of human society.

Family is indeed one of the greatest educational institutions. By education we do not mean here a mere teaching of the three R's, but the development of one's mind, character and personality so as to make him or her an active, intelligent and good citizen and social being.

Understood in this sense, there is no other social institution which educates, trains and disciplines the mind, character and body of the human beings as the family does. Many a great man or woman has been great because his or her father or mother had inspired him or her with some great ambition or interest.

Marriage, which is a more or less permanent union of the sexes, has its chief basis in the needs of the child. The child has a long period of immaturity and helplessness and requires long parental care. The

The most important service of Abu Bakr to Islam was the composition of the Holy Quran. Second credit goes to him on account of his nomination of Hazrat Umar for the second caliphate. Had he not nominated him, Islam would be on the mercy of the different half-Muslim tribes who would have brought many changes in the pure religion of Islam. It was Umar's hard temper which made Islam stand firm and progress day by day than fall back. Had Abu Bakr not nominated Umar for the caliphate the condition of the country would be the same as was in the caliphate of Uthman, due to his leniency which is a political crime. And when people objected to the act proving Umar a hard-tempered one, he returned that he will not be so, as he is at present, when responsibilities be put upon him.

Some people think that Abu Bakr's brief caliphate did not allow him to prove himself a good administrator. But we can judge that hardly a man could do as much as Abu Bakr has served for Islam in so brief a period. So it was due to the righteousness, strong faith, quick mind, fearless nature and love for God and the Prophet which enabled his name to be written in golden words.

answered the unruly Arabs boldly. It was Abu Bakr who used to read the Holy Quran so loudly that many of the enemies of Islam became its friends. When enemies objected and told Abu Bakr not to do so Abu Bakr answered that "as long as my soul is in my body, I will do so. My enemies may kill me, I do not care but I will not change my mind."

Abu Bakr was chosen by the Prophet (Peace be upon him) to lead the prayer, out of so many learned and pious muslims. The Prophet did not name a prticular person to become the Caliph after his death but it seems that when the Propet ordered him to read the prayer at the time of his illness, it was a kind of favour to him. So the Muslims understood this secret and after the death of Mohammad (Peace be upon him) the Muslims chose him for the caliphate unopposed.

Abu Bakr, after becoming the caliph had to face great many difficulties. The immediate case was of Usama Bin Zaid, a young commander, ordered by the Holy Prophet to conquer Rome. The people objected but Abu Bakr's answer was "I cannot change what the Prophet has ordered." And at last Usama's army returned with success. The second case was of the false prophets but Abu Bark was not such a person to be taken over by surprise and he crushed them with an iron hand. It was in Abu Bakr's brief caliphate that Syria and Persia were conquered, the unruly states in which caste system had prevailed and cruelty had become their custom.

The Jews and christians who had no strong faith in Islam waited for the day when Prophet Mohammad (Peace be upon him) would be transferred to the other world. So as soon as they heard about the death of Mohammad, they thought themselves free and congratulated one another. But their joy was changed into gloom when they saw that after the Prophet now his assistant will work. As they heard Abu Bakr saying "O, Muslims, if you worshipped Mohammad, then you are free because he is gone and if you worship God, then He is still present. Mohammad was the Prophet and I am his assistant - I will be bound to the same rules as Mohammad (Peace be on him) was. Some tribes, knowing that they will not be spared, made the excuse that "Poor tax" should be exempted." Even Umar requested Abu Bakr that the exemption may be given. But Abu Bakr did not agree with the exemption of even a rope also which would be included in Poor tax.

So in these troublesome conditions it was Abu Bakr who, after the death of the Prophet (Peace be on him) did not allow the religion (Islam) and country to go to pieces. It was his great service to Islam, after the Prophet's death by which he made the religion stand firm, otherwise only God knows what would have been the condition of Islam.

Siddiq-e-Akbar

Azizullah Afghani, B.A. (Final)

"If I wanted some one to be friend after God,
it would be Abu Bakr". (The Prophet).

Islam was accepted by thousands of people at the time of Mohammad, but among them favour goes to the first four converts among whom Abu Bakr was one.

Before accepting the invitation of Islam, Abu-Bakr had only mere relation with Mohammad (Peace be on him) and not so a deep friendship as he had after becoming Muslim. Some historians say that he had a deep friendship with the Prophet before Islam also but it is not favourable because Mohammad had the habit to go to the "Cave of Hira" from the very beginning of his youth and did not take interest in meeting the people. So it shows that Abu Bakr became a devoted friend of the Prophet after coming into the circle of Islam.

The history of Islam begins from the difficult situation which the Prophet had to face with a few devoted followers and was forced by the unruly and stone-hearted Arabs to leave Mecca for Medina. It is practically very difficult for a person to leave his birth country, cross burning deserts and join unfamiliar people. We see that here only Abu Bakr accompanied him, not caring for his relatives, agreed to face all trouble from the cruel hands of the Meccans, with the Prophet. Who accompanied the Prophet while taking shelter in the Cave of Thour? It was only Abu Bakr.

After all Abu Bakr was the only person who sacrificed his life, property and honour for the Right way of Islam and for the true friendship of the Prophet. Abu Bakr took sword against every enemy of Islam, even his own relatives. It was nothing but his strong faith in Islam for which Prophet Mohammad chose him for his companion in every difficult moment. It was due to his devotion to Islam for which the Prophet chose him to lead the prayers in his illness.

No doubt Abu Bakr was more pious secretly than he seemingly was. Abu Bakr was not afraid of the majority of Meccans and had

Apt Quotations

Collected by Abul Qasim, B.A. (Final)

LOVE

1. The sweetest joy, the wildest woe is love.

2. Love in France is a comedy; in England a tragedy; in Italy an opera seria; and in Germany a onelordrama (Marguerite Polessington).

3. The first sigh of love is the last of wisdom. (Antoine Bret).

4. Of all the girls that are so smart,
There's none like pretty Sally;
She is the darling of my heart,
And lives in our alley. (Henry Carey - Sally in our Alley).

5. Man begins loving love and ends by loving a woman. Woman begins by loving a man and ends by loving love.
(Reny DeGourmont).

MAN

1. Let each man think himself an act of God.
His mind a thought, his life a breath of God. (Bailey - Festus.)

2. Man is the only animal that laughs and weeps; for he is the only animal that is struck with the difference between what things are, and what they ought to be. (Hazlith).

WOMAN

1. You see, dear, it is not true that woman was made from man's rib; she was really made from his funny bone. (Barrie-What Every Woman knows).

2. There is no worse evil than a bad woman; and nothing has ever been produced better than a good one. (Euripides).

3. O wild, dark flower of woman,
Deep rose of my desire,
An Eastern wizard made you
Of earth and stars and fire. (G.G.D. Roberts - The rose of)

tracks of land among tenants will result in more and more fragmentation of holding, which results in decrease in total output. But it is not so, the decrease or increase of production is influenced not by the big size of holding but by the method of cultivation. Moreover such dangers have already been prevented by limiting the division of lands to the size of subsistence and economic holdings.

Hence the system of land reforms is concrete, real and authentic, in conformity with the democratic ideas, and applicable to the growing modern needs of the country. Not only this much but it is also accepted by all people with national priority and is definitely to thrive in the long run.

of tenure. During the event of ejectment according to the process of law, they will be given a fair compensation for the improvement of land and the disturbance of possession. The land-lords do not enjoy any authority for the imposition of any type of tax or take any kind of service from the tenants.

The progressive fragmentation and sub-division of holdings has been disallowed and no body can retain a piece of land of economic holding which comprises an area of 12½ to 16 acres or an area 50 to 64 acres of land which makes an economics holding. In order to consolidate the holding immediate steps will be taken which will involve the compulsory consolidation of fragmented land.

The introduction of land reforms in the province will exert great influence over the social, political and economic life of the people. The land lords have been completely deprived of the illegal power with which they used to rule over the poor tenants because of their political influence. Prior to this scheme land lords dominated the politics of the country and the future of democracy was unsafe in the country. But now tenants are free to elect their true representative.

The land reforms will definitely raise the total production of the country, provide the security of tenure to the tenants, in this way they will enjoy better living stanaards. The education will also spread among the tillers. Moreover the system will give them freedom from the slavery of the land lords and will give them all opportunities for leading a full and secure life.

The abolition of jagirs without compensation is the most radical part of the scheme. Because the jagirdars did not pay any tax or revenue to the government except water rates. The land resumed under such law will provide additional land to the government which will be distributed among the edserving tillers.

The system is not so cruel that it will convert the land lords into mere tiller. They will still be among the richest in the country. A piece of ıand of 500 acres will give them an income of about 20,000 per annum.

The increase in the tenants' income will also raise their living standard in this way. The demand for industrial goods will also increase which will result in the establishment of more industries in the country.

The objection raised against this system is that distribution of big

Land Reforms in West Pakistan (1963)

Abul Qasim, B.A. (Final)

The system of land reforms envisages the removal of unsatisfactory situations which exist in man's use, ownership and occupancy of land with a view to greater productivity, higher living standards and improved social status and better opportunities for those engaged in cultivation. Before the introduction of Martial law regime majority of the land owned by the samll numbers of land-lords who had little or no interest in agriculture, in other words there existed absentee-land-lordism in the country. Moreover the security of land tenure was also uncertain. Tenants possessed low bargaining power due to the shortage of land, which resulted in the unemployment and under-employment of the vast rural labour force. The situation went on more serious due to the small holdings and progressive sub-division and fragmentation. Large pieces of land were left uncultivated by the land lords due to the lack of interest in agriculture.

In order to come out of this hopeless situation the Martial Law Regulation No. 64 introduced well-conceived and concrete scheme of Land Reforms in 1959. The owners of the land were restricted to retain only 500 acres of irrigated land or 1000 acres unirrigated or they can retain 36000 produce index units which comes to be more than 500 acres irrigated land and 1000 unirrigated land in some areas. Moreover they can also retain 150 acres under the orchards, as an additional area providing the area in the block of not less than 10 acres. He can also give some area as a gift to any body which equals to 12 produce index units. The rest of the land will be resumed by the government for the re-distribution among the tenants and deserving claimants. The tenants who were already cultivating the resumed land, will be made full owners and they will make the payment in a period of 25 years in 1/2 yearly instalments. It is all to eliminate the displacement of tenants and disruption of production. The affected land lords will receive fair compensation in the form of bonds redeemable in 25 years. The nature of the bonds will be that it is transferable but not negotiable to avoid an increase in the danger of inflation. from the country. All the bonds will carry 4 % rate of interest per annum. The jagirdars will not be paid any compensation.

The tenants throughout the wing will be entitled to the security

they have remained unchanged. War has always been the result of reason and has meant always killing. No weapons have been made, that can make it worst or best. Scientific weapons are not developed to destroy only but by the same inventions construction is also achieved.

Against the number of lives destroyed by weapons resulting from scientific inventions and discoveries, we have a great number saved by their aid. I agree to the people's views as to how much better it would be for the lives of one nation without the destruction of another. The use to which inventions of scientists are put, depends upon the human thought and not upon the scientist. War is not something glorious and (neither it has proved before) its responsibility cannot be put upon the scientists as a whole. It also may seem contradictory but it is true that science saves lives in battle too, as it saves in peace time. And when it is said that modern inventions of weapons have caused the death of the person not engaged in war, the answer is that in war time it is logically right because children will also grow and take part in war and women will also give birth to more men. So they also should not be exempted.

Lastly I will say that it is neither money nor scientific inventions which cause a war but it is only the human morale and their jealous nature which takes the serious action of war. Science does more useful work than the destruction of Man. Science improves the standard of living for a man and does not set fire to his home.

War for a reasonable man might seem generally impossible because it solves no problem. In old times people thought 'war as a court of appeal but now it is rejected because 'every war to end war' has proved merely to be the cause of yet another war. It is right that in a state inequality of man will be the immediate cause of war; but by fighting they will be degraded more than that.

What made science responsible for war is to make it effective for every one in modern age. Science has not made war an occupation for a small percentage of the population (Armed forces) but has only enlisted every ordinary person (civilian) to be affected by war. And not only this but in modern 'days of specialized commerce', war affects not only the country which is engaged in it but also those countries which are out of the blame of war.

The charge against modern science is sometimes that it has made possible the most horrible kind of warfare which is chemical warfare. The charge against it is that it has made the war more savage and the death more horrible and quick. But chemical warfare is no more barbarous than that of any other kind. It is also useless to say that killing in one way of man is excellent and killing him in another or with a larger gun is barbarous. Science has only made the death of a person quick but I do not believe that man would like to be killed with sword than hanging; which we think of as the quickest death. It is true that modern war results in more deaths of men daily than the daily stabbing of Crimean War did. But it must not be over-looked that average and total of that war would be the same as will be the total of modern war, which will only take fewer days. It is this because modern war cannot be fought for years; it will bring the so-called victory of one nation only in a few numbered days.

The assertion of some narrow-minded people that scientists should be put to death first and the name of war will be no more, is also useless. I do not think that newly invented 'gas' will result in the death of men more horribly than the death by explosives or cold steels. The critics, who think modern war has been brought by science, do not know the fact that modern bombardment is no greater than setting fire to a captured town which was the custom of ancient war-fighters, to slaughter the male civilians and children and rape the women.

The modern type of weapons can also be used in two ways, as I have given above the example of a knife to be used in both senses. Modern aeroplanes present more convenient methods of transport; the aeroplane helps by travel, and thus shows the effects of intermarriage to bring peace. We can observe the fact that the more the things are changed, the more

you use it for eating or for thrusting into someone's body. It may be true that science has made death quick but is not the beginner of the crime.

Still science has an effect which is always overlooked. It puts the 'little man' on the same footing as the 'he man'. A child can squeeze the trigger of a revolver and the bullet kills the strong man as effectively as the weakling. Science brains and braves rarely go together. The evolution of Man as a thinking animal has been accomplished by sacrificing his strength. It is meant that in the long run victory has gone to the more intelligent people because modern war calls for intelligence much more than physical strength. The qualities of intelligence or morale are much more likely to be found in a country where people are allowed to develop their minds than physical strength.

There is a tendency to consider that our normal state is peace and war is incidental, an abnormality occuring between intervals of peace. But the fact is revealed by history which proves that in one thousand years only 90 years have been of peace. It shows that from the dawn of civilization war has been the normal condition of mankind. It has been proved that fighting is of course the normal characteristic of animal of which we are also a part. We know that a simplest cell destroys others for the struggle of existence and a lion can become the king of the forest only by tearing them and squeezing their blood and proves that life is a struggle. The idea of some of the modern warlike countries is the survival of the fittest which also is the law of Nature and so they also abide by that rule. But by survival of the fittest they donot mean the survival of the strong body but the development of protective and offensive weapons, and so increase them day by day.

Once a man's body was a fighting machine and his mind was for tactics in war and supply of food. But they said to each other "look here it is fooish to waste our energy fighting each other when there are so many other things to do. Let us agree to live together and observe certain rules. If you have a dispute with me I will not try to kill you but we will go before a jury of some appointed men who will settle the case peacefully and we will both abide by their decision". So man released from the necessity of constantly on his guard against attack and having to fight even for the mere "Right to live", began to develop other useful things than war. But change in human nature is a difficult task and a thousand years is an absurdly short time for it. If scientists had to deal with animals instead of human beings, they would, no doubt, cross various strains selected for their pacific characteristics and produce a race to whom war would be quite revolting. But we lose this opportunity.

Science and War

Azizullah Afghani, B.A. (Final)

The burning question of today is the problem of disarmament. It has been proved that Armament is only to destroy under-developed countries and dis-armament is tne only way to discourage that serious action. But still most of the countires boast of their armament and think it the only way of defence. But what is the part of Science in it?

The introduction of what may be called "scientific weapons of war" has completely changed the attitude of the people towards war itself, which is the favourite occupation of Man for thousands of years. We now realise fully that if we enter any war, all of us, from a baby to the oldest person, is a combatant of war for twenty four hours. It is said, although an exaggeration, that soldier and sailors would be safer than civilians. It will be, I think, wrong for a man to think that our Army will keep all comers from outside and that in the event of war we can continue to live quietly in town or country with comfort, untroubled except by the distant boom of guns. Today's war takes all flesh and blood in its lap and no one is excused, as the case of Man's barbarism was.

With one hundredth the sum we are spending on preparing to destroy, we might have to find and cure rather save thousands of lives a year. We might have spent the money on the preservation of man. But the fact is that no one nation seems ready to do so and have decided to spend the money otherwise. This is not a temporary phase of a nation but the permanent policy of all. At no time in the history has the amount expended by governments on scientific research, for the purpose of reducing pain, equalled that poured out on equipment for destruction. It has always been easier to raise money for guns than hospitals. But what is scientific research? Now again difference of opinion appears. Some take science responsible for encouraging war and others say that it is used for only defence. But I think no such great responsibility of war should be put on science. The study of history makes us know that before scientific experiences, Man has fought with spears and bows made of bones of animals before science's coming on to the stage. The nature of Man is fight-loving and it is Man's nature and not science, responsible for war. A knife was invented by science, now that is your nature if

amongst nomads in favour of a simple code that was based on the relationship between individual man and the powers of morality and personal behaviour.

This brings us to the idea of close individual relationship to God. It is quite significant that from nomadic peoples have come to the belief in personal revelation of the deity. The prophets of the old testament, Moses, Jesus Christ and Mohammad (Peace be upon Him) all proclamied the doctrine of divine revelation through man himself.

Finally there wouıd seem to be some connection between the religious beliefs of the Pastoral peoples and the idea of a single Goɑ. The influences tending to reduce the number of gods in nomadic societies has already been touched upon. There remains the historical facts that practically all of the great monotheistic religions of the world seem to have risen on the margin of the great deserts of Eurasia, where pastoral people came into contact with the polytheism of settled areas, Zoroastrianism, judaism, Budhism, Christianity and Islam, at once the highest developed of all religious systems of the world, share one common feature the fact of origin under closely similar geographic environment.

dance of animals for prey is now made much less desirable and instead importance centres on the fertility of the soil. Favourable wind, and temperature conditions, and rain fall at the due season, are essential to agriculture and are hence matters over which man might attempt to increase control by means of prayer and sacrifice.

It is also interesting to note that whereas primitive man tended to ascribe to his duties animal form, amongst agricultural peoples divinities took on human attributes. This evolution is well seen in the religion of ancient Egypt.

Another feature was the growth of moral and ethical ideas. Animistic religion is in effect wholly self-seeking. When the agriculture settlements began along the banks of the rivers and in fertile valleys the conception of man's obligation as a membr of a community arose. If, therefore, a man has a duty to his neighbour some sort of confusion becomes necessary. We thus arrive at the judgement of souls after death, by which good is rewarded and evil is punished. Such a development in ethical ideas occured in Egyptian religion as early as 3,000 B.C.

Vegetational growth is influenced by many factors, a large proportion of which are purely local in origin. Moreover agriculture communities tend to live in small scattered groups rather than large agglomerations because of the necessity of being close in contact with the fields. The duties of agricultural communities tend to be numerous, as reflecting the varied natural forces that effect the growth of crops; and because of small local differences in environment, the relative importance of each natural force and therefore of each duty, varies from place to place, with different means for each diety. Rain, sunshine and wind gods, river dieties in places where the rainfall might be deficient, an even spirits or nymphs associated with particular features, all come to be regarded as having special attributes and powers as members of a vast divine community that exerts control over man's activities on earth. In those very resons, the life giving rays of the morning sun, the snow clad peaks of Himalayas, the clear waters of the Ganges and the Milk yielding cow, all form important deities of worship in Hinduism.

Among pastoral communities fertility is much less important. The nomadic way of life involving extensive journeys from one region to another, also involved a certain acquaintance with many types of environments and many ways of life. Until the settled cultivators whose activities were influenced by local factors and whose view of war often sharply circumscribed the nomads tended to develop a broader outlook and a wider conception of the world. Hence the elaborate divine community of agricultural societies, with its emphasis on fertility, was rejected

Geography Behind Religion

Saifur Rahman Ghaznavi, B.A. (Part II)

The study of inter-relationship and inter-action of man and his environment is the special field of Geography. Not only the actions of man but even his thinking has been influenced by the factors of Physical Geography. How far the religious beliefs have responded to such an influence may some what be open to arguments. Yet a clear study would reveal that every religion at least has been modified by its physical surroundings especially those of its birth place. Moreover the religious beliefs and practice show stages of evaluation, paralleling the grades of social development in human societies. In order to understand the part played by geographic determination it seems proper to define religion and then establish their mutual inter-relationship.

Religion may be defined as the awareness by man of the existence of forces which are outside his own control. In the view of Dr. Maret, religion is an effort to face a crises whenever man feels that he is likely to suffer he tries to control and influence outside forces in an attempt to achieve a result favourable to himself. This feature of the human race has been very conspicuous at all stages of development. From this it is therefore possible to co-relate the religious practices down the ages with the physical environment of various societies.

Amongst communities at a low level of civilisation, religion has a correspondingly simple form as culture develops. Spiritual beliefs assume an increasingly complex and mature pattern. Among the most primitive peoples, religion is probably most frequently concerned with efforts to ensure a plentiful supply of animals for prey. In this way there develops in the mind of the savage a certain connection between animals and a number of unseen but powerful forces of which the animals tend to be regarded as a living embodiment. Such ideas are termed ANIMISTIC. By a process of extension not merely animals but also trees, rocks and other natural features may come to be regarded as in some way linked to the unseen powers of the world.

In societies at a higher level of development agriculture may replace hunting as a means of livelihood. Man is still concerned to invoke the forces of nature in order to increase his food supply but abun-

Their language was highly stilted. They dealt with nature but used it as a back ground behind the description of human problems. The main feature of their work was the prevailing objective tone. They were the neo-classicists and imitators of old Latin masters. They described sometimes the lines of shepherds and shepherdesses but actually they had a contempt for the mean and vulgar nature of man. Beauty in their works was in their form and the skilful, though artificial use of language.

But this kind of thing could not lastlong even during the hey-days of Pope's fame. Men like Thompson, Blake and Gray had come to the forefront with their works which indicated un-easyness with subjects of intellect and sheer artificiality.

But the real revolt against the classical trend was launched by Wordsworth and Coleridge when they published their lyrical Ballads in 1798. It was definite shift from the poetry of intellect to that of imagination and feelings. They along with their long tail of followers like Keats and Shelly crossed all boundries of classical form and pattern and substituted their own uneasy and unstable lyrical devices, which were changed and modified according to the nature of subjects.

Their fiction became simple and more direct. They turned the old Spenserian stanza and achieved smoothness, lucidity and flow. The range of their outlook broadened from the man in the drawing room and they descended to the uncouth rustic. They filled with wonder and glory the meanest and the commonest objects. They found dignity in an unlettered farmer and shepherd, wisdon and glory in a child and all prevading splendour and communicative power in Nature. They treated nature not as a back ground but found in it some everlasting intrinsic beauty and worth. They even went so far as to discover some mystical and mysterious significance in natural objects. In this respect Wordsworth was their leader.

Actually all this change was a revival of the previous Romanticism which was ushered in by the University wits and specially men like Shakespeare. Just as the previous was in spirit the liberty of thought and action subsequently of the Renaissance and Reformation, similarly its revival was instigated in the field of politics by the French revolution, and the in economics of society by the Industrial revolution and in the field of Philosophy and thought by the Philosophy of Kant and Hegal. It was a triumph of self and individual instincts over the interest of the Community. In classicism the beauty was in form but in Romanticism it was the addition of curiosity, wonder and mystery.

Classicism and Romanticism

Mahfoozur Rauf, B.A. (Final)

Usually the term classicism and romanticims is used in such a way that it inevitably carries the impression that there had been two widely distinct epochs in the history of English literature and that classicims came earlier than Romanticism. As a matter of fact it was one of the result of Renaissance and Reformation that the European mind broke away from all restraints imposed upon it by scholastic literacy modes and the feudal despotism. In literature during the reign of Queen Elizabeth I University wits revolted against the blind tendencies to copy old classicism and classical models of great Greek and Roman masters like Homer, Theocrites and Virgil. They composed their works without admiring any set body of rules. They blended comic scenes with the general dramas of tragedy. They violated the misunderstood unities of time, place, Theme and Action. They were not just experimentalists, they defended their unique course of action by pleading that life was such. They operated skilfully on the various and accountable fluctuations of mind and the tumult of human heart.

This whole reign of revolt and lawless literature pervaded for about a whole century. But gradually the enthusiasm and zeal subsided. The age of reason dawned with the opening of eighteenth century. It was an age of controverssy in almost all fields of life. The dominant features of this age of English literature are the realism, satire and solution of all problems through practical wisdom and common sense. The creative mind changed into critical and analytical one. Novelists like Richardson Fielding Defoe and Swift and in poetry Pope and Dryden flourished. They were disillusioned by various degrees. They pleaded the employment of form, pattern and method in the composition.

They held imagination and fancy in utter distrust. Their range of outlook was limited to men and only men of drawing rooms and coffee houses. They claimed to follow ancient Latin masters who had flourished in the reign of Augustans. This age is called the Augustan age of English literature or the Classical period or epoch of reason and common sense. In distinction they used long herioc couplets and occasional octasyllibic lines.

his poem "Javed Nama" Iqbal has clearly distinguished between the good and evil of communism:

صاحب سرمایه از لسل خلیل   یعنی آن پیغمبرے جبریل
زانکه حق درباطل او مخبر است   قلب او مومن دماغش کافرست
دیں آں پیغمبر حق ناشناس   بر مساوات شکم دارد اساس
تاالخوت رامقام الدر دل است   بیخ او دردل نه‌درآب و عمل است

In Javed Nama a message is delivered by Jamal-ud-Din Afghani to his nation. In this message Iqbal has vividly given the comparison and contrast of communism with Islam. Jamalud Din Afghani says that you have done your destructive work but the positive and constructive task can only be completed by Islam. Here again he says that you have broken the pride of Kaisar and yourself got their place when you came onto the throne. Be careful not to lose your senses so as not to bring again the reign of tyranny and cruelty:

کهنه شد افرنگ را آئین و دین   سوئے آن دیر کهن دیگر بین

Again, another important point is put forward by Iqbal when he gives us another lesson from the Holy Quran, that is the lesson of both Fikr and Zikr. Fikr means thinking by which we solve certain problems of mankind, while Zikr means the belief and worship of God which gives us spiritual satisfaction:

فقر قرآں اختلاط ذکر و فکر   فکر را کامل ندیدم جز بذکر
ذکربرذوق و مشرق را دادن ادب   کار جان است این نه کار کام و لب

Again, Jamaluddin Afghani addresses his nation, saying "take care not to form again the same classes and grouping which essentially kills the nation". This is again Quranic lesson. How does this masterly class of Bourgeois come out. This is due to holding wealth or simply we may say "capitalism", for which Islam has got no place - Islam has even prohibited interest and other unfair means of collecting wealth. Islam thinks whealth or money or land to be a trust and not as one's belongings. Rules of Heritage and Zakat (poor tax) did not allow wealth to be in few hands. The people who plough the land have its wealth.

After all Iqbal has sketched both communism and Islam both in comparison and contrast and the conclusion that we get is that if communism is joined by not only (لا) but with that (الا) also, it will become world's foremost Revolutionary force and the class struggle will end.

Iqbal, as a Muslim socialist has given a vivid picture of what it is, and what it should be. That is why we pay great tributes to him.

چیست قرآں خواجه را پیغام مرگ   دستگیر بنده بے ساز و برگ

Students' Union, Govt. College Peshawar—1962-63



Sitting: L to R Javed Sherwani F. Sc., II Year (Secretary), Abdul Wahid B.Sc. Part I (Vice-President), Mr. Abdul Hamid But (Director of Education, Peshawar), Abdul Hamid Afridi, B. A. Part II (President), Mr. Mohammad Ismail Sethi (Principal) Patron, Mr. S. B. Awan (Director), Habibul Haque (Joint Secretary).

Standing:

Class Representatives— Safdar Khan B. A Part II, Murad Ali B. A. Part I, Qirat Zaman II Year, Zafar I Year.

After all Iqbal is happy with the communists' steps against wealth, Government and Church. Main theory of Russian Government was elimination of capitalism and their view that what is needed should be kept and the remaining should be served in the constructive work of nation.

The same thing Iqbal preaches and the same is preached by Mohammad the Prophet (Peace be on Him) in two words from the Holy Quran (قل العفو). The money left behind may be given to the needy people. Roomi gives the same Islamic view in a beautiful Allegory:

مال را گربهر دین باشی حمول — نعم مال "صالح" گفتا رسول
آب در کشتی هلاک کشتی است — زیر کشتی بهر پشتی است

Again Iqbal syas in Zarbe Kaleem some verses under the title and about the title of communism:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمئی رفتار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار
جو صرف "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

Then Karl Marx came. He also wanted the end of conservative ideas. Iqbal had the same idea about destruction. But so far as construction is concerned both had different views. Iqbal was not determined to be a stand point in the way of spiritual progress. Iqbal further says that the work (end of Church Rule) which should have been done by Muslims was done by pagons in Russia:

ہوئے ہیں کسر چلیپا کے واسطے مامور
وہی کہ حفظ چلیپا کو جانتے تھے نجات
یہ وحی دہریت روس پہ ہوئی نازل
کہ توڑ ڈال کلیساؤں کے لات و منات

To Iqbal communism was a mixture of Good and evil, its attractive and helpful side has truth in it. The distribution of food justly in accordance with Religion. As it is said before, Iqbal praises communism as it has got certain Rights for the proletariat class, but with that his saying was that life cannot be complete without spiritual satisfaction. In

Another poem of Iqbal is "God's command to Angels" may be called a communist manifesto. Iqbaı believed in the social sides of communism excepting the wrong view in the minds of mankind that life can only prosper when the division of matter is equal and just. Iqbal says that without spiritual advancement it is of no use. Dictatorship and capitalism has made the men like animals. Communism has done something constructive but on the other hand it did something destructive also. It crushed spiritual entertainment - the way to spiritual progress. Iqbal's view was that if communism had not ignored God and spirit it would have been then according to the rules of Islam. In communism man is persuading man and there is no concern of God, but God is the main point in Islam. The communists ignore God because they think that the name of God is only used by those people who are bent on destroying mankind.

In the poem mentioned above Iqbal reveals Angel to be commanded by God to take this message to Muslims, the message which is a part of Islamic Revolution of which Iqbal was hopeful. God's message is:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخ امرا کے در و دیوار ھلا دو
سلطانئی جمہور کا آتا ھے زمانہ — جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹادو
جس کھیت سے دھقان کو میسر نہ ھو روٹی — اس کھیت کے ھر گوشہ گندم کو جلادو
کیوں خالق ومخلوق میں حائل رھیں پردے — پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
تہذیب نوی کار گر شیشہ گری ھے — آداب جنون شاعر مشرق کو سکھادو

After all that Lenin did, was to Iqbal, a good thankful and progressive step - for the benefit of mankind. If the communism had taken only one step from (لا) to (الا) it would have shown wonders in the world. They believed in (لا) but not in (الا). This ıs hoped to be done in future. Iqbal is sorry that the real spırit of progress, i.e. monotheism and spirit, are missing in the teachings of communism.

Russian Revolution is the objective of Iqbal also but this movement should start under the banner of Islam. Iqbal does not praise Western culture but he praises socialism. His ruling in this matter was that Muslims cannot come in line with westerns but they can deal with socialism with a little bit of change in view. Westerns worshipped wealth but communists did not. So, Iqbal says tht if you did not take step from Negativism to positivism, this whole work of construction will change into destruction. In "Zarbe Kaleem" these verses are given about Negativism and positivism:

'لا' کے دریا میں نہاں موتی ھے 'الا اللہ' کا

After this conversation there comes conversation between Lenin and Kaiser William. Lenin argues that the humanity in this world has been crushed by two forces, by Dictatorial powers on the one hand and by the Church on the other. When after all it did not stop, the proletariat class got up under the motive of (تنگ آمد بجنگ آمد) and burnt both church state and kingship. Kaisar William differs from him, while saying that this is all due to psychology and nature of the people that they obey their heads. He further says that the people whom you think to have got power of all kinds, again will be divided into classes. If there is no kingship it does not matter. As Napoleon had once said that French Revolution will end Jagirdari system but its place will be taken by capitalists and industrialists bourgeois classes.

Iqbal says that the capitalists have gathered all the wealth and have betrayed the poor labourer by saying that the heavenly wealth and celestial satisfactions are left to you which you can enjoy very comfortably.

After that there is another poem " " the cries of labourer. In it labourer says that the Ruby and precious stones found with Bourgeois class is our blood. Labourers get up to rely on yourselves and to exert yourselves:

ز خون فشانئی من لعل خاتم والی — ز اشک کودک من گوهر مقام امیر
ز خون من چو زلو فربهی کلیسا را — بزور بازوئے من دست سلطنت همه گیر

Another important problem is that of land ownership. Iqbal, whom we should call a Muslim socialist, has the same opinion on this view with communists ana socialists that the earth is created by God, its position is like that of water and dust on which no one has got personal claim. This is correct that the earth does not grow anything but with the hard work of men. But in this case only he should get benefit out of it who ploughs and waters the earth. An absent master does not do anything, then how can be ask for any right when he has been sitting idle without doing anything. He does not deserve that. Quran says, (الارض لله) Earth is of God, then it cannot be the property of any person because there again Quran says (الله مافی السموت والارض) Every thing contained in earth and heaven is God's. But to prove the right of labourers we again get lessons from Quran which says, (لیس للانسان الا ما سعا) the world is his who exerts himself, and not the one who sits idle.

Here again Iqbal view is that land is the national property, Government can demand revenue on it but no idle master can demand any right on that land.

Iqbal and Socialism

Mohammad Iqbal, B.A. Final

In the eighteenth century an age of enlightenment began in which an attempt was made to explain Religion, Philosophy, Politics and Sociology with due freedom. Grotires, Voltaire, Rousseam, Hume and Kant's efforts were the result of basic and fundamental rights to human beings. After French Revolution people thought that they will get rid of cruel dictators, capitalists and jagirdars. They thought that they would get rid of the church rule. The place of Jagirdars was occupied by industrialists and capitalists one after another. Labourers (including children and women) had to work for consecutive sixteen hours. Karl Marx came over the scene and he preached from his book "Das capital". His main theory was that the wealth will be confined to fewer and fewer heads, the proletariat class will at last revolt and take over the power.

Until Iqbal was in Europe, the communists had gaind no truimph any where. Their first truimph was in Russia under the leadership of Lenin. Politicians and thinkers were obliged to think over this new experiment and to give their own ruling.

Iqbal was no exception to these circumstances. Iqbal argued about this new experiment in his poetry "Payame Mashriq" as his mode of mind was also revolutionary. The first poem given in it is by the title (محاورہ مابین حکیم فرانسوی آگنس کومٹ و مرد مزدور) Comte was the contemporary of John Stewart, Herbert Spenser and Darwin and his philosophy is called positivism. He says the same thing as the great philosopher Saadi Sheerazi says:

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند — ھماں نخل را شاخ و برگ وبراند

But the labourer does not believe in him as he syas:

فریبی بحکمت مرا اے حکیم — کہ نتواں شکست ایں طلسم قدیم
مس خام را از زر الدودۂ — مرا خوئے تسلیم فرمودۂ

Labourer in his own defence says to Comte "Do not deceive us under the disguise of your friendship to us". Labourer is sorry knowing the fact that Comte is presenting those thieves to be the honest people. These capitalists who have no work but to sit idle eat and drink freely therefore they are thieves and great burden of the earth.

Literacy and Education

In 1951 cansus literacy was defined as ability to read any language in clear print, according to this definition all those persons who can read Holy Quran have been treated as literate. But in 1961 the definition was changed and a literate was one who could read with understanding a short statement on every day life in any language. According to this new definition 14.3 million persons were round literate in the country. Thus the average of literacy was about 15.9% of the total population and approximately 19.2% of the population aged 5 years and over.

These literate persons include those who had already completed education and those who were still attending educational institutions at the time of Census. The following table shows the percentage distribution of the literate by educational level:

PERCENTAGE DISTRIBUTION OF THE LITERATES BY EDUCATIONAL LEVELS

TABLE 10

Educational Level		*Percentage*
Total literates 100.00	..	
Without formal education	..	14.1
Primary standards	..	57.4
Middle & Secondary standards		21.5
Matriculation	..	5.1
Intermediate	..	1.1
Degree	..	0.6
Higher Degree	..	0.2
Oriental	..	0.03

Thus it is clear from the above table that the majority of our literates are without formal education, or up to primary and middle schools standards. About 5 percent of the total literates are matriculate, about one percent are intermediate. The percentage of Degree holders is only 0.6 of the total literates in Pakistan.

In this short talk it is not possible for me to discuss in details all the demographic aspects of Pakistan Demography is a wide subject and to be studied from different point of views. I hope the young members of your association will study these problems in details and also conduct some socio-economic survey in your own villages or in your wards to have some practical knowledge of this interesting subject, under the guidance of your learned principal and esteemed staff members.

and economic problems. The following table shows the percentage of total population by broad age-groups.

PERCENTAGE OF POPULATION BY BROAD AND AGE GROUPS

Age Group Total (both sexes)	*Percentage*
0 - 9 years	100.00
10 - 19 years	28.36
20 - 24 years	25.07
25 - 44 years	8.21
45 - 59 years	23.81
45 - 59 years	9.58
60 and over	4.97

A glance at the above figures reveals the effect of uncontrolled population growth in a country where infant mortality has been reduced considerably in recent years. The effect is clearly visible in age group of 0.9. At the 1961 census there were 31.7 million children under 10 years of age in some relected countries of the world.

TABLE 8

COMPARATIVE PERCENTAGE OF CHILDREN UNDER 10 YEARS OF AGE TO TOTAL POPULATION

Country	*Percentage of Children under 10 years.*
England & Wales ..	15
U.S.A.	22
Thailand & Turkey ..	29
Malaya and Iran ..	33
Pakistan	35

Another significant fact is that more than half of our total population 53.43 is under twenty. A laıge Percentage of our population under 10 years of age is going to create many social and educational problems in the coming years.

is that the tendency in excess of males over females is higher in West Pakistan than in East Pakistan. In East Pakistan the majority of population is non-migratory. While in West Pakistan, migration from other parts of India as well as from East Pakistan in search of new avenues of employment is an important factor. It is a generally accepted principle that in migration males always dominate females. The argument also strengthened by the fact that differences in sex ratios of rural and urban areas were also very sharp as shown in the following table:

TABLE 7

URBAN AND RURAL SEX RATIOS FOR 1961.

NUMBER OF MALES PER 100 FEMALES

Year	*PAKISTAN*		*East Pakistan*		*West Pakistan*	
	Urban	*Rural*	*Urban*	*Rural*	*Urban*	*Rural*
1951	129	109	142	106	126	113
1961	133	111	151	109	129	114

The main reason of this higher sex ratio in the urban areas is the migration from the rural areas to the urban areas. In an agricultural country the migration is usually of males because the urban centres generally progide evenues for employment to the surplus male agricultural labour force. Problem of housing, community facilities and social readjustment, high standard of living, and higher cost of living discourage migration of women folk from rural areas to urban areas. With the changes in some of the above patterns the sex disparity is likely to be effected in the urban areas in due course of time.

Urbanisation

At the beginning of the century Pakistan was mainly a rural country where only 5 percent of the total population was living in urban areas. Since then the urban population of the country is gradually increasing. In 1961, 391 places have been treated as urban areas, consisting of 13.1% of the total population. In 1961 there were 16 cities having a population of one lakh and over. The population of these 16 cities was accounted for 7.4% of the total population of the country or about 56.1% of the urban population, Karachi, was the largest city having a population of 19.13 lakhs, next came Lahore having a population of 12.96 lakhs.

Age

The age distribution of a population is of basic importance in the analysis of demographic changes and indeed, in the study of many social

of West Pakistan. A large number of East Pakistanis are not only joining the Central Government Services, Defence Forces, but also the commercial firms and agencies located in West Pakistan. Government is also providing facilities to agriculturists of East Pakistan to migrate and settle in West Pakistan in the new colonies.

Sex Distribution

According to 1961 census there were 93.69 million persons, 49.30 million males and 44.39 million females, excluding non-Pakistanis. Excluding foreign nationals the adjusted 1951 population was 75.67 million persons, 40.08 million males and 35.59 million females. The population, of 1961 has thus registred an increase of 23.8 percent of total population 23.0 percent of males and 24.7 percent of females. In 1961 the overall sex ratio for Pakistan was 111 males for every 100 females and the respective rates for East and West Pakistan were 108 and 115 males to 100 females. The high rate of males to females has been a regular feature of the previous censuses of this sub-continent, including Pakistan. The sex ratio has shown a steady increase in the excess of males at every census since 1901, as will be clear from the following table.

TABLE 8

SEX RATIOS, 1901-1961

NUMBER OF MALES PER 100 FEMALES

Year	*Pakistan*	*East Pakistan*	*West Pakistan*
1901	108	103	117
1911	110	104	120
1921	111	105	121
1931	112	106	122
1941	112	107	119
1951	113	110	116
1961	111	108	115

It is difficult to assign the preponderance of the male population to any single cause. There can be a number of possible causes such as the usually high rate of male births, female mortality during the child bearing ages, under-enumeration and under-statement of females an account of prevailing customs and social conditions. Another significant point

increase in their reported strength. In 1951, the percentage increase was about 8 percent only. It is obvious that the years of World War II, partition and great famine of Bengal were less favourable to population growth in Pakistan. Coming to decade ending with 1961 Census, it can be said that immigration, economic development, accurate census counting and correct enumeration of women folk are some of the reasons for this unexpected rise.

The corresponding decennial increase for Pakistan and East Pakistan is more or less the same, except 1951, when there was no rise in East Pakistan and this was due to the famine of 1941.

During the last sixty years Population of East Pakistan has increased from 28.9 million to 50.8 million or a rise about 76 percent, which is equal to an average rate of 1.3 percent per annum. While on the other hand, West Pakistan has increased its population from 16.6 million in 1901 to 42.9 million in 1961 or a rise of about 158 percent, which is equal to an average rate of 2.6 percent per annum. Thus it is clear that the rate of growth in West Pakistan is double that of East Pakistan.

The rapid increase in population of West Pakistan has been due to several censes in addition to natural increase. In particular there has been considerable immigration due to great irrigation schemes and colonization which have been introduced during the last sixty years in the former provinces of the Punjab and Sind and the State of Bahawalpur. The largest element in the growth of the province, being of course the movement of refugees into West Pakistan following partition. West Pakistan has absorbed 6.5 million Muhajirs out of the all Pakistan total of 7.2 million according to 1951 census. Industrialization and exapansion in urban areas will clontinue to show a rapid increase of population in this province.

East Pakistan has an average density of 922 persons per square mile which is seven times that of the average density of West Pakistan. In ten districts out of seventeen in East Pakistan the density is over 1000 persons per square mile. The pressure on agricultural resources is great and this a retarding factor in the rate of population growth in that province. The exodus of Hindus and small influx of Muhajirs, after partition was also a cause of slower growth of population in the province. In 1941 the percentage of Hindu population to the total population was about 28 percent while in 1951 this dropped to 22 per cent and in 1961 their percentage was 18.4 percent to the total population. Movement of population between the two wings is also an important element in the growth of the provincial population

The sharp rise in population during the last 10 years was thus to some extent unexpected. However the Census authorities after conducting the quality check immediately after the "Big Count", and after inspecting the reports of the districts officers were convinced that the increased in population between 1951 and 1961 was substantial and significantly larger than the moderate estimates made earlier. It may be noted that during the corresponding period, population of India has increased from 400 million to 436 million or a rise of about 9 percent during the last ten years.

The population of Pakistan is incrasing rapidly since 1901. The following table shows decennial percentage increase since 1901.

TABLE 4

POPULATION GROWTH IN PAKISTAN AND PROVINCE SINCE 1961.

(Population in Million)

Year	*Pakistan*		*East Pakistan*		*West Pakistan*	
1901	Pop.	%	Pop.	8%	Pop.	%
1901	45.5	%	28.9	%	16.6	%
1911	50.9	%	31.6	%	19.4	%
1921	54.4	%	33.3	%	21.1	%
1931	59.2	%	35.6	%	23.6	%
1941	70.3	%	42.0	%	26.3	%
1951	75.8	%	42.1	%	33.8	%
1961	93.8	%	50.8	%	42.9	%

It is difficult to explain all decennial variations in the population in this short article, however, certain variations can be explained. For instance the failure to grow rapidly from 1911 to 1921 resulted from the great influenza of 1918-19 which was especially severe in the whole Indo-Pakistan sub-continent. Again in the next decade there was an attempted boycott of the Census in 1931 as a part of the policy of "Non-cooperation" movement against the British Government. The more probable course of the high rate of increase shown between 1931 and 1941 was the inflation of the latter census. Political tension was acute at the time of the 1941 census, particularly in the Muslim majority provinces and both Hindus and Muslims endeavoured to cause an artificial

10. Includes Non-Pakistanis.

It is clear from this table that the over-all density rose from 207 persons to 256 persons or a rise of 49 persons per square mile. The East Pakistan registered a rise of 161 persons per square mile, while West Pakistan shows an increase of 27 persons per square mile.

TABLE 3

DENSITY OF SIX MOST POPULOUS COUNTRIES OF THE WORLD

Country	*Density per Square Mile*	
Mainland of China ..	187	7
Indian Republic ..	345	8
U.S.S.R.	24	7
U.S.A.	59	7
Japan	650	7
Pakistan	256	9

From density point of view Pakistan assumes third position among these six countries, surpassed only by Japan and India. This pressure is very uneven in the two provinces. Even both provincial averages fluctuate between a wide range. Dacca district in East Pakistan has the highest density in the country with 1,760 persons per square mile. Kalat the largest division of Pakistan with 20 percent of the total area or which is 1.3 times larger than the whole province of East Pakistan, has the lowest percentage (0.56) of the total population. The average density of this division is only 7 persons per square mile. The two districts namely Kharan in Kalat Division and Chagi in Quetta Division have the lowest density of two persons per square mile.

Growth of Population

After adjusting 1951 Census figures (as already been indicated earlier) and after the actual count of 1961, it was found that in 1961, the total population showed an increase of 23.8 percent over the total population of 1951. Thus the counted population shows an increase which exceeds all the previous estimates made by demographers and other learned bodies, except two projections.

7. Estimates mid 1959.
8. Provisional figures, Census of India, 1961.
9. Final figures of Census of Pakistan, 1961.

non-Pakistanis decreased to half as compared to previous census. It is interesting to note that the number of Afghan Powindahs and Afghan nationals living in Pakistan without adopting Pakistani nationality increased. In 1951 census there were 69, 790 Powindahs and 2,260 Afghan nationals were counted which show an increase of about 4 percent and 270 percent respectively. The later figure is very significant, while on the other hand the number of Indians formerly residing at the time of 1951 census decreased.

Non-Pakistanis had been excluded from all the tables.

Thus according to 1961 census the total population of Pakistan excluding non-Pakistanis was 93,690,530. Out of which 50,840,235 was in East Pakistan and 42,850,295 in West Pakistan.

Density

The total area of Pakistan according to 1961 census was 365,504 square miles, 55,126 square miles in East Pakistan and 310,378 square miles in West Pakistan. West Pakistan with 84.9 percent of the total area had 45.7 percent of the population. On the other hand East Pakistan with only 15.1 percent of the area had 54.3 percent of the population. There was an increase of about 800 square miles in the total area of Pakistan between the two censuses mainly due to latest calculation of area undertaken by the Survey of Pakistan.

It may be noted that in 1951 census density for East Pakistan was calculated after excluding river areas. In West Pakistan density does not differ whether rivers are included or excluded from the total area. Rivers are so large in certain parts of East Pakistan that they make a significant difference in the area and density. Out of the total area of 55,126 square miles, 3,205 square miles or 5.8 percent of that area is covered by rivers and forest shares. For the purpose of uniformity and conformity to international standards, in 1961 the density has been calculated on the total area including large and small rivers. For comparative purposes the density figures for 1951, have also been revised. The following table shows the comparative density figures for the two censuses.

TABLE 2
DENSITY PER SQUARE MILE
1951 & 1961

		1951	1961
Pakistan	..	207	256
East Pakistan	..	761	922
West Pakistan	..	109	138

Census of Pakistan, 1961.

The second census of Pakistan was conducted by the population Census Commissioner, under the Ministry of Home Affairs, in January, 1961. In certain cold and hilly areas of the country, the census was conducted between September and November, 1960.

The Census was conducted on the dejure basis, i.e., an individual who was resident in the country was included in the population of the area in which he usually resided regardless of his actual location at the census date.

Practically, the whole census was taken by house to house enumeration. Only a small segment of the population of agencies in the North West Frontier of West Pakistan comprising about 2.3 percent of the total population was estimated. The following three types of census schedules were used for enumeration:

i- Standard Pakistan Individual Census Schedule,

ii- Tribal Individual Schedule,

iii- Speicial Family Schedule for Tribes.

About 96.4 percent of the total population was enumerated on the first schedule, which contained 22 questions.

The total population of Pakistan according to the Second Census was 93, 801, 556, which was spread over an area, 365, 504 square miles.[5] For comparative purposes 1951 census figures had also been revised. After including 24,000 persons in the Frontier Region, who were not included in the population figures of 1951 census and estimated population of Gawadar (13,000) which became part of Pakistan in 1958, the total population of Pakistan, incluing non-Pakistanis stood at 75,879,165 in February 1951.

Nationality

In 1961 census, 111,000 persons reported their nationality as non-Pakistanis out of this 12,000 were enumerated in East Pakistan and the rest in West Pakistan. In 1951, the number of non-Pakistanis was 207,000 out of this number 130,000 were enumerated in East Pakistan and 77,000 in West Pakistan (mostly Afghan Powindahs).[6] Thus the number of

5. Excluding Jummu and Kashmir, Junagarh and Manavadar States, Gilgit and Baltistan and Pakistan enclaves in India.

6. Seasonal nomads from Afghanistan two come across the border with their families and livestock during the winter chiefly in search of food, fodder and remunerative labour.

Some Demographic Aspects of Pakistan

M. A. Sabzwari (Research Specialist)

Population is one of the most serious problems of the world today, as it has been estimated that the world population is increasing by 50 million people annually. Population growth is more rapid in the economically under-developed regions of Asia, Africa and Latin America, where more than half of the world lives. Pakistan also lies in this region.

According to 1961 census, Pakistan is the sixth largest country in the world from the population point of view, Table I shows the position of ten most pupulous countries in the world.

TABLE 1

Ten most Populous Countries in the World.

No.	*Country*	*Population (Milln)*	
1.	Mainland of China ..	700	1
2.	Indian Republic	436	2
3.	U.S.S.R.	210	1
4.	U.S.A.	178	1
5.	Indonesia	96	1
6.	Pakistan	94	1
7.	Japan	93	1
8.	Germany	70	1
9.	Brazil	55	1
10.	United Kingdom	51	1

1. Estimates mid 1959.
2. Provisional figures, Census of India 1961, excluding Manipur, North-East Frontier Agency, Nagaland and Sikkam.
3. Final figures - Census of Pakistan, 1961.
4. Estimates mid 1955.

harmony is created in the souls by the training in music and gymnastic it is led to the knowledge of good. In this stage habit of abstraction is formed through the study of mathematical sciences which alone can arouse the dormant energies of thought. Through these we can remove or reduce the confusions in particulars. So geometry which helps the contemplation of the idea of good, astronomy which enables a man to have a knowledge of heavans and is helpful for husbandry, navigation military tactics and arithmetic would be taught. At the age of thirty a selection shall be made on the basis of observation as to whether the candidate shows faculties for further training and is steadfast or not. After this selection the philosophers shall be taught dialectics - the power of reasoning and seeing things together, for five years. After the age of 35 they shall be assigned the duties of public service for 15 years to acquire the first hand knowledge of good and evil forms by coming into contact with them. After the completion of their eduction at the age of 50 they shall be raised to the status of philosopher kings.

He gives equal share to women in education and services because he found no difference between the two sexes which may justify the division of occupation in his own times. He says that by giving them equal shares in every walk of life we can utilise the whole supply of natural capabilities and potentialities.

are with child, should walk about and fashion the embryo". The children, he says should not be allowed to work before they are three years of age because it would help them in digesting their food, acquire quiet disposition and keep them away from fits. From the third to the 6th year they shall be amused under the supervision of strong nurses and shall not be allowed to become self-willed and spoilt.

After the 6th year of their ages the real education starts and this scheme of education has been divided by Plato into parts. Elementary education includes the training of children upto the age of twenty and is completed with the beginning of military service. This elementary education is the sublime mixture of the education systems of Athens and Sparta. Curriculum has two parts, gymnastic for training the body and music for training the mind. Gymnastic is also training of mind through body and distinct from direct training of the mind by music.

Nature and nurture form and shape the human character If nurture is provided in its perfect shape to the persons of better breeding and for this purpose he devised communism particularly its aspect of community of wives, exclusively meant for them to grasp the truth and idea of goodness. He was not concerned with the direct teaching (but with the indirect teaching) but with the atmosphere in which the soul lives and puts emphasis upon the fact that souls should be surrounded with ideas and objects which are likely to develop it. For achieving this he seeks the help of music which may lead them "from their earliest years into likeness and friendship and harmony with the principle of beauty". A spirit of pure and temperate love for beauty and truth is to be created among them by music and bad taste and vulgar and petty types of feeling should be kept away from their minds. He admits that there is no pleasure more excessive, more intense and more maddening than the sexual pleasure but the training through music shall make them love beauty for beauty's sake and not for the satisfaction of base and vulgar apetites feelings or sentiments and asserts that "it seems that in the city we are founding, you will lay down a law that the lover may kiss his beloved, may frequent his society and embrace him, as though he were his son but in all else his relation with the person he affects shall be such that they shall never be suspected of going beyond this. If he acts otherwise he shall draw upon himself the reproach of bad taste and vulgarity". Book III Republic by Plato. In gymnastic as well as in music they must be trained all their lives from their earliest years because a good soul by its excellence makes the body as good as it can be. The course of music includes the study and interpretation of good poetry as well as singing and playing the lyre. He considered that training music and gymnastic is a means of moral and religious education. This scheme of higher education starts from the age of 20 and extends till 35. When

Plato's Theory of Edudation

Prof. Qaiser Aminuddin, M.A. (Political Science)

In the later half of the fifth century B.C. the downfall of Athens had started and Sparta had defeated Athens in the war. People of Athens had become indolent and lethargic. Socrates tried to seek the remedies of all the maladies which were prevalent in that society and this search brought him a cup of poison. After him Plato, dejected and disappointed as he was after the death of his master, Socrates shouldered the responsibility of finding out the solution of the problems of city-state. He outrightly discarded all present institutions and associations and went forth to denounce the democracy existing in Athens; the democracy which had poisoned a person like Socrates.

He wanted an over-all purification of city-state. For him the situation was desperate and he was not shy of seeking desperate remedies for it. This was neither due to defective education nor moral deficiencies of teachers and rulers alone but due to sickened and crippled body-public and human nature. In his opinion through methodical self-examination and rigid self-discipline that happier frame of mind could be regained without which ignorance and incompetence of politicians could not be removed. Scheme of education was one aspect of his reckless efforts to banish individualism and abolish amatuer incompetence and establish the rule of the efficient. For him the question was larger than the mere training and education of soldiers and orators. It also included the need of knowing what to teach and what to train men to do. He could not reconcile himself with the idea that somebody is already in the possession of that knowledge which shall be taught. It is because we find in his thought the coupling of training with investigation and a long and elaborate scheme of education.

According to him individual capacities can be developed by proper and controlled education. And once it is accomplished it will automatically result in a harmonious state. He thought that as virtue is knowledge so it can be taught and the system for teaching it is an important part of a state. Hence the justification of his plan for state controlled system of compulsory education. He starts with the nursing of children even prior to their birth and says that "dthese odies are fairest which grown up straight and well formed from the time of their birth so women when they

given only a part of the vast sub-continent, which once they ruled. The portion given to the Hindus is now called Bharat while the Muslim share of the subcontinent is known as Pakistan.

Geographically Pakistan is divided into two parts. One part is known as East Pakistan and the other is given the name of West Pakistan. The eastern part consist of East Bengal, Chittagong hills and Sylhet district from the former Assam province and the western part comprises the western part of the former Panjab and full provinces of Sindh, Baluchistan and N.W.F.P. of the British days. Dacca has been made the capital of the East Pakistan while the honour ofbe coming the capital of West Pakistan goes to Lahore.

Pakistan is predominantly a Muslim Country. Bharat on the other hand is a country where the Hindus are in overwhelming majority. People of other religions are also foundinthe two countries but their number is insignificant. They do not count very much. But their existence cannot be ignored.

are on the work of rivers rising in the eastern ghats. All these rivers fall in the Bay of Bengal. This is the reason that communication between the east coast and the uplands of the Deccan is easy and frequent.

This region again has been a centre of great kingdoms, famous cities and civllzied people. It was again from these eastern parts that the people of southern India maintained good relations and commercial intercourse with the people of south east Asia for a very long time in history.

The South Indian plains

The Mysore region covers the southern most part of the Deccan plateau. Below it to the east and west lies the open country reaching the sea. The descent from the highlands of Mysore to the plains below has remained a determining factor in the history of this area. On the west the descent is abrupt and full of innumerable difficulties. Hence the region of Bochin and Travancore have not been much influenced by the political and military ambitions of the rulers of Mysore. But the approach to the eastern and southern plains being gradual and easy from the uplands of Mysore, Mysore has always determined the history of the region of the learnatic.

Indo-Pakistan a sub-continent

Thus we find that the size of Indo-Pakistan is enormous. It is not a country. But it is a sub-continent and is as large as Europe, excluding Russia and is twenty times as big as Great Britain. Like its immensity in size, its diversity in physical features is also noteworthy. This subcontinent contains within its boundaries lofty mountains steeped in eternal snow, flat plains, salted by every tide, arid deserts unvisited by any human-feet, fertile river-valleys, dense forests, barren hilly tracts conceding no produce, tableland spotted with hillocks, ghats and fertile maritime plains. Every kind of climate and every kind of soil, in short can be seen in this vast expanse of territory. Every division marked by the hand of nature has its own pecularities and can be called a country in itself.

The British who like other European nations came as traders, became rulers in this sub-continent after the decadence of the Moghal Empire which followed the death of Aurangzeb (1707). But in August 1947, the British were forced to quit the sub-continent under the pressure of patriotic forces working for the liberation of the land from the yoke of foreign rule. As they withdrew, they divided the sub-continent into two parts. One was given to the Hindus and the other to the Muslims. In this partition the Hindus got the lion's share and the Muslims were

The Deccan and its special features

The Deccan is a table-land, triangular in shape. It rises abruptly in the west. All the important rivers of this plateau flow eastwards in the Bay of Bengal, with the exception of Narbada and Tapti that fall in the Arabian Sea. These rivers are not snowfed like rivers of northern India. In the hot season, they are often in flood, but after that they generally go dry. They cannot be used as means of communications like great northern rivers which are navigated upto Agra and Lahore.

There are a number of natural barriers that separate the Deccan from the North. These are the Vindhyacral mountains and Satpura hills; Narboda and Tapti which run between them and empty themselves into the Arabian Sea and the forests of Chota Nagpur, known as Dandak forests.

It is this separation of the Deccan from the North which has often been responsible for its separate history, separate culture and separate customs and separate traditions. Many times the Deccan was knit together into a political system with the north but every time was proved ineffective and temporary. But today owing to the mastery of man over nature, the Deccan outwardly seems to be more closely drawn towards the north. But the differences in the field of culture and language are there and can be seen yet writ large on the face of the Dravidian south.

The Eastern and the Western Ghats

The Deccan plateau is situated on the west by the western ghats and on the east by the Eastern ghats. The western ghats are steep and have a height between 3,000 and 8,000 feet from the sea level. On the other hand the eastern ghats are not very high. The narrow strip of land lying between the foot of ghats and the sea is very fertile and is always green with coconut trees and smiling fields of rice. Before the introduction of modern means of communications, it was very difficult to climb or cross the western ghats. The tribes who lived in this coastal land were for ages shut off from the rest of the Deccan. Even now they follow customs found nowhere else in the country. But in the north in the valleys of Narbada and Tapti the things are different. It is in this region that powerful kingdoms and great centres of civilization and culture have flourished from very early times. Again it is in this area that famous parts of Surat and Broach which carried trade and commerce with the west in the medieval times existed.

The coastal land lying below the eastern ghats is much broader. The eastern ghats have a low elevation and contain river valleys which

The Indo-Pak coastal lines, both on the west and the east are unbroken and straight and devoid of good natural harbours. Moreover the estuaries of the great systems of rivers are covered with silt at their deltas and shallow, hence unfit for navigation purposes. Besides these are no islands close to the coast to be used as stepping stones for navigation of the high seas.

Since the discovery of the sea route to the sub-continent, the strategic importance of the North-western passes has declined as that of Bombay and Karachi has increased.

The Northern plains

Between the Himalayan mountains and the Lalpura and Vindhyachal ranges, there extena wide allunial plains from the Arabian sea on the west to the Bay of Bengal on east. These plains are made of the rich soil washed down during countless centuries from the Himalayan system of mountains on the north ana from the hills and uplands of the Deccan on the south. Three great river systems of Northern Inao-Pakistan irrigate these plains. These are Indus and its tributaries, the Ganges and its the Brahamputra and its feaders. It is to these rivers that northern plains are all their fertility.

These plains are most densely populated and have the big cities like Calcutta, Allahabad, Agra, Kanpur, Delhi, and Lahore situated within them. Moreover all the empires that came into existence in ancient medieval or modern times, had their capitals situated in these plains.

But the climatic conditions of this region have always exercised an adverse effect on the fartimes of its residents. No doubt the abundance of leisure and the absence of a keen struggle for existance helped the intellectual classes in denoting themselves to the development of thought and culture, but this easy and luxurious life made the inhabitants weak, timid and unenterprising. Thus invaders from the slopes of Central Asia came and often robbed the people of their riches and wealth.

This vast plain of Northern Indo Pakistan is broken into three divisions by wedges projecting northward from Rajputana and southal parganas. Both these wedges have offered serious obstacle to the armies marching and remarching from one end of the plains to the other. The invaders from Central Asia passing through the Panjab to the Gangetic valley, had therefore, no alternative but cross this narrow bottlenecked plain of about 200 miles in width. This is the reason why all the important battles bearing, on the fate of the country were fought at one or the other place in this narrow plain. The battle-fields of Kurukshetra, Fahin, Karnal and Panipat are all situated within this small gap.

(8) The Swat and Chitral passes are the openings in the offshoots of the Hindukush mountains. They form the routes from Turkistan into the valleys of Swat, Bajour and Chitral. Allexander himself led a division of his army through these passes and joined his main force passing through the Khyber pass at Ohund.

(9) The Gilgat pass is the most narrow way in the western offshoots of the Himalayan range. It connects the route form Turkistan into the valley of Kashmir. The stragtegic importance of this gateway is beyond doubt.

These are the gateways through which herds of peaceful traders and hosts of invaders have entered and left the subcontinent in prehistoric and historic times. For the defence of Pakistan in particular and the other parts of the sub-continent in general, a strict watch on these passes is very essential. History is full of instances to show that whenever these passes were not kept well-guarded the people of the sub-continent had to suffer great hardships. After the partition all these passes have fallen in the hands of Pakistan. Now the sole responsibility for keeping these passes well protected for the security of the entire subcontinent rests with the government of this country of Pakistan.

If we keep in mind the in-roads coming from time to time through these North-western passes, then we can easily understand the presence of autocracy as the chief form Govt. in the history of this subcontinent and the lack of gradual evolution of political institutions in this vast tract of land.

(10) The gateways of the Seas—Another natural frontier to this subcontinent is formed by the Inaian ocean in the south, the Arabian Sea on the west and the Bay of Bengal on the east which meet at Cape Comarin, the southern most point of the sub-continent. But this ocean however like the mountain barriers has given the land its people security but no exemption from external invasions. In the times when Navy was not developed into an aggressive weapon of war, this ocean barrier proved effective against outside aggression. But since the discovery of the sea route to the sub-continent by the European naval powers, the safety afforded by sea has come to an end. The Portugese, the Dutch, the French and the English stepped on the shores of the sub-continent by crossing this barrier of the high seas.

The people of the sub-continent in the earlier times used the sea themselves as a high waterway upto the Malayan archipaligo and the coast of Arabia for the purposes of trade and commerce. But all this activity of the inhabitnts of this land were confined to a limited area and wars practised on a very limited scale. The country throughout its long history has not given birth to any sea faring race or a maritime power. The reasons for this attitude are not far to seek.

rainfall. This dearth of rainfall makes their inhabitants very poor and needy. For this reason the fertile tracts of the subcontinent have always lured the people living beyond the passes. People living on the other side of the passes are very strong in body and capable of bearing great hardships. But lands that lie beyond the north-eastern ranges are as fertile and rich as those of the sub-continent and their inhabitants as little enterprising as the inhabitants of the fertile lands of the Indo-Gangetic plains. Their pact explains why a few or no invasions have taken place from the North-eastern side.

The passes which form regular gateways in the sub-continent right from Gilgat to the Mekran coast are as under:-

(1) Mekran route—It connects Persia with Pakistan through Baluchistan. On their journey towards home one of Alexander's division took this route and later on Mohammad bin Qasim entered Sindh having taken this route.

(2) The Mulla pass—This pass also connects Persia with Pakistan Alexander marched back wit the major portion of his army through this pass.

(3) The Bolan pass—This pass runs along the Bolan river and joins northern parts of Sindh with Afghanistan.

(4) The Sakhi Sarwar pass: This pass connects Multan with southern Afghanistan. On its western side, this route is connected with Kandhar and thence on to Persia. It was by this route that Nadir Shah led back his army to Persia after the famous sack of Delhi.

(5) The Gomal Pass—This is one of the oldest and the most frequented trade routes from Afghanistan into Pakistan. It passes through the Valley of the Gomal river and converges for the most part on Multan which has always been the main strategic point of the lower Indus valley.

(6) The Kurram and the Tochi passes form the middle routes which connect Kabul and Ghazni with the Panjab. The Kurram route leads to the upper Derajat and the Tochi route to Bannu. The latter is the shortest route from Ghazni into the Panjab. It was through the Tochi pass that Mahmud of Ghaznavi invaded Sindh and Multan so many times.

(7) The Khyber pass is the chief gateway from Afghanistan into the sub-continent. The road form Kabul to Peshawar passes through this historic pass which further reaches the Panjab and then running through the northern Gangetic plains ends in East Pakistan and Assam. It is through this historic gateway that innumerable invaders have passed into the sub-continent since the dawn of history.

ble forests gave the country small political, social, economic and cultural units. Each of the units, thus separated from each other developed its own language, customs and traditions, social order, religion and a distinct outlook on life. Isolation and local conditions further accentuated the centrifugal forces and fissiparions tendencies thus born as a result of physical divisions and marred the unity of its people in the past.

The Himalayan region—The highest mountains of the world, that is the Himalayas, stand as a sentina to protect this subcontinent in the north. In the north-east and north-west also extend the off-shoots of this mountain wall and reach the Bay of Bengal by the Arabian Sea respectively. The mountain ranges in the north are pierced by a few passes. But here is so great that the passes remain snow for most parts of the year. Immigrants and invaders cannot think of entering the country from this side. Similarly the north-eastern ranges which comprise the Patkoi and Naga hills, separate or cut the sub-continent from Burma and China. Dense and trackless forests which cover these mountains make an access ot the sub-continent from this side also impossible. In these hills moreover live savage and warlike tribes who can also give a lot of trouble to an invader or a traveller passing this way.

The Himalayas also protect the northern plains from the icy winds of the north. Not only this but also this belt of mountains stretching in the north gives the sub-continent a pleasant climate, health resorts and fertility by stopping monsoons which give rainfall and snowfed rivers to areas of northern Indo-Pakistan. These rivers are very uesful as high water-ways for carrying trade and commerce into the heart of the country (Lahore and Agra).

These northern passes somehow allow a limited movement and contact between the people of the subcontinent and that of Tibet and China. But this is possible only during a few weeks when the snow melts and passes are clear to be crossed. The extent of this contact has always remained very limited. But through these passes has trickled the Mongaled blood, sign of which can be seen in the features of the people living in the slopes of Himalayas.

The North western passes. The North-western ranges of the Himalayas are called by the names of Hindukush and Sulaiman mountains. They are not very high and are not covered by dense forests. On the other hand they have a number of passes which have enabled limited herdes of invaders to make their way into this sub-continent form times immemorial The Aryans, Persians, Greeks, Seythians, Turks, Tartars, Mughals and Durranis all came this way.

The countries lying beyond the passes are rugged and rockey; often they are surrounded by mountains. They receive very little or no

The Political boundries of this subcontinent have varied from time to time. Under the Mauryas its boundries touched the Hindukush mountains. During the days of Turco-Afghan kings its north western boundary did not extend beyond the river Indus. But in the times of great Mughals its north-western boundary reached upto Hirat and included the whole of Afghanistan. The British, as successors to the great Moghals tried to conquer Afghanistan, but met with no success and could not bring Afghanistan in their Indian empire. (Their withdrawal from Indo-Pakistan was followed by the emergence of the two independent and sovereign states of Bharat and Pakistan).

Physically the subcontinent may be divided into four clear cut regions, viz:

(1) *The Himalayan region*—It is the hilly country of the north, stretching from the swampy jungles of the Tarai to the crest of the Himalayas about 1700 miles in length and comprising the area covered by Kashmir, Kangra, Tebri, Kuman, Nepal, Sikkin and Bhutan.

(2) *The Great north Indo-Gangetic plans*—These plains are 700 miles in length and can be further subdivided into western, central and eastern regions. These plains comprise the basins watered by the Indus, the Ganges and the Brahmputra system of rivers.

(3) *The Daccan plateau*—It is a table land and assumes the shape of a triangle. It is sent in from the rest of the peninsula by the double chain of virdhyacha and satpura ranges in the north and by the eastern by western ghats in the east and the west.

(4) *The South Indian plains*—These long and plains of the Saink lie between the Indian ocean and the eastern and the western ghats. They contain the rich parts of the Konkan and Malahr and also cover the fertile deltas of the Gadawri, the Krishna and the Kaneri.

Influence of Geographical features on Indo-Pakistan History or Historical Geography.

The lives of nations, as of men, are to a large extent influenced by their surroundings. The physical feature of a country therefore are very important. Their influence on the course of political, social and economic history (cannot be ignored). The history of Indo-Pakistan bring no exception has also been greatly moulded the history of the other countries of the world by its geography.

Each of the territorial region into which the hand of nature divides the sub-continent has got a distinct story of its own. intersection of the country by rivers, ranges of mountains, sandy deserts and impenetra-

Historical Geography of Indo-Pakistan

Prof. Nasrullah Khan, M.A.

Chapter I
INTRODUCTION

Geographical features of Indo-Pak History—(1) The physical features and geographical position (2) Influence of geographical features on Indo-Pakistan History. (3) Its people. (4) Diversity and lack of political unity. (5) Sources of Indo-Pakistan History. (6) Chronology of Indo-Pakistan History.

1. *Physical feature*—Indo-Pakistan sub-continent is the name given to the vast peninsula which the continent of Asia throws out to the south of the mountain ranges that stretch across the borders of Tibet and Turkistan. This is a huge expanse of territory and forms the shape of an irreguiar quadrilateral. This sub-continent lies roughly between longitude 61. and 96 east and latitude 8 and 37 north. It is about 1800 miles in length and 1360 miles in breadth. The area of this huge tract of land might be put at 1,575,000 square miles. The population like the area is also immense and nearly comes to 400 millions. In short the Indo-Pakistan sub-continent means the geographical unit bounded on the north, north-west and north-east by the Himalayan ranges and their continuations reaching the Arabian Sea and the bay of Bengal and in the south by the Indian ocean.

Various names have been in use for this sub-continent at different periods of its history. These names have been constantly changing, sometimes for political reasons and sometims owing to the philological changes. The Aryans gave it the name of Bharat versha or Bharat Khonda, being named after king Bharta of the Puranas. The Porsians called it Sapta Sindhu or Hapta Hindu, meaning the land of seven rivers, as the Panjab was called in those days. The rivers being Kabul, Sindh, Jhelum, Chinab, Ravi, Beas and Sutlej. It was from the word Hindu that the words Hind and Hinoustan were derived in the latter days. Then there came the Greeks. They gave the river Sindh the name of Indus. After it the word India was derived from the word Indus and became quite popular with the Greek travellers and through them with the Europeans. The name which is now used for this vast space of land is Indo-Pakistan. Politically at present it is split up into two independent states viz. Bharat and Pakistan.

and 110 meter Hurdles. Mahabat Khan represented Pakistan Universities in Ceylon, Malaya and Jakarta. Zafarullah Riaz was first in 500 meters Race and Javed Mohammad in Javelin throw. Daud Khan was selected for the Peshawar Division Football Team to participate in All Pakistan Football National Championship.

Mohammad Asghar and Mobinul Haq were selected in the Peshawar Secondary Board Cricket Team to participate in the Ayub Trophy Cricket Matches. Our college was runners up in Cricket in University Sports Tournament and M/s Raza Shah, Mohammad Saleem, Muddasar Ali Shah and Zahid Hussain were selected for the Peshawar University Cricket Team. Qazi Faizul Haq and Gul Arif were selected for the University Hockey and Basket Ball Teams respectively.

We would have been able to present still better results but for the lack of Grounds. There are many play-grounds adjoining the college campus and the Commissioner, Peshawar, has been requested to kindly allot one or two grounds to the college, I believe Educational institutions should be given preference over private Associations in granting leases of playgrounds. Every effort is being made to promote both the Physical and mental health of the students as the saying of the famous Roman Writer "Jurenal" - "Mens Sana in Corpore Sano" - A sound mind in a sound body still holds good even after the passage of centuries. For this purpose, arrangements for medical check up of the students have been made and a Doctor was appointed for the purpose. Medical Check up of I year students was completed.

The students should not only have good health but they must try to attain emotional stability and ethical development. Hence series of lectures on religion and morality were arranged besides placing daily on the notice-board translation of one Hadith. As Islam provides solution of all our problems every effort has to be made to achieve material and spiritual welfare and also to maintain a balance between the two as given in the Holy Quran "ربنا اتنا فی الدنیا حسنته و فی الاخرة حسنته".

Before I close my report, I would like to thank Khawaja Abdul Hamid, for the keen interest that he has been taking in this college and for the valuable guidance and help that he has executed to us.

object of eliminating middleman's profit and providing articles of good quality. At present there are 193 members with a share capital of Rs. 798. Director of Education, Kh. Abdul Hamid, was kind enough to patronise this Society by purchasing 20 shares. During the last 3 months total sales of the Co-operative shop amounted to Rs. 2,000/- which shows the degree of interest being taken by the students. The success of the Society is due to the active interest of Professor Saleem who has left the college on transfer, and Professor Niaz and M/s Daud Parvez and Safdar Khan, students of the Degree classes.

Proctorial System

The Proctorial System is working quite satisfactorily. It is believed that development of Social consciousness and imposing trust and appealing to the hounour "Pakhto" of the students works effectively than punitive measures. For this purpose efforts were made to get co-operation from the parent also.

Finances

In 1957, when the college was started, the total Budget allotment was Rs. 44,320/- only as against Rs. 276,411/- for the current year. In addition to the Foreign Exchange grant of Rs. 82,000/-.

The income received from fees has increased from Rs. 12,009/- in 1957-58 to Rs. 80,260/- in 1962-63.

The total number of Books in the library is 4870. 1374 volumes were added during the current year.

The number of books issued to staff and students from December, 1962 uptil now is 7658. On the average 130 to 140 books have been issued daily.

Sports

Our Football Team lost in the Finals and in the Board Tournament was placed as Runners up.

The Relay Races Team won the Championship by creating a new record in 4X100 meters Relay. Our Athletic Team lost the Championship by one point only. But it was due to the fact that one of Athletes, Abdur Rashid, could not participate in 400 meters final.

Mahabat Khan was declared as the Best Athlete who created two new records in 100 meters and 200 meters. He stood first in long Jump

Peshawar University. First Prize was won by Peshawar University, and second by the Government College, Lahore. Our students also took part in debates held at some other colleges and attended the Pakistan Youth Convention.

Philosophy Society

Under the able leadership of Professor Ashiq, Philosophy Society has been started Besides other meetings it held a very interesting symposium on "LIFE" as a challenge under the Presidentship of Mr. Muhammad Ali, Vice-Chancellor of Peshawar University, Dr. Mrs. Saleem, Head of the Political Science Department, Dr. Saleem, Chairman of Botany Department and Prof. Bokhari of the Peshawar University, Mian Ziauddin, Bar-at-Law and Mr. S.M. Jaffar, Director of Archives and Professor Habib of our college, took part in the Symposium. Dr. Raziuddin Siddiqi, Vice-Chancellor of Sind University too graced the occasion with his presence. It has also started a Brain Trust and in the first meeting, Khan Pir Bakhsh, Advocate, took part.

Science Society

This Society arranged tours to industrial areas like Daud Khel, Wah and Warsak. Students were sent to attend Pakistan Science Conference at Lahore. It also arranged lectures by eminent teachers.

Besides these, there are other Societies like Economics Society and Bazm-e-Urdu. Economics Society arranged lectures and tours, while Bazam-e-Urdu arranged two Mushairas one of which was presided over by the well-known poet, Mr. Qamar Jalalvi and the other was held with the co-operation of Writers Guild of Pakistan.

Rumi Day was celebrated in the college. Dr. Mazhar Ali Khan, Chairman, English Department, Dr. Durrani, Principal, Engineering College, Mr. Mufti Habib and Mr. Tahir Farooqi of Peshawar University delivered talks on Rumi.

Eminent scholars were also invited who gave talks on different subjects. Among them the names of Sir Millman of British Council, Mr. Charles Provance, Director Information Service, may be mentioned.

College Magazine

College has started its Journal "Gandhara" which is under print.

Co-operative Society

The Co-operative Society was started in November, 1962 with the

Annual Report

Mohammad Ismail Sethi, Principal

This college came into existence in the year 1957 and classes were started in the old Assembly Chambers. In March, 1958, the Provincial Government gave administrative approval for the construction of Intermediate College building at the cost of Rs. 5 lacs which was later revised and increased to Rs. 6 lacs =9 thousands. The land was granted by the Peshawar Municipality free of cost. This land is situated in an area which has a great historical importance. In the vicinity is situated Panj Teerath; probably named after Five Pandoos - as mentioned by Chinese Travellers Fa-Hian and Hwen Thsang about 400 A.D., and Shahi Bagh which was probably laid down by Taimur Shah, as there are references about it in Royal Firmans dating back to 300 years.

The construction work of the college started on the 23rd June, 1960 and this building was occupied on 27th January, 1962. The college was raised to the Degree status in the year 1959-60 and B.Sc. classes were started in 1961-62.

In 1957-58, the number of students was only 164. It increased to 554 in 1963 and the strength would have been still more if all those who had applied for admission could have been admitted. Keeping in view the large numbers, the Government had sanctioned the construction of a new Degree College building at the cost of Rs. 6 lacs under the Bifurcation scheme but since the Bifurcation scheme has been kept in abeyance, no progress can be made on the new Degree college Plan. However, I have taken up the matter with the Government that the grant of Rs. 2 lacs allocated under that scheme for the current financial year, may be utilized for the construction of a new Science Block in this Campus. This will meet some urgent needs as the existing college had been constructed only for Intermediate classes. It is hoped that this proposal will be approved by the Government.

Societies

During the year under report, college Union was established and it was inaugurated by Khawaja Abdul Hamid, Director of Education, Peshawar. Local Inter Collegiate Debate and West Pakistan Inter Collegiate Debates were held. English and Urdu Trophies were won by

This year, during the forthcoming summer vacation the degree students of our College will work in various projects of Social work.

A batch of 30 students will work at Shabkadar in the anti-malaria compaign. And 40 (forty) students will participate in the similar project of D. D. T. spraying in certain suburban and city area of Peshawar. This Project has been organised in co-operation with the Peshawar Municipality.

Another group of 15 students is leaving for Mansehra to undertake the construction of roads etc. Still another group of 45 students shall work in the different local factories like the Nishat Textile Mills and the Nasarpur Food Processing factory etc.

All these projects shall commence from 19-6-63. and shall last for three weeks. Moreover, each group will work under the close supervision of a member of the staff who will also act as a leader of the team.

The students have been fully instructed to do their work with a spirit of zeal and dignity.

Editorial

This edition of the College Magazine is the first ever to be published in this College, but it cannot boast of being the outcome of combined efforts of all its students because the previously gathered material was lost owing to the inordinate delay in publication. However a beginning has been made and the talent of the students has been tapped. With the passing of time the novices will acquire more experience and knowledge under the guidance and advice of their teachers and produce atricles of good quality. We are by no means disappointed over the present performance although it can't be called up to the standard. Some of the contributors of articles, if properly groomed, can shine as fine (Star) writers of to-morrow.

In the present edition all care has been taken to ensure that the students should learn to cultivate a broap, constructive and moralistic view point, and that they should develop a literary sensibility which would in tern kindle their desire to read and appreciate great literature whether local or foreign.

Staff

This academic session started with many arrivals and departures in the college staff. Mr. A. Shakoor and Mr. M. Ashiq old staff members came back to this college. Other arrivals were Mr. A. Majeed (Chemistry), G.H. Baloch (Chemistry), M. Afzal (Physics), Mr. Hamid Raza Karim (English), Mr. Nazir (Geography), Mr. Qaisar (Pol. Sc.), Mr. Khurshid (Lib.) and Mr. S. Dilawer Ali (Islamiat). The departures were those of Mr. Aslam (Philosophy), Mr. Rizvi (Psychology) and Mr. Afzal Bhatti (Political Science). Mr. Maqbool of the department of English went on a scholarship to Beirut.

We take this opportunity to welcome the new-comers and to bid farewel to our colleagues of yester years.

On the opening of this session Mr. Ashraf Sidd,qi, Principal of this college for three years, was transfered to Mianwali and was replaced by Dr. Sultan Ali Chowdhry of Govt. College, Lahore. He was replaced by Dr. Mohammad Sajid of the V-AID Academy, on the 11th day of his office. Dr. Mohammad Sajid worked for a month in his office when he was transferred to Mardan and Mr. Mohammad Ismail Sethi took over as Principal of this college who now continues as such.

MAGAZINE–ENGLISH SECTION

CONTENTS

GANDHARA

Gandhara was the ancient name of the Peshawar valley and the adjacent tribal territory. This name is attributed to an Aryan Viceroy Gandharea, who established a colony here which was named after him. The ancient capital of Gandhara was the modern town of Charsadda. This region was a meeting ground of different civilisation which gave birth to a hybrid culture, that found its expression in a School of Art represented by sculptures.

Lord Buddha never visited this land but numerous sites in Gandhara were associated with and owed their fame to events connected with his life. This region became the second holy land of Buddhism from the days of Asoka and credited to be the birth place of first Buddha image.



Sitting:— L to R Prof. Sharar Nomani I/c Urdu Section, Prof. O. R. Afghani I/c Pushto Section, Prof. Mohd. Ismail Sethi (Principal) Patron, Prof. S. B. Awan I/c English Section.

Standing:— Mohammad Iqbal B.A. Part II Student Editor Urdu, Khan Bahadur, B.A. Part II Student Editor English, Sajjad Ahmad B.A. Part II Student Editor English.

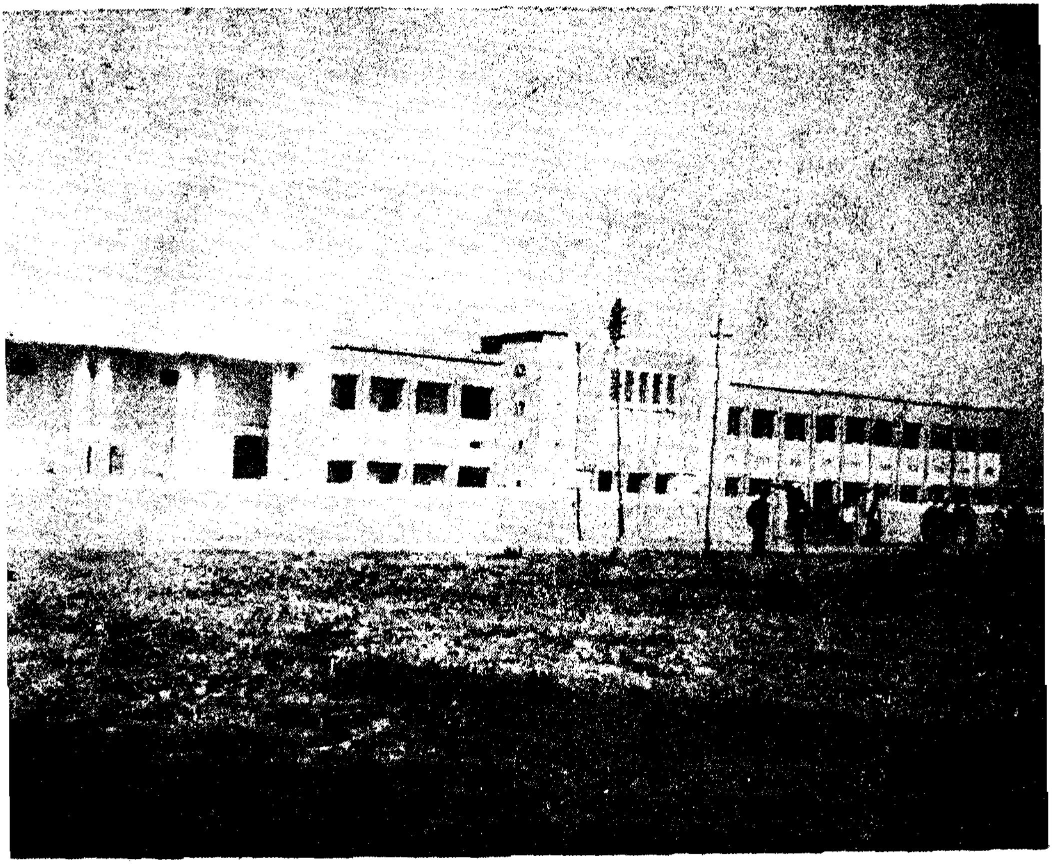
GANDHARA

GOVERNMENT COLLEGE PESHAWAR

JULY 1963

Patron	.. ..	Prof. Mohammad Ismail Sethi Principal.
Incharge English Section	..	Prof. S. B. Awan.
Editor English Section	..	Sajjad Ahmad B. A. Part II.

GANDHARA



JULY 1963

GOVERNMENT COLLEGE PESHAWAR
(WEST PAKISTAN)